برطانوی ہند کا نظام سیاسی

تصنیف

ای۔ اے۔ ہارن آئی۔ ای۔ ایس

ترجمہ

مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی

سنہ ۱۳۵۰ھ سنہ ۱۳۴۰ف سنہ ۱۹۳۱ء

یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے
جس کو حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ کرکے
طبع وشائع کی گئی ہے

برطانوی ہند کا نظام سیاسی

برطانوی ہند کے سیاسی نظام کا یہ تمہیدی خاکہ جس میں سنہ ۱۹۱۹ء کی دستوری تبدیلیوں پر خاص طور سے اظہار خیال کیا گیا ہے، ان تقریروں پر مبنی ہے جو مصنف نے بہار سنہ ۱۹۲۱ء میں جامعۂ ہارورڈ میں کی تھیں۔

عملاً یہ کتاب طلبہ کے لئے ترتیب دی گئی ہے، کہ ایک طرف تو یہ اس موضوع پر تمہیدی مواد بہم پہنچاتی ہے، اور دوسری طرف البرٹ کی "حکومت ہند" اور راسٹر بچی کی "ہندوستان" جیسی مستند نصابی کتابوں کے ضمیمہ کا کام دیتی ہے، اس لئے موخر الذکر خیال کے ماتحت اس کتاب میں ہندوستان کے جدید آئین کو باب (۲) میں بیان کیا گیا ہے۔

تاہم اس وقت یہ موضوع محض علمی دلچسپی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کا منشور دراصل اس عالمگیر جنگ کا لازمی نتیجہ ہے جو آزادی عمومیت کے لئے تھی اور حال ہی میں ختم ہوئی ہے، اور جو لوگ بعد از جنگ کے بند و بست سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ منشور قابل مطالعہ ہے، ایسے ناظرین کی توجہ پہلے باب کی طرف جس میں ایک عام خاکہ پیش کیا گیا ہے، خاص طور سے مبذول کرائی جاتی ہے۔

ان تقریروں اور اس کتاب کی اشاعت میں ایک سال کا وقفہ ہو گیا ہے، اور اس وجہ سے یہ بات ممکن ہو گئی ہے، کہ اس میں ایک ایسے باب (۱۲) کا اضافہ کیا جائے، جس میں اصلاح شدہ دستور کی عملی صورت پر اظہار خیال کیا گیا ہو، اور اس کے ساتھ ہندوستان کی انقلابی تحریک کے حال کے مظاہروں پر

بحث کرنا بھی ممکن ہوگیا ہے۔ جن لوگوں نے گزشتہ بارہ مہینوں میں اہم ترین واقعات کا مطالعہ کیا ہے، ان کے لئے یہ مظاہرے منظم آئینی ترقی کے لئے بڑا خطرہ ہیں، باب ۷، اسی موضوع پر مشتمل ہے،

سینٹ انڈریوز
۱۵۔ اپریل ۱۹۲۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برطانوی ہند کا نظامِ سیاسی

باب (۱)

ایک سرسری نظر

(۱)

آج سے تقریباً تین صدی قبل پہلی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جسے ملکہ الیزبتھ نے سولھویں صدی کے آخری دن منشور عطا فرمایا تھا، ہندوستان میں اپنی کوٹھیاں، یا تجارتی مرکز قائم کئے جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے الیزبتھ نے لندن کے تاجروں کے گورنر اور کمپنی کو جو مشرقی جزائر ہند میں تجارت کرتی تھی جو فرمان عطا کیا تھا، وہ اپنے نظام حکومت خود اختیاری میں، چارلس اول کے اس فرمان سے بہت مشابہ تھا جو اوس نے "انگلستان جدید" میں خلیج میساچوسٹس کی کمپنی اور اس کے گورنر کو عطا کیا[1] تھا، اس فرمان کے ذریعے سے ایک گورنر ایک منتخب مجلس عاملہ (کورٹ آف ڈائرکٹرس

---

[1] البرٹ گورنمنٹ آف انڈیا (حکومت ہند) صفحہ ۱۰، بہرکیف یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا منشور اُس عہد کے استعماری فرمانوں سے اس حیثیت سے عملاً بہت مختلف تھا مثلاً مؤخر الذکر فرمانوں میں جہاں کمپنی کو نہ صرف اپنے ملازمین کے متعلق بلکہ مقبوضہ علاقہ کے متعلق بھی قانون سازی کے حقوق حاصل تھے، اول الذکر میں اس قسم کا کوئی حق علاقہ پر حکومت کرنے کا نہیں تھا۔

تاریخ دکن مولفہٗ مولانا ہاشمی صاحب فورتھ اسٹانڈرڈ اور فسٹ فارم میں حسب احکام ذیل منظور اور شریک نصاب ہوئی ہے قیمت (عمہ) سکہ عثمانیہ مِن مشتہر سے طلب فرمالیں ورنہ دوسری اڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔

نقل مراسلہ صدر دفتر نظامت تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی واقع ۵ دے ۱۳۲۶ف

نشان (۸۷) ۵۲-۱۷ف

منجانب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات

بخدمت صدر مہتمم صاحبان تعلیمات اسماء بلدہ و صدر مہتمم صاحبہ مدارس نسواں و پرنسپل صاحبان ٹریننگ کالج بلدہ سٹی کالجیٹ اسکول بلدہ۔ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد۔ جاگیردار کالج بیگم پیٹھ و پرنسپل صاحبہ زنانہ کالج نامپلی۔ و مہتمم گرلز اسکول حیدرآباد۔ و صدر صاحب صدر دارالضرب سرکار عالی

مقدمہ

شرکت نصاب تاریخ دکن مولفہٗ مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ سرکار عالی

مقدمہ مندرجہ عنوان نگارش ہے کہ تاریخ دکن مولفہ مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ سرکار عالی کو جماعت چہارم تحتانیہ (فورتھ اسٹانڈرڈ) اور فارم اول (فسٹ فارم) طبقہ وسطانیہ مدارس سرکار عالی میں امرداد ۱۳۲۶ف سے پانچ سال تک شریک نصاب کرنے کی منظوری ذریعہ مراسلہ محکمہ سرکار صیغہ تعلیمات نشان ۱۲ واقع ۲ آذر ۱۳۲۶ف صادر ہوئی ہے پس ان جماعتوں میں اسوقت جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ امرداد ۱۳۲۶ف سے موقوف فرمائی جائیں اور اوائل سال تعلیمی ۱۳۲۶ف سے تاریخ مذکور کے پڑھائی کا بندوبست فرمایا جائے۔ یہ تاریخ ماہ خورداد ۱۳۲۶ف تک طبع ہوجائیگی اور حیدرآباد کے کل کتب فروشوں سے مل سکیگی

مثنیٰ:۔ اطلاعاً بخدمت مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ سرکار عالی مرسل فقط

شرح دستخط
مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب۔ مددگار ناظم تعلیمات

حسب مسودہ دستخطی
ناظم صاحب تعلیمات

المشتہر سید عبدالقادر تاجر کتب چارمینار حیدرآباد۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدارس میں اجتماعی زندگی کی تربیت

موٹے الفاظ میں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ نونہالان قوم سیرت حسنہ کے زیور سے
آراستہ ہو کر جائز طریقہ سے کمانے اور اپنی مذہبی۔ قومی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو باحسن
وجوہ انجام دینے کے قابل ہوں۔ بادی النظر میں اس مقصد کا حصول بہت ہی آسان
معلوم ہوتا ہے لیکن جن حضرات کو آیندہ نسلوں کے بگاڑنے یا بنانے کا فخر حاصل ہے
اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ اِن آسان الفاظ کو عملی جامہ پہنانا کس قدر مشکل ہے
اس غلط فہمی کی حقیقت یہ ہے کہ تدریس اور تعلیم کو عام طور پر مترادف سمجھا جاتا ہے
جس کی وجہ سے ہر اُس شخص کو جس نے معمولی نوشت و خواند کی بھی قابلیت حاصل کر لی ہو
تعلیم یافتہ کہا جاتا اور تعلیم دینے کے قابل تصور کیا جاتا ہے لیکن ایک ذرا سے غور و تعمق
کے بعد واضح ہوگا کہ تدریس کے معنی جس کا ماخذ درس ہے درس دینے یا کسی نئی چیز کے
طلباء کو بتلانے کے ہیں مگر تعلیم کا عام مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس عمل میں
نہ صرف تدریس ہی شامل ہے بلکہ اُس سیرت کا بھی حصول ہے جو ملک اور قوم کی بقا کے لئے
لابدی ہے بالفاظ دیگر تعلیم کے عمل میں دو جز شامل ہیں ایک تدریس دوسرا سیرت حسنہ کا

حصول۔ ظاہر ہے کہ پہلا جزو یعنے تدریس کا عمل بیحد آسان ہے اور ہر شخص جو نوشت وخواند میں معمولی دستگاہ رکھتا ہو اس جزو کی تکمیل کرسکتا ہے اور تعلیمی دنیا کے اکثر و بیشتر حصوں میں اسی کو نصب العین قرار دے لیا گیا اور یہی ہماری نام نہاد تعلیم ہے۔ مگر دوسرا جزو جس کے بغیر تعلیم بیکار و فضول ہے جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل سے تکمیل پاتا ہے اور اس جزو کی تکمیل کے لئے ان بزرگ ہستیوں کی ضرورت ہے جو نہ صرف حق اللہ اور حق العباد سے بلکہ اپنی اہم ذمہ داریوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس اہم جزو کے نظر انداز کئے جانے کے یا اس کی طرف سے ایسی غفلت اور لاپروائی برتے جانے کے کئی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ فی زمانہ تعلیم کا چرچا ہے جس کی وجہ سے طلبا کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ لایق اساتذہ کا ملنا تقریبًا محال ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی نوشت وخواند جاننے والے حضرات بھی جن میں نہ اعلیٰ تخیلات ہیں نہ فرض شناسی اور نہ اپنے کام کی اہمیت کا احساس ہے تعلیم دینے کے لئے مامور بکار کر دیئے گئے جن طلبا نے ان حضرات کے روبرو زانوئے ادب تہہ کیا ہو اُن کی ذہنیت قابلیت اور فرض شناسی کا اندازہ کرنے کے لئے کچھ زیادہ قوت متخیلہ کی ضرورت نہیں ہے

دوسرا سبب یہ ہے کہ آج کل کی نام نہاد تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ہماری ضروریات زندگی اور اخراجات میں بھی اضافہ ہونے لگا جس کی وجہ سے محکمہ تعلیمات کی قلیل تنخواہیں لایق اور اولوالعزم حضرات کے لئے کافی ترغیب اور تحریص کا باعث نہیں ہوتیں۔ آج متمدن ممالک میں بھی یہی حال ہے کہ ذہین اور طباع لوگ عام طور پر ملازمت اور خصوصًا تعلیمات کی ملازمت کو ناپسند کرتے ہیں۔

تیسری وجہ تعلیم کی جانچ کا طریقہ ہے۔ اکثر حکومتیں کسی مدرسہ یا کالج کی کامیابی کی جانچ اس کے کامیاب شدہ طلبا کی تعداد سے کرتی ہیں اور نیکنامی و شہرت کا سہرا اس صدر مدرس کے سر ہوتا ہے جس کے مدرسہ سے سب سے زیادہ تعداد و فیصد کامیاب

ہوئی ہو۔ معائنہ مدرسہ کے وقت بھی طلبار کے صحیح جوابات ہی تعلیم کے تنہا معیار ہیں اور ہمارے خیال میں یہ محض تدریس کی جانچ ہے نہ کہ تعلیم کی حکومت کے اس طرز عمل سے مدرسین کا کل اسٹاف کتابوں کے رٹانے پر اکتفا کرتا ہے اور تعلیم کے دوسرے شاندار اور اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں انگلستان میں بھی مدرسین کو نتائج کے حساب سے تنخواہیں دی جاتی تھیں اور اس کو (Payment by Results) کہا جاتا تھا مگر اس طرز عمل کی کمزوری کو بہت جلد محسوس کر لیا گیا اور اس قانون کی تنسیخ کر دی گئی۔ ہمارے ہاں گو یہ قانون نافذ نہیں ہے مگر مدرسین کی فلاح و بہبود کا بہت کچھ انحصار اسی قسم کے اصول پر ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ خود مدرسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین اجتماعی زندگی کے مفہوم اور اس کی تربیت کے طریقہ سے ناواقف ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ راقم الحروف سے ایک جلیل القدر مدرسہ فوقانیہ کے صدر مدرس صاحب نے فرمایا کہ وہ مختلف کلب اور سوسائٹیاں جن میں آیندہ نسل کے تخیلات کی تشکیل اور نفس کی تہذیب ہوتی ہے اپنے مدرسہ میں اس وجہ سے قائم نہیں کر سکتے کہ اُن کے ہاں اچھے یعنی سوسائٹیوں کے کام کو جاننے والے مددگار نہیں ہیں۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ مدرسین بھی اُن شعبوں کے مفہوم سے ناواقف ہیں جو ہماری آیندہ زندگی کے بناؤ اور سنوار کے جزو لاینفک ہیں۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس کی زندگی جیسا کہ مہارانی صاحبہ بڑودہ نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا مذہب اور قوم کے اعلیٰ تخیلات سے ملہم نہیں ہے مختصراً یہ کہ تعلیم کے عمل میں تدریس کے علاوہ اعلیٰ تخیلات کے ذریعہ ذہنی اور نفسی پاکیزگی شامل ہونی چاہیے اور مدارس کی زندگی میں وہ تمام شعبے داخل ہونے چاہئیں جن میں نونہالانِ قوم کو آگے چل کر حصہ لینا ہے۔

اگر مدارس کی چار دیواری کے باہر ایک بڑی سوسائٹی رہتی ہے تو اس کے اندر بھی ایک چھوٹی سی سوسائٹی ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ بیرونی سوسائٹی میں جو بزن

اور بھلائیوں کے علاوہ بدیاں اور برائیاں بھی موجود ہیں اور مدرسہ کی مختصر سی سوسائٹی میں محض خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آج جو طلبا، مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں انہیں کل مدرسہ کے باہر کی سوسائٹی میں جانا اور رہنا سہنا ہے۔ ملازمت اور ازدواج کے ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگا۔ ان کے ہمسایہ اور پڑوسی بھی ہوں گے جن کے حقوق کا جاننا اس سوسائٹی کے ہر ممبر کا فرض ہے۔ ملک اور قوم کی بقا کے لئے اشتراک عمل محبت اتفاق اور ایثار کی ضرورت ہے۔ شکست و فتح سے بھی دو چار ہونا ہے۔ انتظام مملکت میں حصہ لینا اور حکومت و ماتحتی بھی کرنی ہے۔ غرض کہ دنیا میں قدم رکھتے ہی طلبا، کو ایسے ہی بے شمار کام کاج کرتے ہیں جن سے وہ کسی طرح پہلو تہی نہیں کر سکتے۔ اس لئے مدارس میں اس اجتماعی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہونا چاہئے جس میں طلبا، کو حکومت و ماتحتی۔ نظم و نسق۔ محبت۔ اتفاق۔ ایثار۔ ہمدردی اور ان بیشمار فرائض کی تربیت دی جائے جن کو انھیں آگے چلکر انجام دینا ہے ورنہ ایسے طلبا چار پائے بر و کتابے چند کے مصداق ہوں گے اور ایک کامیاب زندگی بسر کرنا ان کے لئے محال ہو جائے گا۔ بدقسمت ہیں وہ مدارس جن میں تعلیم کے اس درخشاں پہلو کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور ہماری رائے میں ایسے مدارس خواہ اُن کی تعداد کامیاب شدگاں کتنی ہی بڑی ہو ہرگز ہرگز کامیاب مدارس نہیں کہلائے جا سکتے۔

یورپ میں اکسفورڈ اور کیمبرج۔ امریکہ میں ہارورڈ اور ایل۔ ہندوستان میں علیگڈھ اسی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے دوسری تعلیم گاہوں کے پیش پیش ہیں یہاں طلبا کو نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے بلکہ حق العباد اور حق اللہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے بالفاظ دیگر ان تعلیم گاہوں کی زندگی قوم کی زندگی سے بیحد ملتی جلتی اور مذہب اور قوم کے اعلیٰ تخیلات سے ملہم ہوتی ہے۔

بہرحال اس ساری تمہید کا ماحصل یہ ہے کہ مدارس میں اجتماعی زندگی کی

تربیت کی طرف خاص توجہ کی جانی چاہئیے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف کلب اور سوسائٹیاں قائم کی جائیں۔ طلباء کو اُن کے فوائد بتائے جائیں اور انہیں شرکت کی ترغیب و تحریص دیجائے مدرسین ان کلب اور سوسائٹیوں میں شریک ہوں اور ان کے مختلف مشاغل میں حصہ لیں اور خود صدر مدرس ان تمام کی روح رواں رہے

(باقی دارد)

جغرافیہ بیرون مدرسہ

از مولوی عبد الغفور صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی مددگار مدرس عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن

نصاب کے جملہ کتب میں صرف جغرافیہ ایسا مضمون ہے جس کو اچھی طور سے سمجھنے کے لئے بالراست عملی تجربہ کی ضرورت ہے اطراف و اکناف کے اشیاء کو دیکھکر دیگر اشیاء کے نسبت ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گھر مدرسہ اور کھیل کے میدان سے جغرافیہ کی ابتداء ہوتی ہے اس مضمون کی تعلیم میں اگر اس سے چشم پوشی کی جائے تو گویا ایک ایسے عمارت کی تعمیر کی کوشش کی جاتی ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور جب بنیاد کا وجود ہی نہ ہو تو عمارت کی تعمیر کی کوشش لاحاصل ہے۔ اس بنیادی اصول کو پس پشت ڈالنے کے سبب سے جغرافیہ کی تعلیم سے جو فوائد حاصل ہونے چاہئیے تھے نہیں ہوئے۔

بطور مثال دکن کے دریاؤں کو لیا جائے اور ان کی نسبت بچوں سے سوال کیا جائے۔ قوت حافظہ کی مدد سے جو کچھ کتاب میں لکھا گیا ہے اس کو دہرانے کی کوشش

کی جائے گی اگر قوت حافظہ بروقت مدد نہ دے تو خاموشی اختیار کی جائے گی دکن کے دریاؤں کو ذہن نشین کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مقامی دریا کی واقفیت بخوبی ہو اور جو کچھ واقفیت ہو وہ ذاتی تجربہ کی بنا پر ہو۔ اگر بچے بلدہ کے مدارس میں زیر تعلیم ہیں تو رود موسی پر بآسانی سبق دیا جاسکتا ہے مشاہدہ کی بنا پر موزوں سوالات کے ذریعہ جوابات اخذ کرائے جاسکتے ہیں اس قسم کی تعلیم کا اثر دیرپا ہوگا اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ہر مدرسہ خواہ وہ کسی مقام پر ہو جغرافیہ کے معلومات کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مدرسہ خواہ کسی مقام پر ہو جغرافیہ کی ابتدائی تعلیم کا مواد بخوبی میسر آسکتا ہے۔

چنانچہ مدرسہ کے کمپونڈ یا کھیل کے میدان میں بارش ہونے کے بعد خاکنائے، آبنائے، جزیرہ نما جھیل وغیرہ کے اشکال نمودار ہو جاتے ہیں ان کا مشاہدہ کرا کر سوالات کے ذریعہ جوابات اخذ کرائے جائیں۔ اور ان کی مدد سے اصلی چیزوں کا تصور دلایا جائے اگر مدرسہ کے قرب وجوار میں یہ سطحی شکلیں قدرتی طور پر موجود ہوں تو مدرسین کو اسباق کی تیاری میں بہت کچھ سہولت ہوگی۔

بلدہ کے طبقہ تحتانیہ کے مدرسین حسب ذیل اشیاء سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(۱) رود موسیٰ

(۲) املی بن (جزیرہ)

(۳) بڑی چادر (ابشار)

(۴) میر عالم (جھیل)

(۵) کھیت (موسیٰ کے کنارے موقعہ چادر گھاٹ)

(۶) جنگل (زیرین کٹہ حسین ساگر)

اس قسم کے اسباق کی کامیابی صرف اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ مدرس دلچسپی لے اور ایک باقاعدہ پروگرام مرتب کرے اور حسب پروگرام ان چیزوں کا معائنہ کرے۔ بوقت معائنہ

مدرس اس امر کی احتیاط کرے کہ بچوں کے پاس نوٹ بک مہیا رہیں۔ مدرس کو چاہئے کہ عملی سبق دینے کے پیشتر خود بغور ان چیزوں کا مشاہدہ کرے اور اسباق تیار کرے اگر وہ اس خصوص میں لاپروائی برتے گا تو بیرون مدرسہ جو کچھ تعلیم ہوگی وہ محض بیکار ہوگی۔ صرف رسمی طور پر بیرون مدرسہ تعلیم دینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ الٹا نقصان ہوگا۔ بچوں کے دل میں غلط خیالات جاگزیں ہوجائیں گے جو ان کے آیندہ تعلیمی ترقی میں سدِّ راہ ہونگے اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ مدرس دلچسپی سے پہلے سبق تیار کرے اور پھر بچوں کی توجہ ان اشیاء کی خصوصیات کی طرف مبذول کرائے۔

بچے خاص خاص باتوں کو نوٹ کرتے جائیں۔ دوسرے دن جماعت میں مکالمے کے طور پر اس خصوص میں بحث کی جائے اور بچوں سے کہا جائے کہ اس کی نسبت ایک مفصل نوٹ پیش کریں۔

ذیل میں رود موسیٰ پر بطور نمونے کے ایک مختصر سبق دیا جاتا ہے۔

سبق

سابقہ واقفیت کی بنا پر نشیب کے طرف پانی بہنے کے متعلق سوالات کئے جائیں

پانی بہنے کی وجہ | بچوں کو رود موسیٰ میں بڑی چادر کے نیچے لے جاکر مشاہدہ کرایا جائے ڈھلوان کی طرف اشارہ کیا جائے پانی کے بہنے میں جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔ رکاوٹ پیدا کرنے والی اشیاء کو بچے بتلائیں۔

ریت کی نسبت سوال کیا جائے۔ یہ کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟

تھوڑی سی ریت پانی میں ڈال دی جائے بڑے پتھروں کے قائم رہنے اور ریت کے بہنے کی نسبت سوال کیا جائے۔

رفتار دریا | دریا کے کنارے بڑی چادر کے پہلو میں جو نالا بہتا ہے اس میں ایک

کارک ڈوری سے باندھا ہوا ایک سو قدم کے فاصلہ تک بہتا ہوا چھوڑا جائے۔ بچوں سے کہا جائے۔ کہ گھڑی دیکھکر بتلائیں کہ اس قدر فاصلہ طے کرنے کے لئے کس قدر وقت صرف ہوا۔ مگر اس کارک کو چھوٹی چادر کے نیچے تھوڑے فاصلہ پر چھوڑا جائے ایک سو قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد۔ وقت نوٹ کر لیا جائے سوال کے ذریعہ کارک کی رفتار کا فرق معلوم کیا جائے۔ رفتار میں کیوں فرق ہے؟

دریا کی زمین پتھریلی ہے بنا بریں دریا کے پانی کی رفتار تیز ہونے کے نسبت جواب اخذ کرایا جائے۔

ناقابل جہازرانی | ایک چھوٹی کاغذ کی کشتی چھوٹی چادر کے نیچے دریا میں چھوڑ دی جائے کشتی کے چلنے کے نسبت جواب اخذ کرایا جائے مشاہدہ کی بنا پر اس دریا کا ناقابل جہازرانی ہونا بتلایا جائے۔

زرخیز مٹی | ایک بچے سے کہا جائے تھوڑی سی مٹی دریا کے تہ سے نکالے اس جگہ سے مٹی نکالی جائے جہاں دریا کی گہرائی کم ہے۔ اس مٹی کا معمولی مٹی سے مقابلہ کرایا جائے مشاہدہ کی بنا پر اس مٹی کا نہایت عمدہ ہونا ظاہر کیا جائے۔ اور یہ بتلایا جائے کہ یہ مٹی زرخیز ہے۔ نیز یہ بتلایا جائے چونکہ دریا تیز بہتا ہے اس لئے مٹی بہجاتی ہے اور جہاں دریا کی رفتار سست ہوتی ہے وہاں مٹی جمع ہو جاتی ہے۔

ہمیشہ نہیں بہتا | موسم گرما و باراں میں دریا کا مشاہدہ کرایا جائے۔ مشاہدہ کی بنا پر یہ امر ذہن نشین کرایا جائے کہ دریا موسم باراں میں بہتا ہے اور موسم گرما میں خشک رہتا ہے۔

طلبا کی کامیابی

(گذشتہ سے پیوستہ)
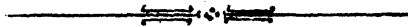
عمل صحیح | رنگ برنگ کے پھول خوشبودار کلیاں ہرے بھرے پتے میٹھے میٹھے لذیذ پھل سایہ گستر درخت سبھی کو پسند آتے ہیں لیکن شگوفہ و گل میں اگر رنگینی و خوشبو برگ و بار میں سرسبزی و شیرینی نہ ہو تو پھینک دئے جانے کے قابل ہیں اور درختوں میں اگر بارآوری یا سایہ گستری نہ ہو تو قطع کر دئے جانے کے لائق۔ بے فیض انسان کا یہی حال ہے بے عمل عالم کے متعلق سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا اچھا کہا ہے ؎

بار درختِ علم ندانم مگر عمل | علم اگر عمل نکنی شاخ بے بری

مال و زر نفع اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کے لئے ہے ورنہ ع

زبہر نہادن چہ سنگ و چہ زر

اسی طرح دولتِ علم کا ماحصل یہی ہے کہ اہل علم عمل صحیح سے خود کو آراستہ کریں اور اپنے معلومات سے اوروں کو نفع پہنچاتے رہیں بعض طالب علم صرف پڑھنا جانتے ہیں پڑھے ہوے پر کاربند ہونا انہیں نہیں آتا جن علوم سے یہ بہرہ ور ہوتے جاتے ہیں اُن پر عمل پیرا ہوتے نظر نہیں آتے۔ ریاضی میں مہارت انہیں حاصل ہو گئی تاریخ و جغرافیہ میں دور تک معلومات پیدا کئے فارسی و انگریزی جاننے والے کہلائے گئے عربی اور دینیات میں بھی دخل رکھنے والے مشہور ہو چکے مگر حالت اور اصلی حالت یہ ہے کہ عملی جیومٹری بھی پڑھی مگر اس پر عمل ندارد حساب جانا مگر روزمرہ کے کاروبار بے حساب ہی طے پاتے رہے جبر و مقابلہ سے ضروریات زندگی میں سنتا ید ہی کبھی

کام لیا گیا سائنس میں مشاق ہوئے مگر ایجاد و اختراع سے علیحدگی ہی رہی تاریخ
ازبر ہوگئی مگر اس سے نیک و بد کا سبق حاصل نہ ہوا جغرافیہ یاد ہے لیکن سیاحت
وتجارت میں اس علم سے مدد نہیں لی گئی فارسی بول نہیں سکتے انگریزی کا یہ حال کہ
خواہ بولیں یا لکھیں غلطیوں سے کلام پاک نہیں۔ عربی تو اتفاقاً زبان زاید کے طور پر
آئی اور چلی گئی دینیات کے مسائل قریب امتحان یاد تھے پھر لاتو ان کی ضرورت
ہی نہ پڑی یا کسی نہ کسی طرح کام چل ہی گیا ؎

واہ اے بیخودی شوق کیا خوب سلوک — اس کو گر ڈھونڈ نکالا تو کیا گم مجکو

میرے شفیق طالب علمو! ہمن ناچیز تحریر کو مبالغہ نہ خیال کرو خلاف طبع باتیں سمجھکر
کشیدہ خاطر نہ ہو انصاف بالائے طاعت است ذرا غور کرو اور انصاف سے
غور کرو کہ کون ایسا طالب علم ہے جسے ضروریات زندگی سے سابقہ نہیں پڑتا ؎

سلطان وگدا در طلب جامۂ نان اند — تا باز رہا نند جسد را و شکم را

میں نے بارہا طلبا سے اس کے متعلق سوالات کئے ہیں مگر کسی جماعت کے طلبا نے
مجھے تشفی بخش جوابات نہیں دئے مختلف قیمتوں کی متعدد چیزیں بازار سے لانے کے لئے
کہا جاتا ہے طالب علم ہر سودے کے لئے بغیر پنسل کاغذ لئے اور دس پانچ منٹ صرف
کئے صحیح جواب نکال ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ تھوڑی دیر میں دس دس بیس بیس
سودے ہر روز خریدنے پڑتے ہیں غریب ہے خود لانا پڑتا ہے دولتمند اوروں سے
منگواتے ہیں۔ طلبا سے جب روزمرہ حسابات کے متعلق مجھے صحیح جوابات نہ ملے
تو میں نے عرض کی کہ تمہاری زندگی پھر کس طرح بسر ہوگی یہی حال رہا تو ہمیشہ خرید و
فروخت کے وقت نقصان اٹھاتے رہوگے اس پر مختلف طلبا نے جو جوابات دئے
ہیں سننے کے قابل ہیں۔ (۱) سوداگر خود منصف اور حساب داں ہوتے ہیں برابر ہی
دیں گے (۲) ابا جان سودا لایا کرتے ہیں مجھے بازار جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۳) یہ معمولی نقصانات کچھ زیادہ مضرت بخش نہیں (۴) بڑے بڑے سوالات حل کرلئے
جانے کے بعد یہ معمولی سوالات لایق توجہ ہی نہیں۔ غرض عزیز طالب علموں نے سب کچھ
کہا مگر کسی سے یہ جواب نہ ملا کہ جو سکھیں گے اُس کو کام میں لانے کی تجویز کریں گے اور ریاضی
کے گہرے سوالات کے ساتھ ساتھ معمولی روزمرہ کے سوالات کی مشق بھی جاری رکھیں گے
ان چشم دید واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض تعلیم یافتہ کے مقابلہ میں ایک بوریا
باف رقبہ نکالنے میں سبقت لے جاتا ہے تو ایک بقال جزئی حسابات میں صحت پر رہتا ہے
طالب علمو اگر تمھیں حقیقی طور پر علم کی روشنی سے منور ہونا ہے تو جو کچھ سیکھو اُس کا
استعمال حتی الامکان جاری رکھو مثلاً حساب میں جتنے معلومات بہم پہونچیں اُن کو حسب ضرورت
برتتے بھی جاؤ جغرافیہ سیکھو تو جہاں کہیں تمھیں سفر کا موقع ہو اس علم سے مدد لینے کی کوشش
کرو اور علم کو عملی حیثیت سے کام میں لاتے رہو۔ تاریخ میں جو واقعہ بھی پڑھو اس کے اچھے
برے نتائج ذہن نشین کرو اور حسب موقع تاریخی تذکروں اور ان کے نتیجوں سے اوروں کو
مستفید کرتے رہو اگر تاریخ میں بُروں کا ذکر آئے تو وہ بری خصلتیں اپنی طبیعت سے دور کرو
اچھوں کے حالات سے عمدہ خصائل اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

فارسی پڑھکر زبان فارسی کے بلند پایہ مصنفین کی تصانیف سے بہرہ اندوز
ہوتے رہو انگریزی پڑھو تو صرف زبان دانی یا ناول بینی پر اکتفا نہ کرو بلکہ جو علمی ذخیرے
اس زبان میں جمع ہیں حتی المقدور اُن سے جتنا بھی کام لے سکتے ہو لو۔ عربی سیکھی ہے
تو علم وفن اور دینی کتب کا مطالعہ جاری رکھو دیندار بنو اوروں کو نیک بنانے میں
کوشاں رہو۔ دینیات کے ضروری مسائل حاضر فی الذہن رکھو اور خود عمل پیرا رہکر اوروں کو
بھی ان سے واقف کرتے جاؤ۔

اطاعت واحترام والدین و اساتذہ | ایک شیر خوار بچہ جسے کچھ عقل وتمیز ہے نہ اپنے برائے کی خبر اپنی راحت
کی کچھ فکر کرسکتا ہے نہ تکلیف وہ چیز کو دفع کرنے کی قدرت رکھتا ہے

پاکیزگی سے اسے کچھ سروکار ہے نہ غلاظت سے ننگ و عار بھوک کے وقت رونا تو جانتا ہے مگر خورد و نوش کے اسباب مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ برہنگی کی حالت میں سردی کی شدت سے لرزتا ہے مگر اپنے جسم کو محفوظ رکھنے کی تدبیر سے واقف نہیں اس کا جینا مشکل ہے اور آفتوں سے محفوظ رہنا دشوار مگر باوجود اس بے بسی کے ناز و نعمت میں پلتا ہے تمام ضروریات زندگی کی تکمیل بغیر کسی محنت و مشقت کے ہو جاتی ہے اس لئے کہ جان سے زیادہ عزیز رکھنے والی والدہ اور دلی ہمدردی کرنے والا والد موجود ہے والدہ اپنا خون پلا کے اوسے پرورش کرتی ہے اپنی راحت و آسائش کو اس پر قربان کر دیتی ہے والد اپنی محنت کی کمائی اس کی پرورش میں خوشی خوشی خرچ کرتا ہے اور اس کی صلاح و فلاح کا جان و دل سے طالب ہے۔ بچہ ہے کہ کبھی رات رات بھر والدہ کو جگاتا ہے تو کبھی چیخ چیخ کے والد کا دماغ پریشان کرتا ہے یہ شرارتیں کرتا ہے ماں باپ خوش ہوتے ہیں یہ انہیں مختلف طریقوں سے ستاتا ہے" والدین اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ غرض خدا خدا کرکے یہ صاحبزادہ بڑا ہوا ہوش و حواس سنبھالے داخل مدرسہ بھی ہو گیا۔ زیر تعلیم تو ہے مگر والدین کے ساتھ اس کا برتاؤ جاہلانہ ہی رہا۔

بعض طلبار کی حالت یہ ہے کہ ان کا تعلیم پانا ماں باپ پر غضب ڈھانا ہے یہ مدرسہ کیا آتے ہیں والدین کے سر پر ایک آفت لاتے ہیں۔ بات بات پر والدین کی نافرمانی بار بار تعلیم مدرسہ کا بہانہ۔

غریب باپ کہتا ہے کہ آج مجھے ضروری کام ہے ذرا بازار سے سودا لے آنا عزیز بیٹا ترش رو ہو کر جواب دیتا ہے کہ مجھے مدرسہ کا کام انجام دینا ہے اسباق یاد کرنے سے مجھے فرصت نہیں باپ کچھ کہہ نہیں سکتا مجبوراً خود ہی بازار چلا جاتا ہے صاحبزادے فوراً پڑھنا چھوڑ اپنے دوست کی ملاقات کے لئے راہی ہوتا ہے کوئی طالب علم برخاست مدرسہ کے بعد گھر پہنچتا ہے والدہ محبت بھری نگاہوں سے اپنے تعلیم یافتہ لخت جگر کو

دیکھتی ہے اور دلی مسرت کے ساتھ اس سے ہمکلام ہونا چاہتی ہے مگر طالب علم ہے کہ اپنی والدہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو تک کسرشان سمجھتا ہے اور مدرسہ کی تکان کا والدہ پر اس طرح اظہار کرتا ہے کہ گویا تھکاوٹ کی وجہ سے بات کرنا بھی دشوار ہے مگر یہی تھکا ماندہ طالب علم جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو بیوفا دوستوں کے ساتھ چرب زبانی میں مشغول ہو جاتا ہے۔

کسی طالب علم کا بھی خواہ باپ اگرچہ خود بے علم ہے مگر اس کو لائق بنانا چاہتا ہے اور تاکیداً کہتا ہے کہ ادھر اُدھر اوقات ضائع نہ کیا کرو مغرب کے ساتھ ہی اسباق یاد کرنے میں مشغول ہو جاؤ اس پر طالب علم نے ان پڑھ باپ کے سامنے کتاب کھولی اور اناپ شناپ سنا کر یہ باور کرا دیا کہ یہی صحیح ہے پھر اپنے دوستوں میں اس بے ادبی کا تذکرہ قہقہے لگا لگا کے بیان کرتا ہے اور اپنے بزرگ باپ کی ہنسی اوڑاتا ہے سعدی علیہ الرحمۃ نے سچ کہا ہے ؎

زنانِ باردار اے مرد ہشیار — اگر وقت ولادت مار زائید
ازاں بہتر بہ نزدیک خردمند — کہ فرزندان ناہموار زائید

طلبا نے ذکاوت پیدا کی حاضر جوابی سیکھی مگر اپنی چستی و چالاکی، لسانی و طراری کا نشانہ اپنے غمخوار والدین ہی کو بناتے رہے۔

عزیزو تمہاری آنکھیں اس لئے نہیں ہیں کہ غریب والدہ پر نکالی جائیں تمہاری زبان اس واسطے نہیں ہے کہ نرم دل والدہ سے سخت کلامی کی جائے تمہارا علم تمہاری لیاقت و قابلیت والدسے اپنے کو برتر و بزرگ سمجھنے کے لئے نہیں ہے تمہاری چستی و چالاکی والدین کو پریشان کرنے میں صرف نہیں ہونی چاہیے۔ اگر عقلمند ہو تو ماں باپ کے بے نظیر احسانات کبھی نہ بھولو لائق کہلاتے ہو تو والدین کا انتہائے ادب ملحوظ رکھو۔

مشہور ہے کہ رستم ایک دن اپنی والدہ پر کسی وجہ سے خفا ہوا اور غصے کی حالت میں اپنی انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگا کہ بڑھیا میرے سامنے تیری کیا حقیقت ہے صرف اس انگلی کی ایک مار تیری جان لینے کو کافی ہے" ضعیفہ نے اپنے پہلوان بیٹے کو کچھ جواب نہ دیا آہستہ اُٹھی اور حجرہ میں سے ایک گہوارہ نکالا اور رستم کے سامنے لا رکھا اور کہنے لگی کہ رُستم اس وقت تو مجھے ڈرا دھمکا یا اپنی انگلی سے مجھے مار ڈال مگر تجھے یہ یاد رہے کہ کسی زمانہ میں تو اتنا سا بچہ تھا اور میں تجھے اپنا خون پلاتی تھی اور اس گہوارہ میں تجھے جھلا جھلا کے پالتی تھی"۔

عزیز طالب علمو! از قدر خود شناس کے مصداق تم کتنے ہی قابل کیوں نہ ہو جاؤ اپنی اصلی حالت کو نہ بھولو اور والدین کی ان محنتوں مشقتوں کو نظر انداز نہ کرو جو تمہارے پرورش کرنے میں انہوں نے برداشت کی ہیں تمہارا باطمینان تعلیم پانا ان کے وجود پر موقوف ہے تمہاری لیاقت ان کی اطاعت پر منحصر پس اس مسعود وجود کو غنیمت سمجھو اور ان کی زندگی کی قدر کرو حضرت سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنے والد ماجد کے زیر سایہ رہنے پھر مبارک سایہ کے سر سے اُٹھ جانے کے زمانہ کا باہمی فرق کیا ہی موثر اور درد بھرے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے پڑھو اور اس سے اپنے والدین کی قدر و منزلت کا سبق حاصل کرو فرماتے ہیں ؎

من آنگہ سر تاجور داشتم	کہ سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس	پریشاں شدے خاطر چند کس
کنوں گر بزنداں برندم اسیر	نباشد کس از دوستانم نصیر

اکثر والدین کو یہ شکایت رہا کرتی ہے کہ بچہ جب سے مڈل یا میٹرک کامیاب ہو گیا ہے ہماری سنتا نہیں اپنے میں آپ مست رہتا ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں بڑی مشکل کا سامنا ہے کہ نہ ہمارا غریبانہ گھر اسے پسند ہے نہ ہمارے گھر کا کھانا پینا اسے اچھا معلوم ہوتا ہے

خود کماتا ہے نہ ہماری کمائی خوشی کھاتا ہے ہر وقت آزردگی کے سامان ہیں اور رات دن کی فضول تکراریں۔

طالب علمو اور بڑی جماعتوں کے طالب علمو یہ کیا غضب ہے کہ تم تعلیم سے صرف فیشن کا سبق حاصل کرتے ہو اور اپنی سادہ اور آرام دہ زندگی کو خواہ مخواہ پرتکلف بنا کر تکلیفیں اٹھاتے ہو کیا یہ انصاف ہے کہ تم تو لڑ جھگڑ کے اپنے غریب باپ کی کمائی سے قیمتی پوشاک جو تمہاری حیثیت سے بہت زیادہ ہے تیار کرواؤ اور اپنے زیب تن کرو اور تمہارا غمگسار باپ پھٹے پرانے کپڑے پہنا ہوا پریشان حال پھرتا ہے۔ تمہارے پاؤں تو ولایتی بوٹ سے مزین ہوں اور والد ماجد برہنہ پا ٹھوکریں کھاتا پھرے ع

نہ ہے شریعت و تقوی نہ ہے طریقت و کیش

والدین کا یہی احسان بہت زیادہ ہے کہ تمہاری تعلیم کا حسب حیثیت انتظام انہوں نے کر دیا نوشت و خواند کی ضروری اشیا تمہارے لئے وقتاً فوقتاً وہ مہیا کرتے رہتے ہیں۔ تمہاری حق شناسی یہ ہے کہ تم ان کے شرمندۂ احسان رہو اور جو کھلائیں خوشی سے کھاؤ جو پہنائیں مسرت کے ساتھ پہن لیا کرو۔ والدین کے ساتھ نہایت نرمی سے گفتگو کیا کرو اپنی کسی خواہش کا اظہار مطلوب ہو تو دبی زبان میں ان سے عرض کر دیا کرو پھر تمہاری آرزو پوری ہو کہ نہ ہو بہر حال شاد و خرم رہو۔ والدین کبھی تم پر غضبناک ہوں تو انکا غصہ خواہ بے محل ہی ہو تمہاری لیاقت یہ ہے کہ ہمیشہ تحمل سے کام لو اور ان کی سخت باتوں سے بجائے آزردہ دل ہونے کے لذت لو کیونکہ تمہاری سخت کلامی پر وہ تمہیں پیار کیا کرتے تھے ان ہے تمام احسانات سے قطع نظر صرف تمہیں انکا کھلانا پلانا ہی کافی احسان ہے نمک حلالی بہت ضروری چیز ہے جس کا نمک کھاؤ اس سے بیوفائی نہ کرو ماں باپ نے تمہیں پالا پوسا ہر طرح تمہاری دیکھ بھال کی اس شکریہ میں عمر بھر ان کے شکرگذار رہو اور اپنی جان و مال ان کے لئے وقف خیال کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جسم و روح میں فرق ہے جسم کثیف ہے روح لطیف جسم فانی ہے روح باقی۔ جب جسم کے پرورش کرنے والوں کی تعظیم لازمی ٹھہری تو روحانی تربیت کرنیوالوں کی تکریم نہایت ضروری ہوگی۔ اساتذہ ہماری روحانی تربیت کے کفیل رہا کرتے ہیں تہذیب و شائستگی ہم انہیں کے طفیل سیکھتے ہیں۔ ہماری آیندہ زندگی کی عظمت و شان اساتذہ ہی کے دم قدم سے وابستہ ہے اس لئے طلبار کا فرض ہے کہ ان کا ادب ماں باپ سے بھی زیادہ ملحوظ رکھیں مگر افسوس ہے کہ اساتذہ کی حقیقی قدر و منزلت میں آئے دن کمی ہوتی چلی جا رہی ہے ظاہری توقیر تو کسی قدر کر لی جاتی ہے مگر دلوں میں اساتذہ کی جو وقعت ہونی چاہیئے اس سے طلبار بے بہرہ نظر آتے ہیں۔

بعض طالب علموں کے پاس استاد کی کرسی اور معمولی اسٹول برابر ہیں ادھر سبق پڑھا کر استاد جماعت سے رخصت ہوئے دوسرے استاد کے آنے تک خواہ کچھ منٹ ہی کیوں نہ ملیں شاگرد اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور کرسی استاد پر متمکن ہو جاتا ہے حالانکہ ؎

دلا تا بزرگی نیاری بدست　　　بجائے بزرگاں نباید نشست

بعض طلبا کا یہ حال ہے کہ جب تک شریک جماعت رہے استاد متعلقہ کا ادب لحاظ ایک حد تک برقرار رکھا جیسے ہی اعلیٰ جماعت میں ترقی پائی اور پہلے استاد سے بے تعلقی ہوئی ان کا ادب بھی رخصت ہو گیا آخر کار آخری جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب مدرسہ چھوٹا تو قدیم اساتذہ سے راستہ میں بھی چار آنکھ ہونا بار خاطر ہو گیا اتفاقاً کبھی مقابلہ ہو ہی گیا تو طوعاً و کرہاً سلام کر لیا ورنہ اس کی بھی نوبت آنے نہ پائی ؎

مدتے بر تو بگذرد کہ گذر　　　نکنی سوئے تربتِ پدرت

تو بجائے پدر چہ کردی خیر　　　کہ ہماں چشم داری از پسرت

ایسے بھی حق شناس شاگرد دیکھنے میں آئے کہ کسی قدر لیاقت پیدا کی اور اساتذہ کے

علم و لیاقت پر نکتہ چینیاں شروع کردیں کبھی ایک استاد کے پاس دوسرے استاد کی شکایت کی جاتی ہے کبھی غلط بیانات کے ذریعہ ماں باپ کو اساتذہ سے بدظن کیا جاتا ہے کہیں جماعت کی جماعت متفق ہوکر استاد کو مختلف طریقہ سے تنگ کیا جاتا ہے کبھی غائبانہ میں استاد صاحب کے حرکات و سکنات کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے کبھی بالمشافہ زبان درازیاں کی جاتی ہیں غرض مدرس صاحب کو بعض طلبا نے بندۂ بے دام سمجھ رکھا ہے انہیں بے ادبیوں کا اثر ہے کہ استاد کے فیضان علم سے کافی طور پر مستفیض نہیں ہو سکتے ع

با ادب باش تا بزرگ شوی

چونکہ بعض طلبا نے ادب میں کمی کردی عزت علم سے بھی محروم رہنے لگے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت حماد رح کا اس طرح ادب کیا کہ جب تک حماد زندہ رہے امام نے ان کے گھر کی طرف اپنے پاؤں نہ پھیلائے اس ادب کا صلہ یہ ملا کہ دنیا آج تک ان کو امام اعظم کے نام سے یاد کرتی ہے اور اس آخری زمانہ میں بھی کم و بیش پانچ کرور مسلمان اس امام کے پیرو ہیں اور اس کے مجتہدانہ اقوال پر عمل کرنے کو سعادت دارین سمجھتے ہیں۔ فاضل ہندی قاضی شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ اپنے اساتذہ کے خویش و اقارب کی تک تعظیم و تکریم کرتے چنانچہ ایک وقت ایک عالم کی شاگردی کے لئے روانہ ہوئے راستہ میں معلوم ہوا کہ عالم کے قرابت دار بہت ہیں قاضی صاحب یہ سنتے ہی محض اس لئے واپس ہوگئے کہ استاد کے ان تمام اقربا کا احترام ان کے لئے ناممکن تھا تاہم قاضی صاحب اپنی پیرانہ سالی میں بھی جب کبھی اس راہ سے گذرتے ازراہ ادب پیدل ہوجاتے اور دوسروں کے سہارے چلتے۔ فرماتے کہ آخر میں نے اس عالم کی شاگردی کا ارادہ تو کیا تھا۔

حیرت کا مقام ہے کہ اگلے زمانہ کے بزرگ استاد کے خویش و اقارب کی تک تعظیم کیا کرتے اور جس کی شاگردی کی نیت بھی کرتے اس کا ادب اپنے اوپر لازم سمجھتے اب

استاد کے احباب تو در کنار خود استاد ہی کی خاطر داری بار خاطر ہو گئی ہے استاد کے مقام اور اس کے راستہ کی تعظیم رہی ایک طرف خود استاد صاحب جماعت میں تشریف فرما ہوں تو بعض طلبا کے لیے تعظیماً اپنی جگہ صرف کھڑے ہو جانا ناگوار ہے۔

میرے ہونہار طالب علمو ہر اہل علم کو عموماً اپنے استاد کو خصوصاً نہایت بزرگ ہستی خیال کرتے رہو اس کے ادب و تعظیم کے لحاظ سے تمھارا ظاہر و باطن ایک رہے اس کی دریا دلی کی قدر کرو کہ فضل و کمال کے کیسے کیسے جواہر تمھارے دامن مراد میں بھر دیا کرتا ہے اور علم و فن کے بے بہا موتی تمھارے گوش گزار کیا کرتا ہے۔ اس کا چشمہ علم تمھارے لئے آب حیات ہے اس کی مار تمھارے واسطے ماں باپ کے پیار سے بہتر ہے کیوں کہ اس کا انجام نیک نامی و کامیابی ہے۔ ع

جس کا انجام ہو اچھا وہ مصیبت اچھی

اگر کامیابی چاہتے ہو تو استاد کا بحد ادب ملحوظ رکھو اس کی ہر بات کو غور سے سنو جو کہے اس پر بطیب خاطر عمل کیا کرو

محمد حسام الدین فاضل

کھیلوں کا طرز تربیت

مولوی سید محمد ہادی صاحب بی اے بی ٹی (کنٹب) ناظم ورزش جسمانی

معلم ورزش گیمس ماسٹر کا طرز عمل اس میزبان کی طرح ہونا چاہیے جو میزبانی کی ہر بات میں

حصہ لیتا اور اس کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اس کا مہمان خوش وخرم رہے۔ نہ صرف یہی بلکہ
گیمس ماسٹر کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے ہر ایک طالب علم کی سیرت سے واقف
ہو جائے اور اس کی خوبیوں اور برائیوں کو جانچ سکے۔ اس مقصد کے حصول کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ
اس کو اپنے رتبے کا خیال نہ رہے بلکہ بچوں کے ساتھ خود بھی کھیل میں حصہ لے کیونکہ اس صورت
میں وہ بچوں کے اطوار و افعال سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔ اور اس کی محبت بچوں کے
دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔ ان اساتذہ کو جو کلاس روم میں سبق پڑھایا کرتے ہیں
اس قسم کا موقع نہیں مل سکتا کیوں کہ اگر وہ بچوں کے ساتھ مذاح کریں یا انہیں آزادی دیں تو
ضبط (ڈسپلن) میں فرق آجائے گا جس کی ان کو ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے
اساتذہ نہ اپنے لڑکوں کی سیرت سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں اور نہ ان میں اور
بچوں میں ایسا خلوص پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔ پس اگر کوئی گیمس ماسٹر ہوشیار
اور تعلیم یافتہ ہے تو وہ اُن مواقع سے جو اس کو اکثر کھیل میں ملا کرتے ہیں بیحد فوائد اٹھا
سکتا ہے اور بچوں کے چال وچلن درست کرنے اور ان کی جسمانی حالت کو ٹھیک کرنے
میں اپنے کو نہایت کارآمد ثابت کر سکتا ہے۔ اس کام کے لئے سب سے بڑی شرط
دلچسپی ہے اگر استاد کو اپنے لڑکوں کی درستگی میں دلچسپی نہ ہو اور وہ صرف تنخواہ کمانا
چاہتا ہو تو اس کے لئے مواقع کا ملنا اور نہ ملنا یکساں ہے۔

یوں تو ہر استاد حالات اور اپنی طبیعت کے مطابق کھیل سکھلانے کا اصول
اپنے لئے مرتب کر سکتا ہے لیکن چند باتیں یہاں بتلائی جاتی ہیں جو اُن لوگوں کے کام
آسکتی ہیں جو ناتجربہ کار اور نو سکھ ہیں۔

کسی نئے کھیل کو شروع کرنے کے قبل استاد کو چاہیے کہ سب لڑکوں کو جمع کر کے
ایک چھوٹی سی تقریر کرے جس میں اس کھیل کے اصول اور طریقوں کو سلیس الفاظ میں
بیان کیا جائے۔ اور جب لڑکے ان سے آگاہ ہو جائیں تو چند ہوشیار طلباء کو منتخب کیا جائے

اوران سے کہا جائے کہ اس کھیل کو کھیلیں اور دوسرے طلباء مشاہدہ کریں۔ اس طرح بہت جلد لڑکے کھیل سے واقف ہو جائیں گے۔

اب رہا یہ مسلہ کہ استاد کس قسم کے کھیل سکھائے اس بات کو خود اسے جانچنا اور سمجھنا چاہیئے اسے لازم ہے کہ کئی ایک کھیلوں سے واقف ہو تاکہ جب وہ محسوس کرے کہ بچوں کا دل ایک طرح کے کھیل سے اُکتا گیا ہے تو دوسرا کھیل شروع کر دے جس سے ان کی دلچسپی قائم رہے اور کسی وقت بھی ضبط میں فرق نہ آنے پائے۔ کیوں کہ کھیلتے وقت اگر لڑکے شور وغل مچائیں تو کھیل کا لطف جاتا رہتا ہے۔ نیز استاد بھی مشکلات میں پھنس جاتا ہے۔ لڑکوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ جس وقت استاد حکم دے وہ اپنے کو ساکت بنا دیں اور اس کے حکم کی پابندی کریں۔ چونکہ استاد کا بار بار چلانا معیوب تصور کیا جاتا ہے اس لئے اگر وہ اپنے یہاں ایک سیٹی رکھے تو بہتر ہوگا۔ لڑکوں کو تاکید کی جائے کہ سیٹی کی آواز پر وہ خاموش ہو جایا کریں۔

گیمس ماسٹر کو دھیان رکھنا چاہیئے کہ جو فوائد کھیل سے حاصل ہوتے ہیں وہ ہر ایک لڑکے کو ملیں جو لڑکے بزدل اور شرمیلے ہوں ان کو جرأت دلائی جائے اور ان سے ہمدردی کی جائے۔ کیونکہ ایسے ہی لڑکے ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔ جب کبھی وہ ذرا سی بھی ہمت دکھائیں تو ان کی تعریف کی جائے اور ان کی برائیوں کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جائے جو طلاب خود غرض اور جری ہوں اور اس فکر میں رہتے ہوں کہ کھیل میں سب سے زیادہ حصہ لیں اور شرمیلے لڑکوں کو محروم رکھیں تو استاد کا فرض ہے کہ ان کو اس روش سے روکیں اور ان کے حق کے مطابق انہیں حصہ دے۔ بچوں کو اس بات کی ترغیب دلائی جائے کہ وہ چست و چالاک رہیں اور اپنے کام کو پھرتی سے انجام دیں۔ کم عمر بچوں کے گرنے یا چوٹ کھانے کی زیادہ پروا نہ کریں کیونکہ ان کا گرنا اور چوٹ کھانا ان کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے اور آیندہ چلکر وہ مضبوط اور تندرست نکلتے ہیں۔

ٹیم گیمس کی طرف زیادہ توجہ کی جانی چاہیے کیونکہ ان کی بدولت بچوں میں اتفاق و ہمدردی کا مادہ ہوتا ہے۔ اس بات پر زور دیا جائے کہ ایک ٹیم کے سب لڑکے اپنی ٹیم کی کامیابی اور عزت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس میں خود غرضی کا دخل نہ ہونے دیں۔ اگر کوئی لڑکا اپنی شہرت کا خواہاں ہو کر دوسروں کا کھیل خراب کرتا ہے تو اس کو تاکید کی جائے کہ ایسا نہ کرے اس پر بھی اگر وہ اپنی روش نہ بدلے تو اسے ٹیم سے نکال دیا جائے کیونکہ ایسے لڑکے کا اثر دوسروں پر برا پڑتا ہے۔

استاد کا فرض ہے کہ کھیل کے قواعد سے بخوبی واقف ہو اور ان کے مطابق کھیل سکھلائے جو لڑکے قواعد کی پابندی نہ کریں ان کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہیے۔ ورنہ ضبط میں فرق آجائے گا اگر کوئی لڑکا کھیل کے درمیان بے ایمانی کرے تو اسے اچھی خاصی سزا دینی چاہیے تاکہ آیندہ کے لئے اسے سبق مل جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ کھیل جیتنے کے لئے جو لڑکے بچپن میں جھوٹ بولتے اور بے ایمانی کرتے ہیں وہ بڑے ہونے کے بعد بھی ان عیوب کو دور نہیں کر سکتے لہذا اس بات کا زیادہ خیال رکھا جائے کہ لڑکے بچپن ہی سے ایسی تربیت پائیں کہ جھوٹ و بے ایمانی ان کی سرشت سے دور ہو جائے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ہندوستانی طلبا کھیل کے درمیان منصف (رفری) کی جانچ سے برہم ہو کر ناشایستہ الفاظ اس کی شان میں استعمال کرتے ہیں اور بعض اوقات لڑنے جھگڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں یا جب کبھی کھیل میں شکست ہوتی ہے تو بجائے اس کے کہ ایک اعلیٰ کھلاڑی (اسپورٹسمن) کی طرح اپنی شکست قبول کریں اور غالب ٹیم کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دیں فوراً کوئی حیلہ ڈھونڈ کر اعتراض پیش کر دیتے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی بری خصلت ہے۔ منصف حتی الامکان انصاف سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بھی انسان ہے کبھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ لہذا اس پر لعنت بھیجنا اور اعتراض کرنا شرفا و کھلاڑی کا شیوہ نہیں گیمس ماسٹر کا فرض ہے کہ لڑکوں کو ابتدا ہی سے اس بات کا عادی بنا دے کہ وہ منصف کے

ہر حکم کو بلا عذر و حیلہ بجا لائیں اور شکست کے بعد فاتح ٹیم کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دیں اور اُن خوبیوں پر نظر ڈالیں جو اس ٹیم کی کامیابی کا باعث ہوئیں اور اپنی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے مدارس میں کھیلوں کی تعلیم اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر ہیڈ ماسٹر اس جانب توجہ نہیں کرتے اور نہ ان کو اہم تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ کھیل ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت طلباء کے چال چلن بہ نسبت کتبی تعلیم کے زیادہ درست ہوسکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انگلستان اور امریکہ میں کھیل کو بہت اہمیت دی گئی ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم بھی اپنے دقیانوسی خیالات کو بدل دیں اور کھیل میں جو وقت صرف ہوائے سے رائگاں نہ سمجھیں۔ اگر ہمارے یہاں کے صدر مدرسین کھیل کی تعلیم کو ایسے اساتذہ کے زیر نگرانی کریں جو خود اپنے زمانے میں عمدہ کھلاڑی رہے ہوں اور جنہیں اب تک کھیل سے دلچسپی باقی ہو اور جو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں تو یقیناً بہت جلد ہمارا ملک بھی اس شعبہ میں ترقی کرے گا۔ ہمارے یہاں کے مدارس میں کھیلوں کی تعلیم عموماً ڈرل ماسٹروں کے ذمہ کی جاتی ہے جو اس کام سے ناواقف اور تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اصحاب کھیل میں دلچسپی نہیں لیتے اور اگر کسی قدر لیں بھی تو ان کے اصول سے واقف نہیں ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکے ابتدا ہی سے غلط اصول پر کھیل سیکھتے ہیں جو آئندہ چلکر ایسی جڑ پکڑتے ہیں کہ اگر انہیں درست اصول و طریقے بتائے بھی جائیں تو کار آمد ثابت نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان کی ترقی محدود ہو جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اگر متذکرہ بالا اصول و ہدایات پر اساتذہ متعلقہ عمل پیرا ہوں تو طلباء مدارس کے چال چلن بھی درست ہوں گے اور وہ کھیل میں بہت کچھ ترقی کریں گے۔

طلبائے دارالعلوم کی سیر ایلورا

از جناب پرکاش راؤ صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ مددگار دارالعلوم
مترجمہ مولوی اللہ بخش صاحب بی۔ اے مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم

تعلیمی سفر اگر عمدہ اور صحیح اصول پر ترتیب دیا جائے تو نہایت ہی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے چنانچہ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر ہم نے چند مہینوں قبل اس امر کا تہیہ کر لیا کہ اس خصوص میں اپنی ابتدائی مہم کی افتتاح کر دیں اور جب اس معاملہ پر غور و خوض سے کام لیا گیا تو یہ بات ذہن میں آئی کہ اگر ہم ایلورہ کے سفر کا ارادہ کریں تو ہم کو بہت سے تاریخی مقامات کے دیکھنے کا موقع مل سکے گا کیونکہ ناندیڑ میں سکھوں کا گردوارہ۔ اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کا مقبرہ۔ دولت آباد کا قلعہ۔ خلد آباد کے مقابر یہ کل عمارات حیدرآباد سے ایلورے تک ہم کو راستے ہی میں ملتی ہیں اور ہر مقام اپنی اپنی انوکھی خصوصیت رکھتا ہے ان میں سے ایک سکھوں کا مندر ہے دوسرا ایک مقبرہ ہے جو دنیا کے مقبروں میں سب سے زیادہ ممتاز مقبرہ ممتاز محل کے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے تیسرا ایک قلعہ ہے جس کا ذکر ہندوستان کی ہر تاریخ میں موجود ہے اور چوتھا مقام مشاہیر کے مزارات کا نادر مجموعہ ہے جو زمانہ قدیم کے اولیاء اللہ اور بادشاہوں کا قبرستان ہے اور جو اس قابل ہے کہ اس پر بھی ایک ایسی ہی پراثر اور گداز نظم لکھی جائے جو انگلستان کے مشہور و معروف قبرستان ویسٹ منسٹر ابے پر لکھی گئی ہے جہاں انگلستان کے ہر علم و فن کے ذی کمال اور یگانۂ روزگار شعرا اور علما مدفون ہیں۔ اور سب سے آخری وہ نادرۂ روزگار پہاڑوں میں تراشے ہوے مندر ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنی قدرت اور شان و عظمت سے محو حیرت بنا رکھا ہے اور جن کی

برکت سے بارہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ایلورے کے کھنڈر اب تک تیرتھ گاہ بنے ہوئے ہیں جہاں نہ صرف ہندوستان اور ممالک مشرق سے لوگ امنڈے چلے آتے ہیں بلکہ ان کی عجیب غریب صناعی اقالیم امریکہ و یورپ کے شوقین سیاحوں کو بھی اپنی طرف کھینچتی رہی ہے

الغرض ہم نے اس خیال سے کہ یہ ہمارے طلبا کے حق میں نہایت ہی مفید اور سبق آموز ثابت ہوگا۔ ایلورے ہی کے سفر کی ٹھان لی اور ضروری انتظام و اہتمام کے بعد اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا۔ آگے چلکر میں اس سفر کے تفصیلی حالات بیان کرونگا مگر قبل ازیں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تفصیل دوسروں کے لئے ایسی دلچسپ ثابت نہیں ہوگی جیسی میرے اور میرے طلبا کے لئے ہو سکتی ہے لیکن باوجود اس کے میں اپنے ہم پیشہ اساتذہ کے روبرو اس امید پر تفصیلی حالات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بھی جب کبھی اس قسم کے سفر کا تہیہ کریں تو ہمارے تجربات سے ان کو کچھ نہ کچھ فائدہ اور سہولت حاصل ہو۔

اس سفر کا تہیہ کرنے کے بعد روانگی سے ایک مہینہ پیشتر ہی ہم نے لڑکوں کو اس سے آگاہ کردیا چونکہ سفر دور دراز کا تھا اس لئے صرف جماعات فوقانیہ کے طلبا کو شریک کرنے کی تجویز کی گئی اور یہ طے پایا کہ سفر تعطیلات سرما میں کیا جائے۔ سفر کی دلچسپی کو بڑھانے کی غرض سے میں نے اس خیال کا بھی اظہار کردیا کہ کچھ حصہ سفر پاپیادہ بھی طے کیا جائے کیونکہ اس سے ایک تو اخراجات میں بھی تخفیف ہوگی اور دوسرے لڑکوں کے لئے سیر و تفریح کا بھی موقع ہاتھ آئے گا۔ جو رقم ہر لڑکے کے ذمے مقرر کی گئی بہت ہی قلیل تھی سفر کو لڑکوں کے لئے دلکش بنانے میں جملہ ممکنہ طریقوں سے کام لیا گیا پہلے پہل تو لڑکوں نے بڑے ہی جوش کا اظہار کیا یعنے پچاس طلبا نے ساتھ چلنے میں رضامندی ظاہر کی اور میں اپنے دل میں سمجھتا تھا کہ اگر بارہ لڑکے بھی ہمارا ساتھ دے سکیں تو کچھ کم خوشی کی بات نہیں ہے کیونکہ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ کم سے کم بارہ لڑکے بھی جمع ہوجائیں تو سفر پر روانہ ہوجاؤں گا لیکن جب سفر پر روانہ ہونے کا وقت آپہونچا

تو بارہ لڑکوں میں سے بھی ایک لڑکا کم ہوگیا اور میرے شامل ہونے کے بعد بارہ کی تعداد پوری ہوئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حیدرآبادی لڑکوں کے سرپرست ہنوز تعلیمی سیر و سیاحت کے مفید اور سبق آموز تجربات کا مطلق احساس نہیں رکھتے وہ اپنے بچوں کی پوشاک و خوراک میں بیس پچیس روپے وقت واحد میں صرف کردیں گے لیکن تعلیمی سیر و سیاحت کی غرض سے دس بارہ روپے کا صرف بھی بیکار سمجھتے ہیں کیونکہ جوتوں اور کپڑوں کا مصرف وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں لیکن علمی سیر و سیاحت کے فوائد کوئی مادی شئے تو نہیں کہ اُس کو بھی وہ آنکھوں سے دیکھ لیں۔

خیر اس کا ذکر جانے دیجئے اصل واقعہ سنئے۔ ہم کو اپنے سفر کے لئے ریلوے رعایتی ٹکٹ حاصل کرنے میں پہلے پہل کسی قدر دقت اٹھانی پڑی لیکن خدا بھلا کرے ٹرافک منیجر کا کہ اس نے ازراہ ہمدردی ہمارے اس سفر کو قواعد ریلوے کے منافی خیال نہیں کیا بلکہ اس کا تعلیمی اغراض پر مبنی ہونا تسلیم کرکے رعایت منظور کرلی۔ اگر آئندہ کسی مدرسے کو اس قسم کی دقت پیش آئے تو ہماری یہ نظیر اس دقت کو حل کرنے میں بہت ہی موید ثابت ہوگی۔

سفر کا نظام العمل قبل از قبل تیار کرلیا گیا اور لڑکوں کو اس کی اطلاع دیدی گئی پہلے ہمارا یہ خیال تھا کہ باورچی کو ساتھ لے جائیں لیکن لڑکوں نے خود پکانے پر آمادگی ظاہر کی تو یہ خیال کچھ اپنی مدد آپ کرنے کے اصول کو مدنظر رکھ کر ترک کردیا گیا لیکن ساتھ ہی لڑکوں کو متنبہ کردیا گیا کہ ہر قسم کی سختی اٹھانے پر تیار رہیں ان کو یہ ہدایت بھی کردی گئی کہ اپنے ساتھ جہاں تک ممکن ہو ہلکی گٹھڑیاں لائیں تاکہ وقت ضرورت ان کو اپنی کمر سے باندھ کر بھی چل سکیں۔ حقیقت میں جب ہم

دولت آباد پر ریل سے اترے تو بنڈی والوں نے کرائے کے بارے میں تکرار شروع کردی لڑکے خود خلدآباد تک اپنا سامان آپ لیکر چلنے پر آمادہ ہوگئے اور جب کرائے کا تصفیہ ہوگیا تو لڑکوں نے بڑی مشکل سے میرے کہنے پر اپنا سامان بنڈی والوں کے حوالے کیا۔ ہر ایک لڑکے کو ایک توشک ایک تکیہ۔ ایک بلانکٹ۔ ایک یا دو کپڑوں کے جوڑے ایک رکابی ایک لوٹا صابون اور برسش رکھنے کی ہدایت کی گئی جن کے پاس پانی کی بوتلیں اور سفری تھیلے تھے ان سے کہا گیا کہ یہ چیزیں بھی ساتھ رکھیں تو اچھا ہے۔

ہم ۲۵ ڈسمبر کو عین سردی کے زمانے میں روانہ ہونیوالے تھے اور ہمیں ایک سطح مرتفع پر جانا تھا لہذا لڑکوں کو ہدایت کردی گئی کہ وہ گرم لباس پہنیں بعض لڑکوں نے اپنی نادانی کی وجہ سے ہماری نصیحت پر توجہ نہیں کی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ انہیں صبح کے دس بجے تک خلدآباد کے کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں میں سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے دیکھ کر ہمیں بڑا افسوس ہوا کرتا تھا۔

بعض لڑکے بھاری ہانڈ بیگ اور بستر اپنے ساتھ لائے تھے اگر اتفاق سے دولت آباد پر بنڈی والے سے کرائے کا تصفیہ نہ ہوتا تو اس وقت ان کے بھاری بوجھ کی حقیقت کھلتی ان کو اپنی حماقت اور نادانی کا پورا پورا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ لڑکوں سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ پنسل اور نوٹ بک بھی رکھ لیں اور دن بھر جن جن چیزوں کا مشاہدہ کریں رات کو بطور ڈائری کے لکھ لیا کریں تاکہ حیدرآباد واپس ہونے کے بعد اس کی مدد سے مضامین لکھ سکیں۔ ہم نے اپنے ساتھ ایک کوڈاک (کیامرہ) بھی اس غرض سے رکھ لیا تھا کہ جو جو مقامات ہمارے دیکھنے میں آئیں وہاں کے بعض بعض مناظر کے فوٹو بھی لے لیں۔ نیز ہم نے ناظم صاحب آثار قدیمہ سے اس امر کی اجازت بھی حاصل کرلی تھی کہ ایلورا کے بعض غاروں کے فوٹو لے سکیں۔

غرض اس طرح ساز و سامان سے درست ہو کر ہم پچیسویں دسمبر ۱۹۲۶ء کو رات کی ٹرین میں حیدر آباد سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دو بجے اورنگ آباد پہونچے۔ یہاں پہونچنے کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ جن صاحب کے پاس ہم نے قیام کا انتظام کیا تھا وہ شہر میں موجود نہیں ہیں تو ایک گونہ مایوسی ہوئی لیکن اتفاق سے وہاں بعض دوستوں کی مہربانی سے ہماری رہائش کا خاصا انتظام ہو گیا اور ہم بہت جلد آرام و آسائش کے ساتھ گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک کشادہ ہال میں فروکش ہو گئے ہمارے ساتھ کا ایک لڑکا فوراً دوڑ کر شہر گیا اور ایک اسکاوٹ بائے کی مدد سے روٹی پھل اور دودھ خرید لایا جو ہمارے دوپہر کے کھانے کے لئے کافی ہو گیا بعض لڑکوں نے کانا پھوسی شروع کر دی کہ ان کی سختی کا زمانہ ابھی سے شروع ہو گیا کیونکہ چپاتی چاول اور سالن نہیں ملا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بعد چوبیس گھنٹوں تک ان کو اسی طرح گزارنا پڑا کیونکہ وہاں پکانے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا اور دوسرے دن بارہ بجے تک ہم کو محض ڈبل روٹی چائے پھلوں پر بسر کرنا پڑا جب ہم شہر میں گشت لگا رہے تھے تو کہیں لڑکوں کی نظر ایک ہوٹل پر پڑ گئی اور سب نے اصرار شروع کر دیا کہ دن کا کھانا اسی ہوٹل میں کھالیں وہ ایسا کثیف ہوٹل تھا کہ کبھی میری نظر سے نہیں گذرا تھا اور نہ میں نے کبھی عمر بھر ایسی جگہ قدم رکھا تھا مگر لڑکوں کے اصرار پر مجھے بھی جانا پڑا اور جب میں نے ان کو شوق کے ساتھ نوالے پر نوالہ اڑاتے اور رکابیوں پر رکابیاں جو ہوٹل کا آدمی لالا کر دے رہا تھا چٹ کرتے ہوئے دیکھا تو محسوس ہوا کہ بھوک بھی انسان کو کس حالت پہونچا دیتی ہے کہ اس کو نہ اچھے کا خیال رہتا ہے نہ برے کا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین کر رہا تھا کہ کیوں میں نے ان کو ایسی کثیف جگہ پر کھانے کی اجازت دی اور اورنگ آباد ہی سے مجھے اس بات کا خوف دامنگیر ہو گیا کہ دیکھیں آخر تک لڑکوں کے طرز عمل کی حالت کیسی رہتی ہے لیکن جیسا کہ آپ آگے چلکر دیکھ لیں گے۔

لڑکوں نے ہر ایک بات میں جوانمردوں کی طرح کام کرنا شروع کر دیا حالانکہ ابتدا میں وہ
کسی قدر پست ہمت نظر آتے تھے۔

ہم نے اورنگ آباد کے مختلف مقامات کی سیر میں نہایت تیزی سے کام لیا
اور جب تک وہاں ٹھیرے ایک لمحہ بھی بیکار جانے نہیں دیا اس میں شک نہیں کہ سب سے
زیادہ مسرت بخش نظارہ روضہ کا تھا۔ ہم نے پن چکی، ایک مشہور و معروف مسلمان ولی
کا مقبرہ، اورنگ زیب کا محل عثمانیہ کالج اور مدرسۂ صنعت و حرفت بھی دیکھا۔ ہم نے
آبادی کا اندازہ کرنے کی غرض سے شہر کی بعض گلیوں میں بھی گشت لگایا۔ فٹ بال،
ہاکی اور کرکٹ کے مقابلے بھی جو اس وقت وہاں ہو رہے تھے دیکھنے کا اتفاق ہوا
اور اڑتالیس گھنٹے قیام کرکے اس مقام کی سیر سے پورا پورا لطف اٹھانے کے بعد ہم
۲۸ ڈسمبر کو دولت آباد روانہ ہوئے۔

ہم دولت آباد کو تقریباً دو بجے شام کے پہونچے اور اپنا سامان ایک بنڈی
میں ڈال کر خلد آباد پیدل گئے سفر نہایت ہی دل کش اور دلپذیر تھا جس سے ہم سب
کمال درجہ مسرور و محظوظ ہوے۔ سڑک کے دونوں جانب بیر کے درخت جو بیروں سے
لدے ہوئے تھے دو رویہ قطار باندھے چلے گئے تھے لڑکے دوڑ دوڑ کر بیر چننے میں
ایسے مصروف ہوئے کہ سفر کی تکان بھی قریب قریب بھول گئے۔ جا بجا ہم چکردار
راستے کو چھوڑ کر ایک ڈھالوان پہاڑی پر جو چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھری ہوئی
ہوتی تھی مسافت کم کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ کھیل اور دلگی کے طور پر چڑھ جایا کرتے تھے
مجھے ان کو ایسی حالت میں دیکھ کر ہمیشہ بڑی مسرت ہوتی تھی کیونکہ میں اچھی طرح سے محسوس
کر رہا تھا کہ کھلی ہوا اور مناظر قدرت ان پر علانیہ اپنا اثر ڈال رہے ہیں اور اس طرح سے
مجھے ان کے یہاں لانے کے مقاصد میں سے ایک مقصد پورا ہوتا ہوا نظر آتا تھا اس میں
کوئی شک نہیں کہ میں نے یہاں اپنا تحکمانہ طریقہ بالکل ہی ترک کر دیا اور سفر بھر میرا

طرز عمل ایسا ہی رہا میں بلا تکلف ان کی ہنسی دل لگی میں ان کا شریک حال ہو گیا کیونکہ اس سے میرے دل کو بے انتہا تسکین حاصل ہوتی اور وہ تمام رکاوٹیں جن سے بناوٹ اور تکلف کا اظہار ہوتا تھا یک لخت جاتی رہیں اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا خود اپنے بچوں میں ہوں۔ لڑکوں کی اس قابل تعریف بات کا یہاں ذکر کر دینا ضروری ہے کہ انہوں نے اس آزادی کو جو میں نے انہیں دے رکھی تھی بری طرح استعمال نہیں کیا۔ شروع سے آخر تک ان کا رویہ لایق تحسین و مستحق ستایش رہا مجھے فی الحقیقت اس بارے میں اپنے آپ کو نہایت خوش قسمت تصور کرنا چاہئے کیونکہ میں نے اکثر اس قسم کے سیر و تفریح کے موقعوں پر لڑکوں کو کسی نہ کسی وجہ سے مطلق العنان ہوتے ہوئے سنا ہے۔

ہم تقریباً مغرب کے وقت خلد آباد پہونچے راستہ میں ایک شخص نے ہمیں یہ متوحش خبر سنائی کہ ڈاک بنگلے مسافرین سے معمور ہیں اور دو یا تین موٹر لاریوں میں بھرے ہوے مسافرین اسی صبح کو غار ہائے ایلورا کے دیکھنے کے لئے بمبئی سے وارد ہوے ہیں اور ہم کو وہاں ٹھیرنے کی جگہ نہیں ملسکتی۔ اسی وقت سے شدید سردی شروع ہو گئی تھی اور ہم سب اس قدر بھوکے اور تھکاوٹ میں چور تھے کہ ہمارے دل میں یہی خیالات گذر رہے تھے کہ اب ہم کو کرنا کیا چاہئے۔ ڈاک بنگلے نظر کے روبرو تھے اور ہم تھکاوٹ کی وجہ سے نہایت ہی آہستہ قدم اٹھاتے ہوے اس امید میں آگے بڑھے چلے جا رہے تھے کہ کاش کم سے کم ایک ہی کمرہ مل جائے تو غنیمت ہے جب ہم ابھی خیال میں مستغرق تھے تو ہمارے ساتھ کے دو لڑکے جو کسی قدر آگے بڑھ گئے تھے ایسے ایسا کیساتھ جو مژدہ فتح و نصرت بن کر ہمارے کانوں تک پہونچے دوڑتے ہوے آئے اور کہا کہ "ماسٹر صاحب ہم بہت ہی خوش قسمت ہیں ہمیں ایک کمرہ اور کچھ برتن کھانے پکانے کے قابل مل گئے ہیں" اس وقت ہم سب کے دل پر وہی جذبہ مسرت طاری ہو گیا جو ریگستان میں نخلستان کو دیکھ کر سیوں ہڈسیں کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ چند ہی منٹ کے بعد

ہم ڈاک بنگلے کے ایک آراستہ اور خوبصورت کمرے میں ہم ہنستے بولتے نظر آنے لگے ڈاک بنگلہ ایک مرتفع پہاڑی پر ہے جس کے دامن میں غار ہائے ایلورا واقع ہیں جب ہم صبح بیدار ہوے اور بنگلہ کے برآمدے سے اطراف وجوانب پر نظر دوڑائی تو ایک نہایت ہی دلکش منظر پیش نظر ہوگیا۔ تیس یا چالیس میل تک وسیع وکشادہ میدان پھیلا ہوا چلا گیا تھا اور بیل گاڑیوں کی قطاریں دامن کوہ کی چکردار سڑک پر سے اوپر آتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے وقفہ سے کسی نہ کسی موٹرلاری کی آواز بھی کانوں میں آجاتی تھی۔ غرض یہ کہ صبح کے آٹھ نو بجے تک نیچے کا تمام میدان ان مسافرین سے جو ایلورے کی سیر کو آئے ہوئے تھے آباد نظر آنے لگا جب ہم نے سیکڑوں مسافروں کو ان اعلیٰ صنعت و کاریگری کے نمونوں کی داد دینے کے لئے چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر آتے ہوے دیکھا تو ایک ایسا نظارہ پیش نظر ہوگیا جو قوت خیال میں ایک ہیجان پیدا کرنے والا تھا۔

ہم غاروں کو دیکھنے کی غرض سے بھی جلدی جلدی پہاڑی سے نیچے اترے ڈاک بنگلے سے لیکر دامن کوہ تک کی ڈھالوں گھاٹی بذات خود ایک دلچسپ چیز تھی ہم پہاڑی کے دامن میں پہونچ کر جس پہلے غار میں داخل ہوے وہ کیلاش مندر (غار نمبر ۱۶) کہلاتا ہے اور جب ہم اس مندر میں ادھر اُدھر اس کی حیرت انگیز صناعی کا مشاہدہ کرتے ہوے پھر رہے تھے اور ایک ایک چیز کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے تو ہم کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا ہم تمام غاروں کو جو تعداد میں تیس سے زیادہ ہیں ان چند گھنٹوں میں جو ہم صرف کر سکتے تھے ہرگز نہیں دیکھ سکیں گے۔

ان غاروں کا بیان میرے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔

ایک تو مجھے طوالت کا خوف ہے اور دوسرے یہ کہ جب میں ان اعلیٰ صناعی کے زبردست نمونوں کے بیان کرنے کا خیال کرتا ہوں جو حقیقتاً ناقابل بیان ہیں تو مجھپر ایسے

جذبات طاری ہو جاتے ہیں کہ میں کما حقہا ان کے بیان سے اپنے آپ کو عاجز و قاصر پاتا ہوں اللہ اکبر کس قدر غیر محدود استقلال اور کیسی ناقابل تصور ہنر مندی سے کام لیا گیا ہوگا کہ بڑے بڑے پہاڑ ایسی آسانی سے تراش دئے گئے گویا لکڑی سے بھی کم حیثیت رکھتے ہیں اور ان بے ڈول اور بے جان چٹانوں میں لازوال خوبصورتی کی روح پھونک دی گئی۔ جب ہم ان غاروں کا حیرت و استعجاب سے معائنہ کرتے اور اُن جادوگروں کی سحر طرازی کی داد دیتے ہوئے جنہوں نے پتھر سے موم کا کام لیا تھا اِدھر اُدھر پھر رہے تھے تو ہم پر ایک ایسی وارفتگی چھائی ہوئی تھی کہ ہم کو مطلق اِس بات کا احساس نہیں تھا کہ ہم نے پہاڑی پر سے یہاں پہونچنے میں چار میل سے زیادہ مسافت طے کی تھی اور چھ گھنٹے سے بھی کم عرصہ میں تیس غاروں کا معائنہ کیا تھا۔

ہمارے لڑکے اپنے تجربے سے نہایت خوش تھے ہر ایک نے اس مقام کو دیکھنے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ایک ایک چیز کا بغور معائنہ کرکے اس کی حقیقت و ماہیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے مثلاً زمین میں سوراخ کے ہونے کی کیا وجہ اور چٹاں کے آگے کی طرف بڑھ آنے کا کیا سبب وقس علیٰ ہذا۔ بعض لڑکے موم بتیاں روشن کرکے تاریک کمروں اور غاروں میں داخل ہوئے اور سب کے سب ایسا محسوس کر رہے تھے کہ گویا پہلی ہی دفعہ اس مقام کی تحقیق اور مشاہدہ کر رہے ہیں۔ چند لڑکوں نے یہاں اور ایک دن ٹھیرنے کی درخواست کی لیکن مقتضاء وقت اور اخراجات کی کمی نے ہم کو دوسرے ہی دن یہ مقام چھوڑ کر دولت آباد جانے پر مجبور کردیا۔ بعض بہت ہی جوشیلے طلباء نچلے نہ بیٹھ سکے اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی ایلورا کے غاروں کو پھر ایک دفعہ دیکھنے کی غرض سے چلے گئے۔ ۳۰ ہر ڈسمبر کی صبح کو ہم ایلورے سے بادل ناخواستہ روانہ ہوے۔

راستہ میں ہم نے خلد آباد کے بعض مشہور مزارات مثلاً مزار ابو الحسن تانا شاہ

مزار عالمگیر۔ مزار نظام الملک اول۔ مزار ملک عنبر اور ان کے علاوہ کئی اولیا اللہ کے
مزارات کی بھی زیارت کی ایک گھنٹہ مقابر کی سیر کرنے کے بعد ہم دولت آباد کو روانہ
ہوئے جہاں ہم تقریباً شام کے دو بجے تک پہونچ گئے۔ اس روز یہاں گاؤں میں ایک
میلہ ہو رہا تھا سیکڑوں ہندو جاتری قلعہ کے اوپر چڑھتے اور اترتے نظر آرہے تھے
اس منظر نے لڑکوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیا اور باوجودیکہ وہ آٹھ یا نو میل کی مسافت
طے کرکے آئے تھے لیکن پھر بھی قلعہ پر چڑھنے کے لئے تیار ہوگئے ہم نے قلعہ کی کل
قابل دید چیزیں دیکھیں مثلاً سنہری محل جس کا سب سونا کسی اور جگہ چلا گیا۔ ہاتھی تالاب جس میں
نہ ہاتھی تھا نہ پانی۔ قدیم توپیں جو خاموشی سے فصیلوں پر آرام کر رہی تھیں خفیہ پل جو
ہمیشہ کے لئے زمین پر ڈال دیا گیا تھا اور تاریک سرنگ جس کے متعلق میں صرف یہی
نہیں کہوں گا کہ اب اس کی تاریکی کافور ہوگئی ہے بلکہ اس کی وہ پہلی پراسرار اور
خوفناک ہیبت بھی بالکلیہ جاتی رہی ہے۔ تقریباً قلعہ کی سیر میں دو گھنٹے صرف کرنے کے
بعد ہم مغرب کے وقت اپنی قیامگاہ کو پہونچ گئے اب ہماری سیر ختم ہوچکی تھی اس وقت
لڑکوں کی حالت کا اندازہ کرنا چاہئے گو ان تین دنوں میں انہوں نے میلوں پا پیادہ
سفر کیا تھا اور پکانے میں بھی بہت کچھ زحمت اٹھائی تھی لیکن اب تک کسی کی زبان سے
نہ تھکاوٹ کی شکایت سنی گئی تھی نہ ان کی شگفتہ مزاجی میں کسی قسم کا فرق آیا تھا مگر اب
یہ کہہ رہے تھے کہ کھانا پکانے کی تکلیف برداشت کرنے کے عوض رات کی رات بھوکے
سو رہیں گے اور ریلوے اسٹیشن تک پہونچنے میں جو اب صرف ڈیڑھ میل تھا ان کو سواری
کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے دو دن
میں تیس میل کی مسافت طے کی ہو اب ڈیڑھ میل کے لئے سواری کی ضرورت محسوس
کریں لیکن میں ان کی اصلی حالت کا پورا اندازہ کرسکتا تھا۔ ان کی اس پست ہمتی کا سبب
نہ اضمحلال تھا نہ یہ بات تھی کہ وہ معقولیت سے کام نہیں لے رہے تھے بلکہ اصل راز

کچھ اور ہی تھا۔ ان کو اپنی اس سفر میں کمال درجہ دلچسپی حاصل ہونے لگی تھی اور اب جبکہ یہ ختم ہو چکا تھا ان کے دل اندر ہی اندر بیٹھ گئے اور ان کی چستی چالاکی کافور ہو گئی مختصر یہ کہ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی خواہشات منظور کر لیں کیونکہ فی الحقیقت میں انکی اس دل گرفتگی کو سفر کی کامیابی کا سبب خیال کرکے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

ہم دولت آباد سے دوسرے دن علی الصباح روانہ ہوئے اور جب ناندیڑ کے قریب آئے تو یہ طے پایا کہ وہاں کچھ دیر سفر میں وقفہ کر دیں چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور گو بہت ہی تھکے ماندے تھے مگر تاہم ناندیڑ میں بہت کچھ مقامات کی سیر کی عثمان شاہی گرنیوں کو بھی گئے مگر بدقسمتی سے وہ اس روز بند تھیں۔ ہم نے دو باتیں روئی نکالنے کی گرنیوں کا معائنہ کیا اور وہاں سے دریائے گوداوری میں تیرنے کے لئے گئے اور اس کے بعد جب غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی زرد کرنیں سکھ گردوارہ کی چمکدار سنہری کلسوں پر پڑ رہی تھیں تو ہم سکھوں کے مقدس مندر میں داخل ہوئے۔ ہم نے خوب پھر کر اس دیول کا معائنہ کیا سکھوں کا بھجن بھی سنا اور ان کی پرستش کا طریقہ بھی دیکھا جو ہمارے بچوں کو بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ بچوں کی اس دلچسپی کو دیکھکر مجھے یہاں ٹھیرنے کا بالکل ملال نہیں ہوا اس وقت تک ہم نے مردہ چیزوں کا معائنہ کیا تھا یعنے بادشاہوں اور اولیاء اللہ کے مقبرے۔ ویران اور نیم تباہ شدہ ایلورا کے غار جہاں کبھی پوجاریوں کے پرترنم بھجنوں کی آواز گونجا کرتی تھی مگر اب الو بول رہا ہے ایک پرانا قلعہ اور اس کی توپیں جو اس کلدار توپوں کے زمانے میں ایک "اچنبھا" معلوم ہوتی ہیں گو یہ سب چیزیں ایک فنا شدہ عہد ماضی کی بیجان صورتیں تھیں لیکن ہماری قوت متخیلہ نے ان کو ہمارے سامنے جیتی جاگتی شکلوں میں پیش کر دیا تھا ان کو دیکھکر از دیا ورفتہ زمانہ ہماری نظروں کے روبرو آگیا اور اس وقت کی فنا شدہ ہستیاں مقبروں میں پہاڑیوں پر اور غاروں کے مندروں میں چلتی پھرتی نظر آنے لگیں۔

ہم اسی رات کو ناندیڑ سے روانہ ہوئے اور کرسمس کی صبح میں حیدرآباد پہونچ گئے۔

یہ ہیں ہمارے الیورے کے سفر کے واقعات جس کا تہیہ بڑی بڑی امیدوں سے کیا گیا تھا اور جو بڑی سعی کے بعد عمل میں آیا تھا لیکن جب خاتمہ پر پہونچا تو ہمارے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ گیا اور ہم کو یقیناً یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ ہم نے اپنی تعطیلات اور نیز اپنا روپیہ ایک اچھے کام میں صرف کیا۔ ہم سب تازہ دم ہو کر اپنے اپنے مکانوں کو آئے اور جو صحت اور تجربات ہمنے حاصل کئے وہ اس قلیل رقم سے بدرجہا قیمتی ہیں جو ہم نے صرف کی تھی اثنائے سفر میں لڑکوں کا ضبط اچھا رہا اور انہوں نے بے شمار چیزیں دیکھیں اور ہر شب سونے سے پہلے اپنی اپنی ڈائریاں لکھنے کے لئے چراغ کے اطراف جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کو ہمیشہ اس امر کی تاکید کی جاتی تھی کہ سب اکٹھے سفر کریں اور منتشر نہ ہوں۔ سب نے اپنا کام خوشی سے اور رضامندی سے انجام دیا اور جب کبھی کبھی کم عمر لڑکے کسی بات میں سستی کا اظہار کرتے تو بڑے لڑکے خوشی سے اِن کا ہاتھ بٹایا کرتے اور کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ جب میں نے ان کی ڈائریوں کا معائنہ کیا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لڑکوں نے اپنے کل مشاہدات قلمبند کئے ہیں بعضوں نے تو اس مقام کی جغرافیائی ہیئیت کذائی کا بھی اندراج کیا ہے بعضوں نے محض بیانات ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہر چیز کے متعلق اپنی ذاتی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ حیدرآباد کو واپس ہوتے ہی ہم نے طلباء اور شرکائے سفر کی ایک مجلس منعقد کی اور ہر ایک سیر کنندہ نے اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات نہایت پسندیدہ طریقہ سے بیان کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم کو اس سفر سے بے انتہا فائدہ حاصل ہوا۔

ریاضتِ جسمانی

از مولوی ولایت علی صاحب ضیابیؔ۔ اے صدر مدرس مڈل اسکول شاہ علی بنڈہ

اقوام کے تنزل کے جہاں اور اسباب ہیں ریاضت جسمانی سے تغافل بھی ایک بڑا سبب ہو سکتا ہے۔ اگر یہاں پر یہ کہا جائے کہ کسی قوم کی فنون لطیفہ کی ترقی اس کے تنزل کا پہلا زینہ ہے تو نا مناسب نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کو اس پر اعتراض ہو مگر تاریخ ہر بار اسی قصہ کو دہراتی رہی اور دہراتی رہے گی۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان فنون لطیفہ کی طرف اسی وقت توجہ کرتا ہے جب کہ اس کے دل و دماغ دنیا کے دوسرے جھگڑوں سے پاک و صاف ہیں اور ان الائش دنیوی کی کثافت ان میں سے بالکل جاتی رہے۔ یا بہ الفاظ دیگر یہ کیا جا سکتا ہے کہ جب تک کوئی قوم کشمکش حیات اور تنازع للبقا کے جھگڑوں میں مبتلا رہتی ہے اس وقت تک اس کے افراد کے دماغ فنون لطیفہ کے طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ کسی قوم کے فنون لطیفہ میں ترقی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اب تلوار رکھدی اور وہ تمدن و معاشرت کی طرف گامزن ہے۔

ایک زمانہ سے یورپ کیا بلکہ تمام دنیا کی بڑی بڑی قوتیں اس بات کی کوشاں ہیں کہ دنیا کی تمام قوتوں کو بے ہتیار کر دیا جائے اور اسی امن کی زندگی کے خاطر لاکھوں روپیہ صرف کئے جا رہے ہیں اور بڑی بڑی انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں ہر کس و ناکس ہتیار بندی کو معیار انسانیت کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تمام عقلا و حکما یہ چلا رہے ہیں کہ آج کل حکومت کا زور نہیں بلکہ حکمت عملی کا دور دورہ ہے مگر افسوس کیسا ہی

یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی انجمنوں کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے اور آئے دن کے واقعات یہ ثابت کر رہے ہیں کہ جو اقوام سب سے زیادہ کمی اسلحہ پر زور دے رہی ہیں وہی سب سے اول میدان جنگ میں اترنے اور دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے پر آمادہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لیکر ابتک جس کا ڈنڈا زبردست رہا بھینس اُسی کی ملک قرار پائی۔

دنیا کے یہ تمام واقعات ہمیں یہ سبق سکھاتے ہیں کہ جس قوم کے افراد میں جسمانی قوت نہ ہو اس کا دنیا میں قیام ناممکن سا ہوجاتا ہے۔ مگر وائے برحال ما کہ باوجود ان جیتی جاگتی مثالوں کے خواب غفلت سے نہیں چونکتے۔ اگر کسی کے کہنے سننے سے جاگے بھی، تو ایک افیونی کی طرح تھوڑی دیر آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتے رہیں اور غین ہوجاتے ہیں۔

ہمارے جسم کی دیکھ بھال اور جسمانی قوت کا رکھ رکھاو بلحاظ مذہب اخلاق غرض ہر طرح سے ہم پر فرض ہے پھر کیا وجہ ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے جاننے کے ہم خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے۔ اس کی صاف وجہ یہ کہ جب کسی قوم کے برے دن آتے ہیں تو اس کے افراد اپنی تمام اچھی باتوں کو برا سمجھکر ترک کرتے ہیں۔

کسی عقلمند سے پوچھا گیا کہ دنیا میں سب سے زیادہ مہلک مرض کونسا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ مرض سب سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے جس کا باوجود واقفیت کے مریض مداوا نہ کرے۔ ہمارا بالکل یہی حال ہے۔

ہم اپنی آنکھوں سے روزانہ اخبارات میں یہ دیکھتے ہیں کہ تعداد اموات جتنی آج کل ترقی پذیر ہے اس سے قبل کبھی اتنی تیز نہ تھی ہم اپنے ذہن میں اموات کے خیال کو صرف یہ تاویل کرکے ٹال دیتے ہیں کہ جس کی آتی ہے وہ جاتا ہے۔ مگر دنیا عالم اسباب ہے ہم نے کبھی اسپر غور نہیں کیا کہ آخر وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے

موت میں اتنی برکت ہو رہی ہے۔ دیگر وجوہ کے ساتھ ساتھ ریاضت جسمانی سے غفلت بھی ایک وجہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس وقت کئی حضرات ایسے زندہ ہیں جن پر پلیگ اور دیگر امراض کے سخت حملے ہوئے مگر ان کے بچنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے بدن میں ریاضت جسمانی کی وجہ سے اتنا خون صالح موجود تھا کہ وہ مرض کا اچھی طرح سے مقابلہ کر سکا۔ اور اسی ریاضت جسمانی کی بدولت وہ مردوں کو دغا دے گئے۔

اگر ہم فطرت کا غور سے مطالعہ کریں تو ہم یہ بات پائیں گے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذی روح ہستی اپنے وقت کا بیشتر حصہ ریاضت جسمانی میں صرف کرتی ہے۔ مگر ایک حضرت انسان ہیں کہ ہمیشہ ان کی زبان پر اشرف المخلوقات ہونے کی رٹ لگی ہے مگر ان کے افعال و حرکات ان کو اسفل کی طرف لے جا رہے ہیں

این رہ تو کہ می روی بہ قبرستان است

راقم الحروف کو خوش قسمتی سے ایک دفعہ مولانا حسرت موہانی سے ہم کلام ہونے کا موقعہ ملا۔ اس وقت بہت سے نوجوان حضرات بھی تشریف فرما تھے بزرگ موصوف نے چند مفید اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ گو تمام اقوام جسمانی قوت کو وحشیانہ پن کی دلیل ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر آپ لوگوں کو اس سے خبردار ہونا چاہیئے کہ یہ آپ حضرات کی قسمت کو سلانے کے رنگین فسانے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ صرف وہی اقوام دنیا میں دماغی ترقی کر سکتی ہیں جنہوں نے ریاضت جسمانی کو اپنے ضروریات زندگی میں جگہ دی ہو اس لئے کہ صحیح دماغ صرف تندرست جسم میں پایا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم کے لوگوں کی زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ریاضت جسمانی کو ضروریات زندگی میں جگہ دی تھی۔ ہر شریف و رذیل کو کشتی وغیرہ کا شوق تھا سیکڑوں اکھاڑے قائم تھے جہاں مختلف قسم کی ورزشیں کی جاتی تھیں۔ یہی وجوہ تھے جن کی

وجہ سے ان کے قوی ایسے رہتے تھے کہ اب ہم ان کے حالت کو فسانہ کی طور پر سنکر سیر
رہتے ہیں اور ان کو عجیب الخلقت سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی ہماری طرح انسان تھے
اس زمانہ میں جو شخص قوی ہوتا تھا یا جس کی صحت اچھی ہوتی تھی یا جسے کسی مردانہ کھیلوں میں
مہارت تامہ رہتی تھی لوگ ان کو اچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے یا اب یہ حال ہے کہ
جو شخص بہت زیادہ نازک اور نسوانیت کے انداز کی طرف مائل ہوتا ہے اس کو پسند
کیا جاتا ہے اور اس کے عادات واطوار زبان زد خاص وعام ہو جاتے ہیں۔

یہی ان حضرات کی ورزشیں تھیں جن کی وجہ سے وہ ستر برس کے بوڑھے ہو کر بھی
میلوں پیدل چل سکتے تھے یا اب یہ حال ہے کہ اگر دو گھنٹہ موٹر میں بیٹھتے ہیں تو طبیعت
خراب ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر کو طلب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دور کیوں جائیے
پاس کے رہنے والے انگریزوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ساٹھ ساٹھ سال کے بوڑھے
کرکٹ اور گالف میں وہ کمال اور پھرتی دکھاتے ہیں جو ہمارے ملک کے اکثر نوجوان حضرات
کو میسر نہیں۔ اگر ریاضت جسمانی سے تغافل اور سواریوں پر سواری کی یہی رفتار رہی
بقول شخصے ایک دن ایسا آئے گا کہ انسان صرف گوشت کا لوتھڑا رہ جائے گا اس کے
ہاتھ پیر غائب ہو جائیں گے۔

جب تک اعضاء کو حرکت نہ دی جائے رگوں میں دوران خون نہیں ہوتا اور
اعضاء کی صحت وتندرستی کے لئے دوران خون لابدی ہے۔

ہم اکثر محسوس کرتے ہیں کہ اگر سوتے ہوئے ہمارا ہاتھ جسم کے کسی حصہ کے نیچے
دب جاتا ہے تو دوران خون موقوف ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ بے حس
وحرکت ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر ہم نے اپنے اعضاء کی وقت پر خبر نہ لی تو یقین ہے کہ ہمارے اعضاء
بیکار رہنے کی وجہ سے کیلی بن یا ہمالیہ کے سادھوؤں کے اعضاء کی طرح سکڑ کر بیکار ہو جائینگے

اس قسم کی تعلیم دینے اور لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان لوگوں سے اس پر عمل کروایا جائے جو تہذیب و تمدن کے بانی اور علم بردار اور حضرات اساتذہ ہیں جن کی ہاتھوں میں قوموں کی باگیں ہیں جن کی کیمیا نظری مس خام کو کندن بناتی اور ذرا سی غفلت قوم کو قعر مذلت میں ڈال سکتی ہے۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس باب میں سب سے زیادہ غافل طبقہ مدرسین ہے جنہوں نے غلطی سے مدرسی کے معنی ہنسنا بولنا اور کھیل کود کے ترک کرنے کے سمجھ رکھے ہیں۔

اگر مدرس حضرات خود اس پر عمل نہ کریں گے تو قوم کی حالت قیامت تک درست نہیں ہو سکتی۔ اگر یہی حضرات ریاضت جسمانی سے نفرت کرنے لگیں تو چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی کے مصداق ہم کو طلبار سے کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

اول تو بہت کم مدرس حضرات کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اگر بدقسمتی سے کوئی استاد حصہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو ناسمجھ بچوں کی وہ بچوں میں ایک ڈاڑھیاں اور مہذب حضرات کی "سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئے" کی صدا ہائے دل خراش ان کی ہمت کی بانی پھیرتی ہیں اور وہ بیچارے اپنے ہم مشرب بھائیوں کی سرد مہری کی وجہ سے جلتے بوجھتے خودکشی پر مجبور ہو جا کر ملیریا اور دیگر امراض کے شکار ہو جاتے ہیں۔ معترض حضرات سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آخر کونسی بات ہے جو اساتذہ کے کھیلوں میں حصہ لینے میں وہ بری محسوس کرتے ہیں تو ایسے حضرات صرف یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ استادی کا پیشہ برتر و ارفع ہے ان کو بچے کھیلتے ہوئے دیکھ کر بے ادب و گستاخ ہو جاتے ہیں اور بچوں کے دل میں ان کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔

ایسے حضرات کو یہ معلوم رہے کہ استاد کو طلباء کے لئے نمونہ بننے کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کھیلنا یا کھیل کی ترغیب دلانی دونوں لوازمات تعلیم سے ہیں۔ ر

اساتذہ حضرات کے فرائض میں طلبار کی اخلاقی حالت کی دیکھ بھال بھی شامل ہے جماعت کے حجروں میں صرف ایک گھنٹہ بیٹھ کر کوئی مدرس صاحب یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ تمام طلبار کی نفسیاتی کیفیات سے واقف ہو گئے ہیں اور جس کی وقفیت ضروری ہے اس لئے کہ بدقسمتی سے ہندوستان کے جماعتی کمرے بجائے دل چسپ ہونے کے موذی خانہ بنے رہتے ہیں۔ چونکہ طلبا وجماعت میں اپنے اصلی حالات وخیالات کا اظہار نہیں کر سکتے اس لئے ان کی طبیعتوں کے میلان کا پتہ نہیں چل سکتا اور نہ کوئی استاد صاحب فرداً فرداً ہر طالب علم کے گھر جا کر اس کی گھریلو زندگی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ صرف کھیل کا میدان ہی ایسی جگہ ہے جہاں طلبار کے اصلی جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ طلبار کی طبیعت کے رجحان معلوم کرنے اور ان کے دماغی نقائص اور بیماریوں کے لئے صحیح نسخہ تجویز کرنے کے بہترین مواقع میدان میں میسر آ سکتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ بجائے گستاخی کے ہم نے دیکھا ہے کہ جو یگانگت اور انس لوگوں میں کھیل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے وہ بہ نسبت دوسری ملاقاتوں کے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ اکثر مدرسین کو یہ شکایت رہتی ہے کہ طلبا و کند ذہن ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ وہ اتنی کثرت سے بیمار رہتے ہیں کہ ان کو تعلیم دینے میں بیحد دقت واقع ہوتی ہے اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ اساتذہ حضرات پہلے اپنی جسمانی حالت کو درست کر لیں تو لڑکے جن میں نقل کا مادہ بہت زیادہ ہے خود بخود اساتذہ حضرات کی پیروی کریں گے۔ جب خود ہمارا یہ حال ہو کہ ہم قحط زدہ دکھائی دیتے ہوں تو ہم طلبار سے اور کیا امید رکھ سکتے ہیں جن کی خمیر میں نقل کا مادہ ہے اور جو اساتذہ حضرات کو اوتار اور مکمل نمونہ سمجھ کر ان کی نقل اتارتے ہوں۔

جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ کھیلنے سے اوچھا پن ظاہر ہوتا ہے وہ یورپ کے ممالک پر نظر ڈال کر اپنے خیالات کی تصحیح کر سکتے ہیں جہاں کے تعلیمی حالات اور اصول کی پیروی

ہم کئے جارہے ہیں۔

چنانچہ امریکہ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے اساتذہ کی ٹیم اسی کالج کے طلبار کی ٹیم کو مسلسل تین سال تک ہراتی رہی۔

جو حضرات اپنے آپ کو مافوق الانسان سمجھتے ہیں اور کھیلوں کو چونکہ اس میں رذیل بھی حصہ لیتے ہیں معیوب سمجھتے ہیں اگر اپنی حالت پر غور کریں تو پتہ چلیگا کہ فطرت کی بہت سی عطیہ چیزیں ان میں اور دیگر حضرات میں عام ہیں

اگر کوئی نیچے طبقہ والا شخص اعلیٰ قسم کا کھانا کھائے تو کیا ہم اس کو ترک کردیں یا کسی نیچے طبقہ والے شخص کی ناک کو دیکھکر ہم اس سے برتر و ممیز ہونے کی خاطر ایک اور ناک کا اضافہ کریں یا سرے سے ناک ہی کٹوادیں۔ انسان کے اپنے افعال اور اسکی شخصیت ہوتی ہے جو اس کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل یا باعزت کرتی ہے۔

اس سال مسٹر محمد ہادی ناظم ورزش جسمانی نے خاص طور پر طلبار کے اسپورٹس کے ساتھ اساتذہ کے لئے بھی دو مقابلہ رکھے تھے۔ ان مقابلوں میں ایک یورپ نژاد پادری صاحب اور دو یورپ کے تعلیم یافتہ حضرات خود شریک تھے۔ بچوں نے اور دوسرے تعلیم یافتہ حضرات نے اساتذہ کی اس شرکت کو نہایت اچھی نظروں سے دیکھا اور عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض پروفیسروں نے بھی اس میں آیندہ شرکت کا ارادہ کیا

ہمیں مسٹر سید محمد ہادی سے قوی اُمید ہے کہ وہ نہ صرف اساتذہ کی بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ قوم کی گری ہوئی حالت پر رحم فرماکر اس سال کی طرح آیندہ سال بھی نہ صرف اساتذہ کے مقابلے رکھینگے بلکہ ایک ایسی انجمن بھی قائم کرینگے جس میں بلدہ کے اساتذہ حضرات شریک رہیں اور کھیلوں کی مشق کرکے طلبار کے دوش بدوش اپنی علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائیں اور جنہیں دیکھ کر طلبار کے مردہ اجسام میں جو آیندہ چل کر قوم کا بار اپنے کندھوں پر لینے والے ہیں

نئی روح حلول کرے۔ اگر اس وقت ان کی خبر نہ لی گئی تو
مبادا ارہ عافیت پھر نہ پائیں
کہیں بے پناہ آنے والی بلائیں

متفرقات

مولوی سید محمد حسین صاحب بی اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات اور مولوی سید علی اکبر صاحب بی اے (کینٹ) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و اطراف بلدہ جو لندن کی امپیریل کانفرنس میں حیدر آباد دکن کی نیابت کرینگے ۲۲ ماہ مئی ۱۹۲۷ء م ۱۶ اردیبہشت ۱۳۳۶ف کو حیدر آباد سے عازم انگلستان ہوئے۔ ان ہر دو حضرات کو رخصت کرنے کے لئے بہت سے عہدہ داران تعلیمات و دیگر محکمہ جات اسٹیشن پر موجود تھے۔ صاحبان موصوف کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور رخصت کیا گیا۔ انکی روانگی کے چند روز قبل مولوی عبد الرحمن خانصاحب بی۔ یس۔ سی (لندن) پرنسپال عثمانیہ یونیورسٹی کالج کو لندن کی صد سالہ جوبلی میں حصہ لینے کی خاطر بھیجا گیا ہے۔

ضلع نلگنڈہ کے اساتذہ کی کانفرنس کے انعقاد کی اطلاع تو پروگرام کے ذریعہ مل چکی تھی اور خیال تھا کہ کانفرنس کی مکمل روئداد اور خطبہ صدارت وصول ہونے پر مکمل تفصیل درج رسالہ کیجائیگی۔ لیکن اب تک دفتر ہذا میں کوئی خبر وصول نہیں ہوئی۔
خطبہ صدارت کا اقتباس جو اخباروں میں درج ہوتا رہا اور دیگر معلومات جو بہم پہونچیں وہ درج رسالہ کیجاتی ہیں۔
کانفرنس مذکور الفوق کے اجلاس ۱۵-۱۶ اور ۱۷ جون ۱۹۲۷ء م ۹-۱۰-۱۱ امرداد ۱۳۳۶ف ملک سردار علی خاں صاحب بی۔ اے مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ

کے زیر اہتمام اور مولوی عبدالعزیز خاں صاحب بی۔ اے صدر مہتمم تعلیمات سمت میدک کی صدارت میں منعقد ہوئے۔

پروگرام کے دیکھنے سے مسرت ہوتی ہے اس لئے کہ کانفرنس مذکور میں تمام ایسے مضامین پر بحث کیگئی جو اساتذہ حضرات کی عملی زندگی کیلئے مفید اور کارآمد ہیں۔

مولوی عبدالعزیز خاں صاحب بی۔ اے صدر مہتمم تعلیمات سمت میدک نے اپنے خطبۂ صدارت کے شروع میں انعقاد کانفرنس کی ضرورت اور اس کے فوائد پر بحث کی ہے اور صاحب موصوف کی تقریر کا خلاصہ جو خود صاحب موصوف نے اثنائے تقریر میں کیا ہے درج ذیل ہے۔

(۱) مدرسین صاحبان نہ صرف کتابی ذریعہ سے بلکہ حواس خمسہ کو کام میں لاکر مشاہدۂ فطرت سے اپنی معلومات میں آئے دن اضافہ کرتے رہیں۔

(۲) ٹرینگ جاکر فن تعلیم حاصل کریں فنی کتب کے مطالعہ سے معلومات بڑھائیں

(۳) جماعت میں سبق دینے سے قبل سبق کی تیاری کریں اور مختصر نوٹس لکھیں۔

(۴) ٹرینڈ صدر مدرسین صاحبان کا فریضہ ہے کہ ان ٹرینڈ مدرسین کو فن تعلیم سے بذریعۂ لکچرس بہرہ ور کریں

(۵) اپنے اخلاق ایسے رکھیں کہ طلبا ر سوسائٹی اور عوام پر اچھا اثر مترتب ہو۔

اثنائے تقریر میں صاحب موصوف نے صنعتی تعلیم کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

کانفرنس کے زمانہ میں مولوی سید محمدؐ ہادی صاحب ناظم ورزش جسمانی موجود تھے تمام حضرات کے سامنے وہاں کے اسکاوٹس نے مختلف کھیل وکھلائے۔ جس کو تمام لوگوں نے نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے بعد ناظم صاحب ورزش جسمانی نے اسکاوٹس کو بیاجس عطا فرمائے۔ مولوی حیدر علی صاحب ڈرل ماسٹر نلگنڈہ بیحد دلچسپی سے کام کررہے ہیں۔

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مولوی سید محمد ھادی صاحب ناظم ورزش جسمانی و اسکاوٹس نے حیدرآباد کے اسکاوٹس کیلئے فوری امداد مجروحین. جھنڈیوں کے اشارے پلوں کی تعمیر اور پیراکی کے مقابلے مقرر کئے ہیں۔

یہ مقابلے امریکہ کے قواعد پر جاری رہینگے اور جولائی۔ اگسٹ اور سپٹمبر میں ہوتے رہینگے ہر ایک مقابلے کے لئے چاندی کے کپ دئے گئے ہیں جو صرف ایک سال کیلئے ہیں اور پیراکی کیلئے ایک سونے کا تمغا رکھا گیا ہے۔

ملک کی مردہ دلی کا خیال کرتے ہوئے یہ ایک اہم چیز ہے۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ ملک کے ہونہار افراد اس میں شریک ہو کر گوئے سبقت لیجانے کی کوشش کریں گے۔

حیدرآباد کی طرف سے جو حضرات امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس میں حصہ لینے کی غرض سے لندن تشریف لیگئے ہیں۔ ان کی تقاریر اخباروں میں وصول ہو رہی ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کی تشریف آوری کے بعد ہی مفصل حالات شائع کریا

ریاست حیدرآباد کے اکثر امتحانات کے نتائج طوالت کے خوف سے اُردو حصہ میں شائع نہیں کئے گئے۔ انگریزی حصہ میں مجملاً درج کئے گئے ہیں۔

اعلیحضرت حضور نظام دکن نے سر رابندرا ناتھ ٹگور کے مدرسہ وشوا بھارت میں اسلامک کلچر کی تعلیم کے خاطر ایک لاکھ کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔

---

social study, a tool pressed into the service of man to conquer all his obstacles. In method, an attempt should be made to introduce activity in school work, thus giving scope for co-operation. Individual competition should be replaced by group competition. Discipline also should be socialistic. Authoritative discipline is a failure because all attempts to repress the energy of a child are found to fail. The sociological conception of discipline is that true discipline always comes from the carrying out of some activity in which one is interested. The nature of work is that it imposes certain restrictions on the child. The pupil must realise that the success of the school community depends upon him and that a certain code of ethics is demanded of him. Thus, we see that socialistic ideas permeate every aspect of education.

These, in my opinion, are the chief characteristics of the New Teaching. The child has become the centre around which the whole system revolves. Whatever may be the schemes and plans that may evolve in future, it must be borne in mind that there is a unity to be found in them and that they are different aspects of the same process, namely, approaching the problem of education from different points of view, that they all have the same end in view, namely, that of realisation of the powers of the individual, with due regard to the needs of society. No one plan or method can be regarded as the best one, the sole panacea for all evils and it remains for future educationists to evolve a method nearing perfection and approximating to the ideal.

in which the teacher will be able to measure the mental capacities of the child and thus adopt ways and means to achieve the end in view.

So far, I have been dealing with the individual aspect of education in which the attempt is made to individualise instruction. But there is an equally important aspect of education—the social aspect, aiming at 'social efficiency'—which cannot be ignored. This movement is called "Socialisation" and it is a point of view of looking at problems of curriculum, method and discipline. Individual movements are not independent of and isolated from socialistic movements but are part of the same process and are interrelated. Socialistic methods of work have a place in individualistic movements and all individualistic plans imply socialisation as e. g., the Dalton Plan. Socialisation is too vast a topic to be treated here in detail and I give only its main features here. It is an attempt to break down the barriers between the school and the world, to affiliate the work of the school to life and to bring the school into direct contact with the realities of life, so that the transition from the school to real life may not be very abrupt and disastrous. It attempts to make the pupils realise that the school is a little 'Commonwealth', that all are members of a 'Body Politic' governed by certain laws and entrusted with certain duties and responsibilities and that all the subjects taught have a useful bearing on their present life and needs. On the side of the curriculum the teacher aims at bringing the subjects of study into direct contact with the life of the child. All subjects have to be related and kept in subordination to life. History should be treated not as a mass of dry facts but as a means of gaining an insight into the social life of the Present and the Past. Geography is the study of the life of man as influenced by natural forces. Science should be looked upon as a

account. It is better to have a sort of skeleton text-book with blank pages for pupils' notes; this supplies the bones and it is the business of the teacher to supply flesh and blood. Books still hold an important place but it is recognised that books must not be the only means of coming into contact with the world and its truths. Pupils should observe and think for themselves and then they should bring this knowledge and observation to bear upon the study of books. Books should supplement, correct and illumine what they have already learnt in life. Books also differ with the method of teaching followed. For example, the Dalton Plan requires sets of text-books so written as to facilitate dividing of the subject into a number of assignments and we see that even here the child's point of view is predominant.

Another important feature of the New Teaching is the dissatisfaction with the present methods of estimating the results of teaching. Examinations had hitherto formed the only means of judging the results of a teacher's work. But they no longer satisfy us. They give little scope for the expression of individuality and initiative and lay greater stress on industry than on intelligence. They tend to be regarded as an end in themselves rather than as a means. Hence attempts are made to obtain a more objective standard for testing the mental capabilities of a child. Prof. Binet has done a great service to education by putting forward his Intelligence Tests. He succeeded in establishing a working standard of comparison. He evolved a metrical scale of tests by which intelligence can be measured. Binet's tests were all individual but in America group tests have been organised. Again, we have objective scales of ability in Arithmetic, Hand writing, Reading and Spelling. It is true these tests are still in the tentative stage and nothing definite can be said about their future. Yet we are approaching a position

dual instruction, claim to have sounded the death knell of class teaching. But the class has its many advantages of social and community life and cannot be abolished altogether. The only solution seems to be to reduce the number of pupils in a class so as to ensure the advantages of individual instruction and eliminate the evils of the group system. Dr. Montessori claims that a 'Montessori teacher,' with the help of an attendant to look after the physical needs of children, can carry on satisfactorily the work of a group of 45 pupils. The tendency for the future seems to be that the class will be retained as a unit of organisation but not as a unit of teaching. The Dalton Plan has worked out this principle in all its details and it has proved an unqualified success. In future we shall have the class system in the same form as we have it now but there will be an increase in disintegration periods and the difference will be deliberately recognised.

One effect of the changing view is the modification of text-books. There was a time when the text-books completely dominated the situation, the teacher being regarded merely as their exponent. But the New Teaching has deposed the text-book from its position of power. The text-book is considered to be merely an aid not an authority and the teacher is called upon to supply his own material, to do his own teaching and to draw upon his imagination and powers of exposition and illustration. In some places the text-book is entirely eliminated; the pupil has to take notes under guidance. The rule is now laid down that all text-books should be written from the point of view of the child, not that of the teacher or of the subject matter. In other words, the treatment of the subject should be psychological and not logical. Greater regard must be had for the age and mental equipment of the child than for the logical order of treatment. Now, text-books do all they can to help the pupil on his own

child, this sugar-coating, or, as they would call it, "the primrose path" or "soft pedagogy." They argue that such a teaching does not prepare the child for the hard struggle of life. But the attitude of the New Teaching is that the child regards everything from his view point, that he is highly 'egocentric.' His personality has to be respected and the teacher can affect his pupils only when he respects their inner nature. He can command only by obeying the laws of the child's nature and when he seeks to interest his pupils, he is searching for the best way of appealing to the laws of their nature. Hence, the pupil should be allowed to choose subjects that appeal to him most. The duty of a teacher is now recognised to be the creation in the child of many-sided interests which would enrich his personality and develop his individuality. The New Teaching does not eliminate drudgery but its aim is to give a meaning to the whole of school learning. It does not seek to get rid of drudgery but to make it tolerable by giving it a meaning.

One result of the demand for respecting the child's individuality is that the problem of individual attention has become very prominent and the New Teaching has to adopt a new attitude towards the class system. The reformers claim that the child should be regarded as an end in himself and the present mass system of education does not fulfil this end. Has the class system succeeded in enabling the child to give expression to its unique powers and in promoting his originality and initiative or is it only an economic device and a necessary evil which has to be tolerated? The reformers are loud in their denunciation of the class system. The modern tendency is in favour of reducing the number of boys in a class. How are the claims of individualism to be reconciled with those of collectivism? This is the burning question of the day. The Montessorians, with their elaborate system of indivi-

He regards play as preparation for life. Play, for children, possesses as great an importance as activity for man and serves as the only vehicle for his self-assertion. The child is an amateur who does a thing for the love of it and not for any benefit. Hence, in the case of smaller children all activity is to be given the complexion of play. Then alone we can enlist all his resources into the service of education. All activity of the child partakes of the nature of play and hence play is the only method of active learning for the child. Open air schools, school journeys, nature-study in fields and gardening work at school have all been organised in the spirit of play. Scouting is carried out entirely on the lines of the Playway. Boy Scout and Girl Guide movements afford a very good example of the modern principle of 'learning by doing.' Scouting forms an admirable training for cultivating social virtues and enabling youngsters to get a clear and practical acquaintance with the duties and responsibilities of citizenship.

A discussion of play with its characteristic elements of joy and spontaniety, at once raises the question of interest. Modern pedagogy holds that all teaching should be based on the principle of interest. The old idea of learning certain subjects *e. g*, Latin, for the sake of the mental discipline they afford, has been abandoned. Psychology has shown conclusively that a child can be benefited by a study of only those subjects in which he is by nature interested, with which he has identified himself and for which his natural capacities fit him. The duty of the teacher then is to create interest in his subject, *i. e*, to establish points of contact between the capacities of the child and the end which he has in view. The teacher's work consists in making the pupils accept his aim as their own and this is the creation of interest. Men of old school object to this clearing of difficulties from the path of the

education is to take hold of these activities and give them direction. These activities meet the child's need for action and for expression, its desire to do something, to be constructive and creative. They keep the balance between the social and the individual sides of a child's nature. Thus the school may be connected with life so that the experience gained by the child in its everyday life is carried over and made use of in school, and what the child learns in school is carried back and applied to everyday life. At presents pupil are trained in an atmosphere where conditions of social life are wanting. But, if occupations are made the articulating centres of social life there will be a change in motive and spirit. "The change is from passive recipiency to buoyant outgoing energy." (Dewey). By introducing occupations the entire spirit of the school is renewed. It has a chance to affiliate itself with life. If these are introduced in schools, the school becomes a miniature community reproducing all the conditions of social life, active with types of occupations that reflect the life of the larger society and permeated throughout with the spirit of Art, Science and History. Thus, the child is prepared for the life outside.

Another interesting application of this principle is to be found in the increasing importance now attached to play. Play is no longer regarded as a recreation, relief from work or the discharge of surplus energy but as a distinct method of teaching, in fact, the most important method in the case of young pupils. Play, the New Teaching holds, is the mental attitude in which the child approaches every object. Hence, it is asserted that all teaching should be through play, if it is to bear any good fruit. Mr. Caldwell Cook, in his monumental book, 'The Playway,' has shown how play can become the sole method of educating children. The Playway introduces a joyous element into the unpleasant region of hard work.

Montessori Method also the child's activity is called into play. The Gary Scheme deliberately builds the school round the requirements of the child. Thus, all the new experiments furnish exemplifications of the principle of 'learning by doing.'

This principle has also exercised a profound influence on the methods of teaching the various subjects of the school curriculum. In languages the old Translation Method, in which a foreign language was taught through the medium of the vernacular, is done away with and is replaced by the Direct Method in which the child learns the language in the most natural manner, *i. e*, as he learns his mother tongue. In Science the Heuristic Method sets the pupil on the path of discovery and exploration by enabling him to discover natural laws for himself. In History an attempt is made to teach pupils to sift historical truth by a careful examination of the historical documents and authorities that form the chief sources of History. In Geography the pupils are brought into direct contact with the phenomena of nature and are taught to observe things for themselves and to draw their own conclusions. Thus, self-activity of the pupil has come to be regarded as the basis of all the new methods.

Besides regarding 'learning by doing' as the principle to be followed in teaching all subjects, the New Teaching holds that creative and constructive activity should form an independent subject of school curriculum. Its strongest advocate is the famous American writer, Dewey who says that handwork, even weaving and cooking, should be introduced as separate subjects in schools. The tendency now is to introduce in school, manual training, shop work and household arts such as serving and cooking. The child delights in all kinds of activities and the problem of

is organised on the basis of the selfactiviy of the pupil. But in India the system of the teacher 'telling' and the pupils listening passively, still holds sway. There is a great need for making the pupils active participants in the life and work of the school. Under the present system the pupils become mere automatons with no powers of originality and initiative and utterly lacking in the power of adjusting themselves to changing circumstances. In our schools all educational apparatus is made for listening. It marks the depending of one mind upon another. In no school, activity on the part of pupils precedes the giving of information by the teacher. The ear alone constitutes the medium of appeal. Hence, the old system of education was characterised by its passivity of attitude, its mechanical massing of children, and its uniformity of method and curriculum. But the New Teaching holds that the school should be a social institution, an embryonic community in which the conditions of community life are reproduced and which is brought into direct and useful contact with the world outside. The pupils should be regarded as members of a community, each playing his part and working out his salvation under the guidance of the teachers. The pupil should learn by doing. As Dewey has well remarked, "learning, but primarily living, and learning through and in relation to this living, is the principle" of the New Teaching. The principle of 'learning by doing' lies at the bottom of almost all the new experiments such as the Dalton Plan, the Playway, the Project Method and so on. The Dalton Plan aims at giving the child freedom, making the school a community where the mutual interaction of groups is possible and it approaches the whole problem from the pupil's point of view. The Project Method attempts to educate the child by means of a number of projects or problems which the child has to handle with all the resources at his command. In the

child has now become the centre of interest. Emphasis has shifted from subject matter to the child. Since the days of Rousseau there has been an ever-increasing outcry against the child being treated as a miniature adult. Greater respect is now-a-days paid to the characteristic demands of children. The personality of the child is now regarded as the most important factor in the educative process and knowledge of the subject matter of text books is not considered so essential for a teacher as knowledge of child nature and of the laws that govern all mental operations. Subject matter should be approached from the point of view of the pupil, not of the teacher. Even now a high premium is set upon a thorough knowledge of subject matter but this regard for knowledge is balanced by a respect for the means of presenting it. The old idea that the child is a being capable of taking in and assimilating all that the teacher can impart, has long been exploded and it is recognised now that in presenting new matter to the child, due regard must be had for the age, needs and mental content of the child. Thus we see that the child has now become the master of the situation and this has worked a revolution as great as the discovery of Copernicus, in all branches of education. "The child is the starting point, the centre and the end. His development and growth is the ideal. It furnishes the standard. To the growth of the child all studies are subservient. (Dewey).

Since the child is regarded as the all-important factor in education the idea has gained ground that the responsibility for his education should be thrown on him, the teacher stepping aside from his high pedestal of a dictator and acting only as a guide, no longer leading the child by the nose. All reformers are now agreed that the true aim of education can never be realised unless the whole system

life. Even in this age of reform, the advocates of the New Teaching are divided in their opinion as regards the true aim, but the concensus of opinion seems to be in favour of two aims, namely, 'development of individuality' so ably advocated by Dr. Nunn and 'social efficiency' which receives its strongest support from such writers as Dewey, Bagley etc. Dr. Nunn holds that all educational effort should be directed to the providing, for every individual, of the conditions under which his individuality is best developed, to the enabling of the individual to make his own original and useful contribution to the world, without at the same time, transgressing the ethical bounds set by society. On the other hand, Dewey is of opinion that education should aim at making the individual socially efficient, and industrially competent to pull his weight in society and at enabling him to understand all duties and responsibilities that attach to his position as a citizen. All activity is corporate and an individual can develop only in a social context. There is nothing contradictory in these views but each supplements and completes the other. Does the present system of education foster the growth of individuality or does it help to make the individual socially and economically efficient? Judged from this point of view, the present system has failed miserably. Therefore the New Teaching tries to find out ways and means for realising this aim, for providing the individual with opportunities for self-expression in an atmosphere of freedom, in order, thereby, to make him an efficient citizen and a useful individual. The originators of almost all new experiments, Mrs. Pankhurst, Miss Maria Montessori, Caldwell Cook etc have all started with this fundamental principle and each has, in her or his own characteristic manner, tried to solve the problem.

The most striking difference between the old and the new methods of teaching is to be seen in the fact that the

The New Teaching.

BY

MIR ZAINULABIDIN, B. A., B. T.,

Assistant, Dar-ul-Uloom High School.

No one will deny that we are passing through a critical period in the history of educational theory and practice. Every now and then we come across such phrases as "New Education" and "The New Teaching," and we hear of new and diverse educational methods and experiments such as the Dalton Plan, the Gary scheme etc. Do all these varied and multifarious experiments mark a distinct advance in educational method or are they merely the result of a craving for something fresh and new or are they the product of fertile brains possessing originality and initiative? Is there any unity in the midst of this diversity, any common principle which runs through all these theories or are they based on different principles which are opposed to one another and pull crossways, thus giving rise to complete chaos and setting aside all law, order and uniformity? What are the aims which the advocates of 'The New Teaching' have in view? In the following pages an attempt will be made to show whether there is anything really new in the 'New Teaching' which warrants the use of the name and what the fundamental principles are which underly all these attempts at educational reform.

Educational methods are generally determined by the aims of education which we have in view. The aim of education has changed from time to time and from age to age in accordance with changes in thought and in ideals of

that child by direct encouragement and stimulus. We shall now consider some of these possibilities. Constructive instinct is innate; the baby plays with bricks, building, destroying and rebuilding. It is the inborn love of construction that makes it do so. In this potentiality we find the sources of all the handicraft recreations of the grown-up child. The collecting instinct is also immensely strong. The contents of a school-boy's pockets are a sufficient testimony to this fact. This zeal with which some people collect certain kinds of things can be traced back to the crude beginnings when they, as children were pickers-up of unconsidered trifles. Children love also to be taken out on Nature Rambles and they long to be free on sands and under trees and bushes. So long as the destructive instinct in children is kept under proper control there are excellent opportunities for a teacher, of inculcating in his pupils love of Nature.

It is thus the function of Education to find out the dominant interest of a pupil and nourish and direct it with care. It is the duty of a teacher to take good care that children enter upon their life's work alert and fully equipped to utilise their leisure in a good and profitable manner.

Education in Leisure.

BY

V. R. MANVIKER B. A.

Education has regard not only to the trinity of soul, mind and body but it is also very particularly concerned with that other trinity which we know as life, livelihood and leisure. Bearing this in mind an educationist should order the training of his pupils in such a way that, when their education is over they will fit into the complex of life. This consists partly in training children to utilize their leisure in a useful manner.

The way in which one spends one's leisure tests the value of our educational efforts. Present-day students have considerable leisure, and it is of the utmost importance that they should learn how to use that time wisely and usefully. Too often the tragedy of leisure is its idleness, its impotence and its inability to find interests that are good and useful. The student has not earned his leisure in order that it may be frittered away in things unprofitable or in things pernicious and ignoble. To the healthy-minded, idleness is debasing, more wearying than work. Education, then, must ensure that every boy and girl shall leave school possessed of at least one healthy interest. The possession of such a passion is a pearl of great price, for it is its nature to so overflow all other capacities by the very energy of its volition and its exuberance that it gives a dominant tone to the mind. What leisure needs is hobbies or 'passions,' because these are the mainsprings of life.

It is the duty of a school teacher to find out the interests of each child and to develop out of them hobbies for

the literary accomplishments of ladies. Among domestic arts were tailoring and making bows, sticks etc. with threads, ornamental cookery and preparation of beverages and such other things as were mentioned under culinary arts for ladies. Ladies of 1st. Century B. C. were also acquainted with arts relating to toilet, dress and luxuries. They also knew recreative arts such as making fountains, playing tricks, dice-playing, etc., arts like setting jewels, decorating houses etc., fine arts such as music and drawing and physical arts like juvenile sports.

The scholar has an office to perform in society. What is it? To arouse the intellect, to keep it erect and sound: to keep admiration in the hearts of the people: to keep the eye open upon its spiritual aims. How shall he render the service? By being a soul among those things with which he deals. (Emerson).

---

the art of knowing cries of animals and birds, guessing, divining others' thoughts, explaining dreams and so on

It is true that, to some extent, education of lower castes was neglected in early times; but, after a time, even the lower castes were taught to read and write. Sanskrit extended, however, beyond the Brahmins, the Kshatriyas and the Vaisyas by 140 B. C. We read in Patanjali of a head groom discussing with a grammarian the etymology of the word 'Suta' (charioteer).

Lastly, it is a grave mistake to suppose that sufficient attention was not paid to female education in ancient India. There is ample evidence to show that female education was encouraged in homes. There were highly accomplished daughters of kings and ministers who were not only well-versed in Sastras but were also blessed with the poetic gift. It is highly interesting to note that Sanskrit literature claims a number of writers from the fair sex. In Vedic times there were such highly cultured ladies as Gargi, Vachaknavi, Badaba, Prathiteyi and others whom Asvalayana mentions to Sumantu, Vaisampayana and other venerable Rishis of old. In the post-Vedic period we come across such celebrated women of deep learning as Avanti-Sundari, Tirumalambika, Ramabhadramba Mathuravani, and Gangadevi.

The list of 64 arts found in Vatsyayana's 'Kamasutras' gives us an idea of the accomplishments cosidered appropriate for young ladies of the 1st. Century B. C. According to the Sutras we understand that elocution, exercise in poetry, filling up of stanzas of which a portion is given, guessing unseen letters and things held in a closed fist, use of secret language, knowledge of different languages, and solution of riddles and of verbal puzzles were some of

monastic life and the curriculum of which excluded all secular subjects, rose to eminence under Siladitya's patronage. It attracted students even from China, Tibet, Central Asia, Bokhara and Korea, and gave them boarding, lodging and instruction free.

The college which was situtated centrally was surrounded by eight halls. Beyond these halls were courts for priests to live in. Its observatories stood within its premises. 'Ratnaranjaka', one of the grandest buildings of the college, contained the largest library of those days.

Its curriculum included the Vedas, the Buddhist canonical books, Grammar, Logic, Medicine, Philosophy, Metaphysics, and various other subjects. The brilliant achievement of the Nalanda University was, however, in Logic. There was a separate professor for each subject. Eminent intellectual ability, old age and nobility of character were the requisites of a professor. As in modern colleges, a student could specialise in one or more subjects. But it was necessary that every student should possess a general knowledge of all the principal subjects. After Siladitya's death the University declined although it continued to be in existence till the 9th. Century A. D.

SUBJECTS STUDIED BY THE ANCIENTS.

Among the subjects studied by the ancient Hindus may be mentioned the Samhitas, the Brahmanas, the Upanishads, the Sutras, Epic Poetry, Ethics, Didactic Poetry, Philology, Grammar, Lexicography, Metre, Politics, Rhetoric, Philosophy including Logic, History, Geography, Astronomy, Geometry, Algebra, Trigonometry Calculus, Medicine, Art of War, Music, formative and technical arts, works on Law, Custom and Religion. Besides, in the time of Buddha, people cultivated Surgery,

DISCIPLINE.

It was reverence for the teacher more than anything else that kept the students in their proper limits. The preceptor maintained discipline with mild and sweet words but when punishment was unavoidable, he could punish his students with either a thin rope or the tender twig of a bamboo. A teacher going beyond his limits in awarding punishment to his pupils was liable to be punished by the King.

UNIVERSITIES IN ANCIENT INDIA.

For a very long time, the centre of learning was North-Western India. Kashmir and Badarikasrama were famous for long as having controlled it. By the 6th. Century B. C., Takshasila (Taxila) became the chief seat of learning. It was a University town to which students of all the upper classes, chiefs, and Brahmins and merchants flocked in large numbers. In the various schools of that place provision was made for the teaching of the 64 Arts special encouragement being given to Painting and Sculpture. The University was known specially for its brilliant achievements in Medicine which was taught by a distinguished professor named Atreya. A special professor used to preside over each of these schools. Taxila maintained its reputation even till the days of Asoka.

During Siddha Nagarjuna's time the Buddhists controlled the seats of learning. Spiritual training was given publicly in 'Viharas' under the shade of trees.

The cradle of learning shifted next to Sree Dhanyakataka. Its modern name is Amaravati. This contained a University with six colleges.

The history of the Universities of ancient India will not be complete without an account of the most famous of them, the Nalanda University which was situtated in the great 'Vihara' of Nalanda. This monastic University which admitted only such students as were leading

The 'Rigvedic Pratisakhyas'[1] as well as 'the Rules of Gautama" give us an idea of the method of instruction in the schools of ancient India. The student was required, every day, to touch his Guru's feet, address him saying, "O Sir, teach me," touch his own vital airs with the ends of 'Kusa,'[2] perform three 'pranayamas'[3] each lasting for fifteen minutes, take his seat on Kusa grass with his Guru's permission, repeat five 'Vyahritis'[4] sastraically and begin and end his study with 'Om.'[5] This is what is known as 'Gurupasadanavidhi' (method of approaching the preceptor for receiving instruction).

While teaching the Vedas the preceptor recited the 'mantras' once and they were repeated by the student twice. This process went on for about a week by which time the pupil committed them all to memory with proper pronunciation and accent. The 'Guru' explained afterwards the meaning of the 'Mantras.' Study, according to Patanjali[6] could become perfect in three ways, learning for one's own benefit, teaching others, and practising in life what one learns.

As for Sastras the pupils went to the 'Guru' thoroughly prepared with the lesson of the day and only to clear their doubts with the help of their teacher. The students could also consult books in libraries which consisted generally of books of palmyra leaves. The term for study commenced with the rainy season and ended, as in modern days, with the coming of summer. The students had also certain holidays which they could utilise in revising their old lessons.

---

1 Rules for the right interpretation of the Vedas.
2 A kind of reed used for sacred purposes.
3 Controlling of breath.
4 Expiations.
5 The sacred mystic symbol of the Hindus.
6 The famous author of the 'Yoga Sutras' and a great metaphysician.

women and bitter words. Through such strict observances the 'Brahmacharin' could cultivate fortitude and self-control.

Moreover, the student's conduct towards his 'guru' is another noteworthy point. It was one of obedience reverence, devotion and assiduity. The student had always to do what was good and agreeable to his 'guru.' He was strictly forbidden to answer his preceptor remaining in his seat or bed, to sit or sleep in a place higher than his 'guru,' to go before him and answer him carelessly and from a distance. The pupil had to follow his 'guru' wherever the latter went. Such constant attendance on his preceptor and doing everything which contributed to his happiness taught the ancient Hindu student self-denial, patience and loyalty to his teacher. These are rarely found in our modern boys.

The course prescribed for a 'Brahmacharin,' speaks of the excellence and decisive superiority of the ancient Hindu educational system. In the 'Gurukula' the student received a thorough and practical training in the performance of sacrifices and all other duties connected with them. Secondly, the preceptor took great care to train the Will of his pupil and to teach him how to perform sacrifices and control his Self. Another peculiar merit of ancient Hindu education was that the preceptor reduced to practice all the precepts taught by him, by "authenticating and illustrating," in his own life, the precepts advocated in the sacred writings. The preceptor thus held up before his disciple a living model which the latter could imitate consciously or unconsciously through constant association with his teacher. Though greatly emphasised, this object is not always achieved in the present system of education. Thus, in ancient times the teacher's personality exerted a far-reaching influence on his pupil, moulded his mind and character properly and made him strong physically, intellectually and morally to a remarkable degree.

At first they were conducted by three Brahmins. But their number seemed to increase in course of time, so that a 'Parishad' was later on to consist necessarily of 22 Brahmins deeply versed in Philosophy, Theology and Law. They were situated far from the fret and fever of busy town life. The head of a 'Parishad' was known as 'Kulapati.'

Hundreds of students found admission into these 'Parishads' and were given education, board and lodging free. Generous kings and wealthy philanthropists maintained these institutions.

ORGANISATION.

The Hindu boy in ancient India could enjoy perfect liberty till he became five years old. Even after that no study was begun for him in a systematic way until his 'initiation' took place. The initiation ceremony marked a new chapter in the life of the ancient Hindu boy. A Brahmin boy was to be initiated in his eighth year, a Kshatriya boy in his second year and a Vaisya boy in his twelfth year. Soon after this initiation ceremony the boy was sent to his spiritual or Diksha guru. His life in the house of his preceptor was one of discipline. During his stay in his 'Gurukula,' a 'Brahmacharin,' as he was called, had to get up early, take his bath and perform his 'Sandhyavandanam'[1] and 'Samidhoma'[2] every day. He was required to "control his speech, arms and stomach." Such observances developed in the student religiousness, truthfulness and self-restraint. He was forbidden to use scents, flowers, and ointments, to sleep during daytime, to drive in a carriage, to sing, to sit crossing his legs, to play and to gamble. He had to avoid excessive joy, censure, desire for wealth, contact with

---

[1] Prayers. Fire-worship.

ORIGIN AND DEVELOPMENT OF SECONDARY SCHOOLS AND COLLEGES.

The earliest times were marked by the absence of schools to impart secondary education. Every 'Rishi' who happened to be the head of a family performed sacrifices, composed sacred hymns and taught these to his sons. The sacred hymns were thus handed down orally from father to son. But, in course of time, as the religious ceremonies became numerous and complex, people failed to have a thorough grasp of the right meaning of the hymns. So with a view to define and establish their meaning, certain sages well-versed in the Vedas and their 'Angas'[1] gathered around them earnest pupils even from distant places and taught them the hymns and their proper meanings. Some other centres of instruction were established by such learned Brahmins as retired into forest in the afternoon of their life. Besides these institutions higher schools for instruction in religion and religious practices were started and maintained by the educated Kings in Videhas, Kasis, the Kurus and the Panchalas.

The curriculum in these schools comprised not only spiritual but also secular subjects. There were two teachers *viz.*, Diksha guru and Siksha guru. The one initiated the pupil into the secrets of religion while the other taught all the secular subjects. Side by side with these Vedic schools there grew up special schools of science which were soon supplemented by what are called Special Law Schools in which students received a thorough training in the different duties of men.

Among the most important seats of learning are to be mentioned the 'Parishads' or Brahmanic colleges which corresponded to the Residential Universities of Europe.

---

[1] Sciences such as grammar etc., with the help of which the Vedas can be rightly interpreted.

self-sacrifice, reduction to practice, by the preceptor, of the precepts taught, industry and temperance—these are some of the most important general characteristics of ancient Hindu education. The system was so thorough and so excellent that the student was made fit for "a practical, successful, efficient, useful and happy life".

ELEMENTARY EDUCATION.

Primary schools of the modern type were not probably in existence in olden times. But what we are able to gather from 'Lalitavistara' is that elementary schools existed in the time of Buddha. Such schools were generally held under trees in open air or in the verandah of the house of the village teacher when it was raining. Here the students learnt how to read and write and work arithmetic. A rudimentary knowledge of history and geography and of letter-writing was also given to them. Over and above all these the village teacher took the greatest care to impart moral and religious instruction to his pupils by making every one of them commit to memory verses from 'Satakas',[1] 'Nitisaras'[1] and small books of a devotional character. Such attention given to boys, even while they were young, for development of morality and religion stood them in good stead when they grew up to be men. The village school teacher closed his school on certain days on which he was forbidden by 'Sastra,' to teach new lessons to his students. He used to support himself with what was conjointly subscribed towards his expenses by those villagers whose sons and daughters happened to attend his school. He was also encouraged on certain occasions with special presents.

---

[1] Centuries of morals for the use of boys and girls.

Education in Ancient India.

BY

G. LAKSHMI KANTAYYA,

Assistant. Government High School, Chaderghat.

The history of India may be roughly divided into three main periods—Ancient, Medieval and Modern. The Ancient period begins from about 2000 B. C. and extends to about the middle of the 7th. Century A. D. A brief survey of the system of education in Ancient India is of deep interest. We may treat the subject under the following heads, *viz.* general characteristics of Education in ancient India, the different types of Education, organization of schools, methods of Instruction, universities in ancient India and lastly, subjects cultivated by ancient Hindus.

GENERAL CHARACTERISTICS.

Educationists in ancient India, like those in modern times, recognised as important in Education two factors, internal and external; *i. e.* in giving instruction they attached much importance to the taste and innate tendencies of the individual; and were aware of the wonderful effect the child's environment had on its education. That is why the ancient Hindu child was very early sent from home to 'Gurukula' which finds its prototype in the modern Residential Universities. The ancient 'Gurukula' was, at the same time, free from most of the defects and artificialities of modern Boarding schools and Residential Universities. Social efficiency, dominance of moral and spiritual purpose in the school life of the student, training in religious practices and principles, in self-control and

it suits any school without serious disturbance to the existing school organization.

(3) It is far more economical than the Dalton Plan.

(4) It lays great emphasis on written work. Sufficient practice in writing will ensure success in written examinations.

(5) It eliminates the graphical charts etc, which are too mechanical in nature.

(6) It provides a teacher with excellent opportunities to treat each boy individually. The time allocated for individual correction enables him to discover and treat the weak points of his pupils.

(7) The plan respects individuality and avoids the danger of yoking together a swift arab with a slow-footed donkey. The bright, the average, and the dull are all given full facilities to proceed at the rate they are capable of.

(8) The work is always done under high pressure. Hence there is no danger of sub-maximum activity.

In conclusion I wish to add that I have recently tried the Plan in the matriculation class of my school and have found the result very encouraging. I feel sure that the experiment is worth a trial by teachers in other schools also.

---

assignments can be called "Lesson-assignments." Each lesson-assignment should have some time limit. The boys will be required to work at each assignment in the class in the time alloted for it in the time-table. The lesson-arrangements should be complete and should contain full instructions as to the way of working. As soon as a boy finishes his first assignment he should be given the second assignment and so on ; so that nobody should sit idle.

Checking will be done as follows :—

As soon as a boy finishes his lesson-assignment he should submit it to the teacher. The teacher should go through the work carefully. The mistakes should be simply marked, not corrected. He should then give some mark (e. g., A; B; C; etc.) according to the merit of the work and enter the mark in the general marking table against the name of the boy. The paper will then be returned to the boy who will then try to find out his mistakes himself. Failing to do so he should come to the teacher for individual correction at the time mentioned in the time-table. As soon as a boy finishes all the lesson-assignments fixed for his class, he should be examined and then promoted.

SPECIAL FEATURES OF THE PLAN.

The plan as suggested above possesses the following special features that make it easily adaptable to any school without any great changes.

(1) It eliminates the ideal of freedom; thus enabling the plan to suit our present school conditions.

(2) It eliminates the necessity of costly special subject laboratories and specialists. Thus

class as a social unit we do not necessarily require a costly laboratory. It can be done in our present class rooms with equal success, only if the presenting is changed. A teacher can work as efficiently as a specialist only if he cares to prepare his assignments after careful study.

Thirdly we must do away with all the mechanical devices of the Dalton Plan, *viz.*, Check cards, progress graphs etc. Too much of these things tend to make our habits very mechanical. It is, at the same time, very showy. We do not require any such devices to register the progress of a class. A simple marking table suspended in a classroom will be sufficiently encouraging to the students.

Lastly, we must modify the lesson-presenting a little. According to the Dalton Plan oral lesson-presenting is totally discarded. Instead lessons are presented in the form of assignments. A whole year's work is called a contract. A contract is again divided into a number of parts corresponding to each teaching month. These are called assignments. Each assignment is again sub-divided into a number of units corresponding to each working day. The most laudable feature of an assignment is its correctness as regards the working time limit. This system requires the specialist to prepare his whole year's work (Contract and Assignments) beforehand. For a specialist this does not matter much since he is in charge of only one subject. But it would be pretty hard for our teachers who will have to teach generally more than one subject. Consequently the best method for this country will be to prepare separate assignments for separate lessons. Let us take an example. The English text book contains 48 lessons. The English teacher should prepare 48 assignments and present them to the class in serial order. These

whereby the individuality of a boy is not neglected. Our guiding principle should be to respect the individuality of a pupil. We must also bear in mind that method exists for the boy and not *vice versa.*

The most important feature of the Dalton Plan is that it provides specialists with excellent opportunities for individual treatment. In fact the Dalton Plan is a constructive departure from the old system. It is the most successful method which has rightly and properly solved the three great problems of education, *viz.*, Freedom, Economy and Individual treatment. Searching criticism may discover a few weak points in it, but none of them is of vital importance. The plan as a whole is based on a very sound and psychological basis, and can unquestionably be regarded as the most up-to-date improvement in the science of teaching.

But as we have already seen that even the Dalton Plan cannot work well here unless it is modified to suit Indian conditions, we must try to devise our own plan to keep as close to the principles of the Dalton Plan as possible.

RECOMMENDATION.

First of all we must discard the ideal of freedom for reasons already stated; but we must welcome the ideals of Economy and Individual treatment. This will enable us, unlike the Dalton Plan, to introduce our plan in our schools without disturbing their existing organization. It will, at the same time, enable us to minimize class conditions successfully.

Secondly, we must discard ideas of costly laboratories and costly specialists as required in the Dalton Plan. The present economic conditions of our country cannot afford such an additional burden. Moreover, in order to treat a

ment. A perusal of our school time-tables will at once show that a teacher's time as regards each particular subject is so limited that it is impossible for him to attend to each boy individually. Just imagine a teacher teaching a class consisting of 30 or 35 boys, with only 45 minutes at his disposal. Has he any other option than to treat the whole class as one teaching unit? Consequently, he forgets that each boy has a distinct individuality of his own. He forgets that each boy has a peculiar drawback of his own. He hurries through his lesson as quickly as he can and values his success from the average achievement of the class. But the average cannot be reckoned as a true and reliable measure. It is always influenced by the achievement of the majority.

Another defect of the traditional system is that it is very rigid It has got its own beaten track from which it never deviates. It fixes up a certain period of time for each grading. As a result of this no boy can be considered to be eligible for promotion unless the boy attends the full term assigned for it. In other words, the promotions are not flexible. That is, we give no opportunity to a boy of exceptional merit to finish up his course in a short time. The result is that the higher intelligence of a superior boy is not utilized to the fullest extent and the boy thus brought up in an atmosphere of sub-maximum activity, not only loses a considerable part of his keenness, but also finds no outlet for the development of those dormant qualities that can only make their appearance under high pressure. Thus, he feels practically stranded. His achievements can be still higher in the class, but as it is, they are far below the psychological level. The wastage thus caused is indeed unpardonable.

It is binding on every country and every nation to put a stop to such wastage. The first and foremost duty of every Indian educationist should be to adopt some means

Wastage is wastage everywhere—no matter whether it be in India or in America. The Western educationists have long deliberated over this problem and have at last discovered a remedy. Now, the foremost duty of an Indian educationist is firstly to examine whether the Western remedies can be applied to India or not and secondly, to try his utmost to devise some method in which this unequal treatment in a class is minimized and, without being segregated, the dull boys are given the benefit of class work.

Of the various methods devised in the Western countries, the Dalton Plan seems to me to be the best in which this serious problem is rightly and properly tackled. A class, according to this Plan, is not a teaching unit but a social unit. Each member of a class is given full opportunity to proceed according to his own natural rate. Nobody runs the risk of either being hampered in his progress or being forcibly dragged much swifter than his normal rate. Thus, according to this Plan, every boy in a class finds himself fully engaged.

It is perfectly true that as long as we have the conception of a class as a teaching unit, this kind of wastage can never be stopped. Nothing can be more wrong than to treat a class consisting of so many different individuals as one individual. We must therefore accept the latest conception of a class and look upon it in future not as a teaching unit but as a social unit. This conception is not entirely foreign to India. Long ago it was recognised in the Sanskrit Pathsalas and also in the Arabic Makhtabs.

(3)

INDIVIDUAL TREATMENT.

The last important charge against the traditional system is that it makes no provision for individual treat-

(2)

WASTAGE—ECONOMY.

Now I turn to the second most important charge against the traditional system *viz.*, that of wastage.

There is no denying the fact that so long as this kind of class system remains in force, wastage can never be eliminated. According to our present system of classification, a class can never become homogeneous. As far as my experience goes, I have always seen three types of children in classes. They are as follows:—Superior merits, Average merits and the Dull. According to the traditional method, a class is considered as a teaching unit. But how can it be called a unit with diversities like this? Even the most experienced teacher cannot present his lessons in such a way as to benefit all the three types equally. A successful teacher's attention is always directed towards the average, for the simple reason that the average merits form the majority in a class. But what about the minority? A lesson intended for the average boys is naturally too easy for a superior boy and at the same time, too difficult for a dull boy. A lesson like that cannot benefit either of them. The result is that the superior boys, lacking suitable work, generally waste their time and gradually sink down into a kind of submaximum activity. On the other hand, the dull are forcibly dragged faster than their own rate. Their position in the class is very unfortunate. The result is that they must either struggle for breath on the surface, or sink below. The traditional system makes no allowance for them. This causes tremendous wastage. The traditional system benefits the average but neglects the dull. That is not fair.

I hope my readers will excuse me if I say that the, mentalities of these two peoples are just the opposite. The average American mind is fully disciplined whereas the Indian mind is still a chaos. A perfectly disciplined mind can rightly claim freedom, because it feels the necessity for relaxation. In India we need discipline first and discipline and freedom being contradictory terms, we cannot advocate the ideal of freedom for India just at present.

The Govt. Training College at Dacca was the first institution in India, to tackle this question, not theoretically but in practice. Experiments carried on by that college for the last three years, have revealed that the ideal of freedom cannot work here as effectively as in America. In fact, the Dalton Plan was introduced in the higher classes of the Armanitolla High School which is under the direct supervision of the Dacca Training College, but it was soon found that the system could not work well unless some essential modifications were made The attempt also revealed that schools in India have a distinct Indian character and that the admixture of the Western ideal of freedom *in toto* cannot work here well. The Training College authorities have accordingly brought about certain important modifications, and the school is now running on the lines of, what Mr. Collins the Headmaster calls "The Kutcha Dalton Plan."

How far this modified form of the Dalton Plan will prove effective, we cannot say just at present. It is still in an experimental stage, and we shall have to wait for a decade before any opinion can be given. But it has indirectly proved one important thing—that Indian conditions require the method to be modified even though our ideal too should be that of freedom.

but that these two terms are contradictory to each other. Unrestrained freedom must not be the ideal in education. Therefore, according to them, complete abolition of restrictions over children at school is not only undesirable but is also very harmful. But, on the other hand, they maintain that the regulations must not be of such a nature as to inhibit the free activity of children and thereby undermine the development of those dormant qualities that are essential for self-determination.

The ideal of restrained freedom sounds like a paradox; but it is not open to much objection as it proposes to lay down only a few broad and general lines of conduct, within which the activities of children are free and lively. In a word, the ideal of restrained freedom is something like the freedom of birds in an aviary or that of deer in a Zoological park.

America, though not the birthplace of this new cult, is the first and the most forward country to accept its mandates. The demand for freedom has become so universal there, that the majority of schools have to bid goodbye to the old traditional system of class teaching. Various systems are, accordingly, evolved to suit the new ideals and special schools are established to conduct experiments. The Dalton Plan and similar other systems which are based on the principles of freedom, economy, and self-determination, are undoubtedly the best in which ordinary class conditions are successfully minimized. The success these systems have already achieved, goes to show that the ideal of freedom has suited the American conditions wonderfully.

But will it not be a fallacy to say that, because such a method has suited America, it will also suit India? Is there not any difference between the American and the Indian mentality?

est defect of the traditional system, it is argued, is that it ignores the ideal of freedom.

The extreme advocates of this ideal preach that absolute freedom should be given to children in schools. Their argument is based on the dogma that "freedom is the birthright of every human being". Therefore, they assert that schools have no right to curb the freedom of children by imposing restrictions whereby the healthy development of character is impaired. They maintain that a healthy development of character is only possible in an atmosphere of ideal freedom. Therefore, perfect freedom should be given to children in schools. They should in no way be handicapped by any rule or restriction.

But this is an extremist view. No teacher can tolerate this. To tell the children that they are quite free and that they can do anything they like in schools before the very nose of their teachers will upset even many freedom-loving teachers. Further, is it possible for an unripe, unsettled mind, in which the critical ability is yet unborn, to distinguish between right and wrong, when the guiding hand of the teacher is absent?

Again, is freedom man's birthright? When is he free? Is not his very existence governed by the unseen laws of Nature? Is not his whole life, both pre-natal and post-natal, regulated by that potent force which we call environment? Even the very expansion of his self is not possible if there is no resistance.

The moderate supporters of this ideal have tried to effect a compromise by modifying the sense of the term at some length. Freedom, they argue, is not license;

A brief perusal of the above points will at once enable us to see the general trend of the present-day mentality of the Western people. It will also show the ideals they are striving to realize. The traditional system has failed to help them ; consequently their objections against it are perfectly justified so far as they are concerned.

But will those same ideals be our own in India ? We should stop to think before giving a hasty opinion. The standard of social culture varies with each society and each nation. It is this diversity that makes a society self-sufficient.

The ideals of our society may not be identical to those of Europe or of America, and any injudicious grafting of foreign ideals may produce bitter disappointment.

What the Western educationists have to say against the traditional system may be perfectly right, but in spite of it some of their arguments may not be applicable to India where the environmental conditions are so very different. Our aims, our morals and our interests are different from those of Europe or of America, and the infusion of the Western ideals without suitable modifications, may have a retarding effect on the production of the type of character which is badly needed in our society. Therefore, utmost caution is necessary. We must, before accepting the Western ideals as Gospel truth, study each of them carefully and select from among them only those that are in a direct line with our own.

(1)

FREEDOM.

Of the three main ideals of the new movement in education the ideal of " freedom " comes first. The great-

A Compromise between the Old and the New systems of Class teaching.

BY

DEVI CHATTERJEE, B. A. B. T.

Headmaster, Govt. English Middle School, Latur.

With the dawn of the new era in the ideals of education, there has been a continuous series of attacks, for the past few years against the traditional system of class teaching. In fact, our old system in which a class is looked upon as a teaching unit, is unanimously condemned by the modern educationists as the most unpsychological method that leads to tremendous wastage.

Much has been argued in the past ten years, against this system and their repetition will only serve to increase the volume on this paper. The main defects of the traditional system round which so much storm is raging, can however be grouped under three broad headlines as follows :—

(1) The traditional system is defective, because it does not tolerate the ideal of freedom.

(2) It is defective as there is much wastage.

(3) It is defective in the sense that it does not provide us with the opportunity for "Individual treatment."

At a distance of four miles to the south of Golconda lies the historic tomb of Mir Abid Chin Qalich Khan, the grand-father of the first Nizam-ul-Mulk. Near by are the remains of earth-works thrown up by the army of Aurangzeb while bombarding the Golconda fort.

The last Qutb Shahi King, Abul Hasan Tana Shah was taken captive by Aurangzeb and removed to Daulatabad, where the Chini Mahal bears a melancholy interest as the prison-house of the last of the Qutb Shahis. Near by, at Khuldabad are the graves of both the conqueror and his victim, Emperor Aurangzeb and Tana Shah. Steps have been taken to conserve these tombs.

(*To be continued*).

Action is the great end of all: no intellect however grand is valuable if it draw us from action and lead us to think and think till the time of action is passed by and we can do nothing.

COLERIDGE.

Keep always with you, wherever your course may be, the best and most enduring gifts a University can bestow—the company of great thoughts, the inspiration of great ideals, the example of great achievements and the consolation of great failures.

ASQUITH.

grave itself lay a satin pall with white flowers, while a canopy of gold brocade hung above. The row of illuminated MSS. the chantings of hymns in praise of God, the sweet smell of flowers and the incense which continually burnt were other features imparting sanctity and grandeur to the tomb." (Arch: Report. 1918-19). Mr. Yazdani points out that the remark made by Stanley Poole about the mosques of Cairo that their peculiar charm lay in "tone and air, in association, in delicacy and ingenuity of detail" may appropriately be applied to the tombs of Golconda.

HYDERABAD.

This city was founded by Muhammad Quli Qutb Shah (1591). It was styled Bhagyanagar after one of his Hindu mistresses. Shortly after her death, the name was altered to Hyderabad.

Mr. Yazdani writes that among the monuments of Hyderabad the stately Char Minar was indeed the CHEF D' AEUVRE of the Qutb Shahi period. It was a sort of entrance to the royal palaces in the city. The building is a unique monument of its kind in Southern India. It was constructed in 1593. Close to the Char Minar, and built about two years later, is the Char Kaman. These are four grand arches placed at right angles to one another and also to the four roads. Of the several palaces that adorned old Hyderabad, special mention should be made of the Ashur Khana. It was begun by Muhammad Kuli Qutb Shah and finished by Abdul Qutb Shah. The walls of the hall are decorated with fine Persian ornamental enamel work. They are beautifully arranged in geometrical patterns and calligraphical devices and the enamels are extremely rich in colour. Two other monuments of architectural elegance are the Jami Masjid near the Char Minar, which was constructed in 1598 and the Toli Musjid, which is situated on the way to Golconda.

masonry, which were intended to form a grand entrance to the fort. The palaces within the fort have yet to be properly conserved but the Bala Hissar or the citadel at the top of the hill is in a good state of preservation. One gets a charming view of the surrounding country from the raised pedestal on the terrace of the Bala Hissar. Standing there, one recalls with a sigh the past glory of the Qutb Shahis.

A little below the citadel are a small Musjid and a Hindu temple of the Goddess Kali. They were evidently used as places of worship, by the Mohamedan and Hindu sepoys belonging to the armies of the King. Close by is a dark chamber, where, according to tradition, Ramdas, the Tahsildar of Bhadrachellum, was confined for misappropriation of public funds.

About a mile to the north-west of the fort are two buildings: the Baradari of Taramati and the mosque of Premamati, the two Hindu consorts of Muhammad Quli Qutb Shah. The King was extremely devoted to his Hindu mistress, Premamati and among the royal tombs at Golconda is a little tomb of Premamati with an inscription:—

بود از ازل گل جنتی پیم متی

"*Premamati was verily a rose of paradise from eternity.*"

These royal tombs are about 600 yards from the fortress and are described by Wilmot and Belgrami as "the best and most remarkable mausolea in the Deccan." The finest of the tombs is that of Muhammad Quli Qutb Shah. It is 180 feet high from basement to the summit of the dome, the latter being 60 feet high. The French traveller, M. Thevenot who visited Golconda in 1667 gives a vivid picture of the tomb. He writes that "the floor of the sanctuary was covered with carpets and on the

Historical Research in H. E. H. The Nizam's Dominions.

BY

S. HANUMANTHA RAO, M. A., L. T.,

Professor of History, Nizam College.

(2)

Conservation of Mohamedan Monuments.

GOLCONDA.

Of all the Mohamedan monuments surveyed by the Department, those of Golconda and Hyderabad claim our first attention. Golconda was the capital of the Qutb Shahi Kings and it became famous all over the world for its wealth and splendour. The European travellers that visited the Deccan in the 17th : century, left very interesting accounts of what they saw at the court of these kings. The Qutb Shahi Kings were not only great warriors but also great patrons of art and literature. Their court attracted learned men from all parts of the Moslem world They were also fond of buildings and architecture and encouraged artists and craftsmen from all parts of the country. The monuments at Golconda and Hyderabad are an imperishable legacy of mediaeval Moslem rule in the Deccan, in the same manner as Ajanta and Ellora are the legacies of ancient Hindu Deccan.

The Archæological Department has published a survey map of Golconda which enables us to study in detail all the monuments and sites at the place. As one approaches the precincts of the fort, one finds two huge blocks of

expect the maximum result in the shortest possible period of time. If history teaches us any lesson it is this—that a community cannot change its ideals, its traditions, its customs, its attitude towards life in general, with the rapidity with which the individual may change his style of dress. That, in essence, is the process that is going on in India, and our present discontents and apparent failures are the necessary concomitants of the readjustment of social and psychological values that is taking place in the national life of the country.

The moral or religious influence which an University can exercise consists less in an express teaching than in the pervading tone of the place. Whatever it teaches it should teach as penetrated by a sense of duty. It should present all knowledge as chiefly a means to worthiness of life, given for the double purpose of making each of us practically useful to his fellow creatures and of elevating the character of the species itself, exalting and dignifying our nature.

J. S. MILL.

The most important problem for pedagogists today is to see that school boys and girls and University students do not grow up and finish their academic life with the idea that Chinese, Hindu, Japanese or Mahomedan topics can be safely neglected as belonging to the class of interesting electives.

B. C. SARCAR.

particular class. In England this function is fulfilled by the great Public Schools and the older universities, most of which were the creations of public-spirited individuals. The class of men turned out by these institutions is definitely one from which are taken most of those employed in the highest grades of the public services. Democrats may sneer, as Mr. H. G. Wells does in his "Clissold", at the work of these institutions, but Mr. Wells' criticism contains only so much of the truth as is essential to a caricature. Most unbiassed critics will admit that the Public Schools of England have performed and still do perform a useful and a very necessary function. In this country we have no corresponding institutions because in spite of a vociferous "intelligentsia" we still lack social consciousness, and we have very few individuals who are willing to return to the community, in the shape of endowments to schools, libraries and hospitals, some part of the financial benefit they have derived from it. When this spirit of social obligation to the community is sufficiently developed, when schools are founded by private munificence, in which adequate staff, and specialised attention is available, when our universities can recruit their numbers from schools of this type, then this country will be able to hold its own in every sphere of human activity.

There is no need then for pessimism in the present situation. The defects of the educational system of this country are obvious, but they are inevitable owing to the nature of the experiment that is being carried out; but these defects and their causes are by their very nature, transitory. Most politicians and not a few statesmen commit the fallacy of thinking that the mere reproduction of Western representative institutions must necessarily result in a smooth-working democratic government; and perhaps in the educational sphere too we are inclined to

but owing to the fact that the importance of education is more often recognised in theory than in practice, and that teachers' salaries rule low, it is generally the "left overs" from other professions who drift into the schools. The schools are overgrown; the classes are too large, and the staff is insufficient. This leads to a lack of that personal attention to the individual without which no scheme of education can be a success. This is a deplorable state of affairs but things are no worse here than in other countries. Under present conditions, in any scheme of education designed for the mass of the people these difficulties will arise, and a solution will be found only when adequate financial provision is made for this—the chief nation-building 'industry' of the State.

But what may be impossible or inexpedient for the Government of a country to undertake may be possible to a community imbued with a strong social consciousness—a consciousness that manifests itself in the willingness of the individual to make some sacrifice for the good of the community. In India we have failed lamentably in one direction. In purely literary and scientific sphere we have no cause to be ashamed of ourselves, but we have not produced in sufficient numbers any great men of action. The 'man of action' is to a large extent the product of suitable training and environment, and it is for this training and environment that there is no provision in this country. And here it is necessary to recognise a fact which a democratic age is usually slow to admit. In any community men capable of being leaders, whether as captains of industry, or as administrators or political 'bosses,' are few; and these few need education in institutions that would be unsuitable for the training of the masses. It is impossible for Government to undertake this task, for it is manifestly unfair to use the public funds for the benefit of a

with the universities of the West. It is not at this part that most criticism is levelled. It is in general culture, in the evolving of that subtle and intangible something we term 'character' (which in the individual, is in some measure the result of race or heredity but to a much larger extent the effect of environment and education) that we are lacking. And looking at the matter squarely it is impossible to blame the universities alone for this failure. The cause must be sought for earlier and it will be found in the quality of education that is being given in our schools. It is the experience of both university professors and lecturers in university colleges that their opportunities for intimate contact with their students are limited, and that generally the character of the undergraduate who has just come to the University has been greatly influenced by his school education. In most cases whether the student belongs to the class of reading men, which confines itself exclusively to its books, or to that larger class, which is more interested in the development of brawn than of brain, or to that still larger class which consistently neglects both games and reading, he is alike characterised by a lack of initiative and a discrimination to accept responsibility that amounts in some instances to a total incapacity.

In reviewing the Secondary School system of this country, one fact emerges, the importance of which is not immediately apparent. The great majority of schools are supported either by the Government or by Missionary associations. Mission Schools usually work under a financial handicap. This factor has been intensified by post-war conditions and has resulted in considerable restriction in the educational activities of Missionary societies. In the schools themselves this has led to insufficient equipment and to the employment of few, underpaid and over-worked teachers. In Government schools the conditions are better,

seal of the highest scholarship on the individual, ought to be available only to the best, for only the best are capable of deriving any benefit from such a training. This is rather different from asserting that higher education should be restricted only to the rich, for in practical life this is very often the situation. In an ideal scheme of education the highest training would be available, in general, to the more leisured and cultured classes, while it would be made possible, both financially and socially, for individuals of any class who were above the average in intellect to take advantage of such training. This is a heretical statement to make in an age when the shibboleths of unrestrained democracy are to be heard on every side. But even the most hot-headed enthusiast for democratic ideals would hesitate to deny that in any country the leaders in any sphere of life are few, and that those few should be given special opportunities of attaining the fullest development of their faculties. The wrong class of man is being attracted to Indian universities, the urge being, in the main, economic. Given sufficient time, this type of man will be absorbed in vocations more suited to his capabilities, and the benefits of university life and training will be restricted to those most capable of benefiting by it.

II

In the first part of this article an attempt was made to show that any general condemnation of our present system of education was likely to be unfair because sufficient time had not elapsed to enable us to form a correct estimate. But it is not claimed that the system is itself infallible, and even at this stage it is possible to detect weak points that might be strengthened and defects that might be removed.

The academic standards of most of the universities in this country are fairly high and compare not unfavourably

Is it not rather a matter for congratulation that they are even as good as they are?

Matters were complicated from the very beginning by the introduction of an economic factor. Education, especially University education was not sought for as a means of gaining knowledge or acquiring culture. It was a passport to service in one of the departments of the Government. In a country primarily agricultural, where success in agriculture depends on a seasonal and uncertain rainfall, the income of the individual was problematical and depended on the favour of the Gods. The comparative security of tenure and the definiteness of income afforded by posts under a more mundane Government made them desirable of attainment, and as they could be obtained only through the possession of a degree, there was a general stampede for admission into schools and colleges. The attitude of mind that produced this result still persists to some extent, and it is only within very recent years that it is being recognised that a purely academic education is suited only to the favoured few of any nation.

In any comparison between the university men of the West and East to the detriment of the latter, it is too often forgotten that the class from which the majority of Indian graduates come is analogous in the West to a class which would be content with a Board School education, with the addition, perhaps, of a six month's course in type-writing and shorthand. In countries like England it is the exception rather than the rule to find clerks who can write B. A. after their names: and yet, in British India at least, every office has its full complement of graduate clerks. Our whole scale of educational values has been upset owing to the circumstances in which western educational methods were introduced into this country. It is forgotten that university education, setting, as it ought to do, the

pendence of judgement, and the capacity for undertaking responsibility—he is almost altogether lacking.

Now, the facts on which this criticism is based cannot be questioned, for it must be remembered that the critic speaks only of the average man. But the criticism itself, none the less, is unjustifiable, because it fails to take into account the peculiar factors which influence the system of education here. An attempt will be made in the course of this article to point out various factors which, if they do not nullify this criticism, will tend at least, to modify its application to a considerable extent.

India is a new country. This statement will evoke a vehement protest from those of our historians whose chief aim has been to prove the antiquity of our culture. But it is true that in her connection with the West, in her attempt to assimilate Occidental civilization and culture, India is new—painfully new—and nowhere is this so apparent as in the sphere of education. During the last hundred and fifty years a colossal experiment has been carried out in this country. A nation has attempted through the medium of its educational institutions to adopt a culture which is foreign, and in some respects, distinctly antagonistic to its own. It does not affect the point as to whether the experiment was voluntary or imposed by an external agency. Mr. Lowes Dickenson cites the Japanese as an example of a nation—essentially imitative in temperament—which has successfully undergone the transition from an Eastern to Western civilization; and Japan today exhibits in an exaggerated form both the virtues and vices of the civilization it has copied so faithfully. In India this experiment is still going on, and the graduates of our universities are its first fruit. Considering the vast scale of the operation, and the complex nature of the issues involved, is it any wonder that the results should be at first a little unsatisfactory?

Education in India:
A Criticism & an Explanation.

BY

E. GIDEON, B. A., (OXON).

Nizam College.

I

To attribute a wife's tantrums to cerebral disease may be satisfactory to the physician but it is poor consolation to the unhappy husband. From the abundance of criticism that has been levelled at the educational system of this country,—some of it based on fact, a large part rather uninformed,—very little has emerged that can be utilised by the harassed educationist. That unfortunate individual is always confronted with the problem of having to manufacture a large number of bricks with an inadequate supply of straw; and when, being merely human, he occasionally fails to deliver his daily quota, he is made the target of critics who, armed with the latest theories of education, fail to estimate the practical difficulties in the way of their realisation.

One of the main arguments of the educational critic is that University education has proved a failure, that Indian universities have failed, speaking broadly, to produce men of character, and that Indian graduates lack not only the wide knowledge and broadmindedness that is culture, but very often the superficial veneer that passes for such. The academic training of the average university man does not fit him for a career of independent research after he has left the university, and in the fundamental qualities which go to make up what is called, for want of a better word,' character'—such qualities as initiative, inde-

ment on the classical doctrine and its classification. The old theory which held that fluids were present in our body in a certain proportion and determined our temperament, has been entirely exploded by modern research. Nevertheless, fluids are still to be found, but not in the proportion imagined by the classical doctrine.

As to the old classification, we find that it ignores the very fact that is supposed to be taken into account *viz.*, the real temperament of men. No human being can be found with the quality of only superficiality or depth or quickness or slowness; for, all of them are bound to possess something of all these qualities.

Men have a 'mixed' temperament; and it is obvious that the classification which has no place for the real, is artificial, and hence of no use for our purpose. Hume's analysis of his own character furnishes us with an illuminating instance which shows the classical classification in its true colours. He informs us that he was naturally of a cheerful and sanguine temper, and that in spite of many disappointments, he possessed the same ardour as ever in study and the same gaiety in company. He declares that he had one 'ruling passion, the love of literary fame', which, as we know, he pursued to the end of his life. It is curious to find that his biographer describes him as a man of placid and even phlegmatic temperament.

If we regard this as a test case, we are not surprised to find that the whole fabric of classification erected by the old philosophers crashes to the ground and disappears most disastrously.

Modern philosophers, working on the same problem from the physiological point of view, discovered the close

crimes, and have been the terror or admiration of the universe."

Stewart says that men of bilious temperament are not 'impulsive' but passionate; jealous, revengeful and unscrupulous.

Now, we have to examine the remaining two temperaments—the Nervous and the Phlegmatic. Here a little difficulty crops up. The leading men do not seem to be quite agreed about the true nature of the Nervous temperament. "Rapidity of mental action," says Stewart, "is one of the most striking characteristics of the nervous temperament". He also adds that it is both 'rapid' and 'enduring' in work; while M. Fonillee thinks that it is a 'sensitive' not an 'active' temperament, and its tendency is to grow melancholic. Malapert remarks that its inclination is to respond to pleasurable or positive emotions. Mill, on the other hand, gives a striking description of the nervous temperament. He opines that "it is the character of the nervous temperament to be capable of sustained effort. It is what is meant by 'spirit'. It is what makes the highbred race-horse run without slackening till he drops down dead. People of this temperament are the material of great orators, great preachers, impressive diffusers of moral influences". This account, if accepted, would force us to change our conception of the bilious temperament; for, stability of feeling, as we have seen, is the chief quality of the bilious. It would be safe, for our purpose, if we retain its popular conception as the quick temperament.

The Phlegmatic, unlike the Bilious, is 'slow.' M. Malapert considers it as 'apathetic' and Cortes as 'well-nigh passionless'.

Having considered the nature and significance of the four temperaments, we are in a position to pass judge-

Perhaps, it would be interesting and suggestive if an attempt were made to discover certain types of facial expressions and to classify 'temperament' on their basis. It seems that this kind of classification would not suffer from that vagueness which is the glaring defect of the classical and even of the modern classification of the 'naturel.'

The classical doctrine divides temperament into four classes—the Sanguine, the Bilious, the Nervous and the Phlegmatic. The qualities of the Sanguine are supposed to be inconstancy, lack of perseverance and of impulsiveness. Richerand writes: "Inconstancy and levity are, in fact, the chief attributes of men of Sanguine temperament". Cortes says about men of Sanguine temperament: "Their anger is easily kindled, but it as speedily vanishes; all their passions are lively and inconstant." Stewart adds that they are "impulsive, excitable, not enduring in work." M. Fonillee emphasises their 'superficiality,' and thinks that they are optimists by instinct. M. Malapert says, "precisely because they are optimists they turn towards pleasure and are of good humour, are jovial, unreserved, good-livng and generally well-wishing". In short, the Sanguine temperament has come to mean the superficial and cheerful temperament.

The Bilious temperament is just the opposite of the Sanguine. Richerand says," if sensibility which is vivid and easily excited, can dwell long upon one object...the passion will be violent, the movements of the soul often abrupt and impetuous, the character firm and inflexible. Bold in conception of a project, constant and indefatigable in its execution, it is among men of this temperament, we find those, who in different ages have governed the destinies of the world; full of courage, boldness and activity, all have signalised themselves by great virtues or great

to the present day, 'temperament' has been acknowledged as having a physiological basis. The acceptance of this theory expresses the common belief, that there is an inseparable connection between the physiological constitution of a human being and his 'temperament,' and that, just as physique is inherited from parents, so also is 'temperament' inherited from them and is therefore something innate.

It is a highly interesting fact that the classical attempt to find a physiological explanation of 'temperament' should be partly responsible for the consideration of the different parts of the human body as an index to character. Thus a receding forehead is supposed to show lack of intelligence; strongly marked eyebrow-ridges, energy and strength; a pronounced chin, determination; and, most important of all, the expression of the whole face, character.

We may rightly dismiss all this as ridiculous and absurd but it can hardly be denied that the expression of the face does denote something even though it be not character. The skin of the face is under the control of an elaborate system of muscles, which is regulated by the facial nerve. Its vessels are delicately controlled by the 'sympathetic nerve system over which Will has no power.' This system responds to the emotions. Thus the face is equipped with special means for reflecting our mental states, which the other parts of the body are incapable of doing. But it would be a grievous mistake to think that the expression of the face indicates character, for we believe that character is not inborn and innate. It is acquired and not inherited. It is, really, the crystallisation of habits. The facial expression, then, may be said to express something which is inborn and persists through life. In fact it denotes 'temperament.'

The Naturel.

BY

SAJJAD MIRZA, M. A., (CANTAB).

Divisional Inspector of Schools, Gulburga.

THE choice of a foreign term for the subject of an article indicates, to some extent, the lack of a proper word for it in English language. In French, the word 'naturel' means something which is as clear, precise, and definite as its English equivalents, 'temper' and 'temperament,' are vague, obscure and indefinite. Both the terms 'temper' and 'temperament' are often used as synonymous, and in such a lax manner, that it becomes imperative to explain their meaning clearly and to assign to them a definite sense, before employing them in a psychological discussion.

We shall consider, then, 'temper' in a restricted sense, as something affecting a particular emotion, and 'temperament', like 'naturel,' in a comprehensive sense, as 'something affecting the emotional nature in general.' In other words, 'temper' is an exceptional and a particular tone of our feeling and its manifestations, while 'temperament' is the general tone of our feeling and behaviour. Moreover, abruptness, suddenness, unstability and transitoriness are as remarkable characteristics of 'temper' as continuance, constancy, stability and permanence are the salient features of 'temperament.' According to this explanation, anger represents 'temper' and angriness, 'temperament.'

The next important point to consider is: What is the nature of 'temperament'? Is it innate or acquired? From the times of Hippocrates and Galen up

Nalgonda, organised the Conference and Mr. Abdul Aziz Khan, Divisional Inspector of Schools, Medak Division presided over its deliberations. As the Secretary has not favoured us with a copy of the proceedings, we are not in a position to offer any remarks on the topics dealt with at the Conference. From a perusal of the programme we are glad to observe that the conference discussed only such subjects as were of pratcical value to the teachers.

Extracts from the address delivered by Mr. Abdul Aziz Khan we publish in our Urdu section.

We understand that the authorities of the Osmania University have decided,

1. to make the City, the Zenana and the Aurangabad Intermediate Colleges, permanent Institutions, and
2. to open the Intermediate classes at the Government Osmania High School, Warangal, as an experimental measure.

H. E. H. The Nizam has been pleased to give a donation of a lakh of Rupees to Sir Rabindranath Tagore's "Viswa Bharati" for the establishment of a Chair of Islamic Studies.

We understand that the Director of Boy Scouts, Hyderabad, has organised inter-troop competitions in First Aid, Signalling, Bridge-Building, Swimming etc., for the benefit of Local Scout Troops.

Regular work has commenced at the Osmania Medical College, for the M. B., B. S., degree of the Osmania University, with Urdu as the medium of instruction.

the public of Hyderabad do not get a clear idea of the numbers that get through these examinations. With a view to supply this deficiency, we wanted to publish a tabular statement showing the results for this year. But as our information is not yet complete, we shall do this in our next number. Of course, it will not be possible for us to include in our statement, figures showing the numbers of such candidates as had sat for examinations outside the Dominions.

News and Notes.

Messrs. Mohamed Husain B. A., (Oxon) and Ali Akbar B. A., (Cantab) the two officers of the Education Department selected by H. E. H. The Nizam's Government, to attend the Imperial Conference on Education in London left Hyderabad on the morning of 22nd, May. Both were profusely garlanded and were given a hearty send off by a large number of teachers and officers belonging to the Education Department.

A few days earlier, Mr. Abdur Rahman Khan B. Sc. (London), Principal of the Osmania University College, left Hyderabad for London, having been deputed by the Government to attend the Centenary celebrations of the University College, London.

A conference of teachers belonging to the Nalgonda District was held on the 15th, 16th, and 17th, June 1927 at Nalgonda. Mr. Malik Sardar Ali B.A., Inspector of Schools,

diate Examination in Arts. It is only when teachers who have studied Geography at a University, are given charge of the teaching of this subject at schools, that any improvement in the present dull and dreary teaching of the subject at schools could be hoped for.

We draw the attention of the Osmania University authorities to the urgent necessity for the provision of a lecturership in Geography at the Osmania University College as a first step towards the recognition of the importance of Geography.

Intermediate Colleges in Hyderabad State.

People interested in the progress of the Osmania University will welcome the news that three temporary Intermediate Colleges have been converted into permanent institutions. It will be remembered that they were started four years ago as an experiment and their continued success has compelled the University to make them permanent. Further, the greater demand for University education has obliged the University to open another College at Warangal. Though we welcome this news we should have preferred an Intermediate College at Gulburga as, in our opinion, Secondary Education has made greater progress in that Division. The decision to start a college at Warangal, we hope, will not come in the way of a College at Gulburga.

Examination results for 1927.

In no Province in India are, perhaps, the public interested in so many examinations as in Hyderabad State. This is partly due to the fact that many of the students prepare for examinations conducted by outside bodies and partly to the fact that certain local examinations of the same denomination are conducted by two different bodies. The results of these various examinations are published at different times and

young. But unfortunately even many older Societies have made a habit of obtaining loans from Banks regularly. Here also there are Societies which take deposits from non-members. Lastly, accounts are not audited with sufficient frequency and promptness. The first two reforms can be introduced by the organisers of Societies themselves. But so far as the last is concerned, though members can do something in the matter by appointing their own auditors, still, we are afraid, there is much leeway to be made up by the Registrar himself in the exaction of a more efficient and prompt audit from his subordinates. With regard to the organisation of Stores, one has to confess with a certain amount of shame, that the charges which Mr. Collins brings against the Managers, of lack of experience in business matters, and, in some cases, of dishonesty, are perfectly true. Better education alone could remove these blots and let us hope this we shall have in the not distant future.

Amongst the resolutions passed, the one suggesting the starting of Building Societies and the other requesting Government to empower officers to deduct amounts due to registered Societies from the pay of their defaulting subordinates, need special mention. To those familiar with the working of the Societies here and the acuteness of the housing problem in the city these demands have come none too soon.

Geography teaching at schools.

After years of weary waiting, at last there are signs that the teaching of Geography in schools in India might take a turn for the better, in the near future. Following the example of some of the newer Universities, the older ones also are introducing this subject in their college courses. Even the slow-moving Madras University has added Geography to the list of optionals for the Interme-

and bad points of the teachers of classical languages in schools and colleges. We are in entire agreement with the views put forward therein. As the address has already appeared in the Punjab Educational Journal and elsewhere, we refrain from quoting from it here. However, for the benefit of the Urdu-knowing public, we shall publish a translation of it in the Urdu section of our next number. It is a matter for great pleasure that the reforms which Mr. Woolner contemplates in the teaching of classical languages were anticipated by the founders of the Osmania University. As everybody knows, the Theology Faculty of this University gives a touch of modernism to the moribund Oriental courses of studies, by the introduction of modern subjects in the curriculum, the object being the production of scholars who, in addition to being familiar with classical learning and culture, are expected to be in touch with modern thought.

Co-operative conference at Hyderabad.

For the first time in the history of the city, a conference of people interested in the Co-operative Movement was held at Hyderabad under the chairmanship of Mr. B. A. Collins, I. C. S. The president delivered a thoughtful address pointing out some practical difficulties in the way of Credit Societies and suggesting the lines on which they should work if they are to be a success. Those responsible for the Credit Societies attached to schools and colleges would do well to ponder over the desirability of introducing here the three reforms which Mr. Collins found necessary for putting life into the Credit Societies of Bihar and Orissa. We are afraid the three evils which Mr. Collins found rampant elsewhere have also become a feature of the Societies in the Dominions. People start Societies merely to borrow money. Loans are constantly taken from Banks. This is easily understood in the case of Societies comparatively

former was answered by the candidates concerned within an hour and a half, whereas the latter took up the full time alloted to it. We should not be understood to be condemning the examiner in Ethics. This paper was as it should be. It is the paper for the Sunni boys that needs stiffening, so that it might also be a fair test of what the students are expected to learn during a course of two years.

The next point we wish to make is the necessity for greater vigilance in future, on the part of moderators of the Mathematics papers. The first paper in Elementary Mathematics this year appears to us to be a bit stiff for the candidates concerned. We have before us a copy of the University Calendar showing the syllabus for both Elementary and Optional Mathematics. A few problems in Algebra seem to us to be not quite from the syllabus prescribed, but from the portions set apart for the Optional Mathematics boys. We admit the rest of the paper was quite fair, as also the fact that the second paper was of the right standard. It might be said that candidates should get the necessary minimum required for a pass from these. A good many candidates, no doubt, would do so. But, at the same time, there must have been some who, not being strong in Arithmetic, expected to score much in Algebra; such candidates must have been terribly disappointed. We hope, from next year at least, no loop-hole would be left for the creeping in of such disappointments.

Mr. Woolner on the teaching of classical languages.

The presidential address delivered by A. C. Woolner Esq. C. I. E., M. A., Principal of the Oriental College, Lahore, to the Classical Languages section of the Punjab Educational Conference deserves careful reading by educationists all over India. We commend specially that part of his address wherein he has attempted to bring out the good

for the last Osmania Matriculation Examination lest we should be classed along with the carping critics referred to above. But, on second thoughts, we have considered it necessary in the interests of both the University and the students, to bring to the notice of the authorities, one or two points that, in our opinion, need rectification.

The first point concerns the papers set for compulsory Theology. This subject is a unique feature of this examination and, up till now, was not attached much importance to, as arrangements had not been made for examining boys other than Sunnis appearing for the examination. Though a paper of 3 hours' duration was set for the Sunni boys, neither school authorities nor students paid much attention to the subject of this paper, as the examiner or examiners always set a paper containing simple questions that required very short answers, and passed almost all. But from this year, with the prescription of a special book on General Ethics for Shia and Hindu boys and arrangements for examining them, the character of the examination has entirely changed. Now, the marks obtained in this paper, should be made use of for purposes of moderation in accordance with rule No. 13 of 'Rules and Regulations of Matriculation Examination' of the University Calendar. It is only then that the boys will study the subject with sufficient seriousness, and the object of making this subject compulsory in the University would be realised. Further, it is necessary that the moderators should insist upon an equal standard in the papers both for Sunni and Non-Sunni boys. Otherwise, one or the other set of candidates, will be at a disadvantage. On comparing the two papers on this subject set for this year's examination, we find that the paper for Sunni boys was as usual short and simple though of 3 hours' duration, whereas the paper on Ethics was comparatively difficult and long in the sense that it required fairly long answers. We understand that the

Editorial Notes.

Ourselves.

With the publication of the present issue, the HYDERABAD TEACHER enters upon the second year of its existence. Though the hopes with which this Quarterly was started have not been fully realised, yet the small success that has attended our efforts, emboldens us to hope that, as time goes on, we shall meet with greater success. Ours is a technical journal that carries its appeal only to a special class and unless a larger number of people belonging to the teaching profession take interest in the journal and try to help us both by sending contributions and increasing our circulation, we cannot introduce all those improvements which should be a feature of every well-conducted journal. No doubt, it is customary on the part of conductors of journals struggling for existence to issue frantic and pathetic appeals to the public asking for help. We are also appealing for help; but our appeal differs from others in that we do not wish to fill our pockets by running the journal. All that we expect is enough to make both ends meet. Our Association contributes a certain amount annually. But this by itself is not enough to run the journal. Hence the need for more subscribers so that what we realise from this source might be spent on the journal itself.

The Osmania University Matriculation Examination, 1927.

Whatever might be the amount of care bestowed in the selection of examiners and moderators etc. for the preparation of question papers for any public examination, experience shows there are people who will find fault with this or that paper on some ground or other. Knowing this, we were rather reluctant to review the papers set

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

Regtd. Asafia No. 47.

June 1927 A. D.

Vol. II.] [No. 1.

Amardad 1336 Fas'i.

Under the Patronage of

Nawab Masood Jung Bahadur, B.A., (Oxon.),

Director of Public Instruction.

THE HYDERABAD TEACHER

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, B. A., (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

HYDERABAD-DECCAN

THE CHANDRAKANTH PRESS.

1927.

رجسٹری شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۸

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

حلقہ ادارت

مولوی سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

مولوی ولایت علی بی اے (عثمانیہ)

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع دفتر صدر مہتممی تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقہ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(ا) رسالہ کا نام حیدرآباد ٹیچر ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

(۱) اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۲ روپیہ معہ محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

(۲) " " ۱۲ ار علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (")

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکیگا

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم و تعلم سے متعلق ہوں اور جن میں ملک کے مفاد تعلیمی کے لحاظ سے ندرت اور جدت ہو۔

(ہ) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت نہار ہے گا۔

(ر) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

فہرست مضامین

جلد (۲) بابتہ ماہ آبان سنہ ۱۳۳۶ف م ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء نمبر (۳)

ہندوستان کوآپریٹو انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

(صدر دفتر کلکتہ)

خالص ہندوستانی بیمہ کمپنی

آخری منافع بحالہ (بابتہ سنہ ۱۹۲۲ء)
۵؍روپیہ فی ہزار آئندہ منافعہ
(بابتہ سنہ ۱۹۲۶ء) اسمیں ایک معتدبہ
رقم کی توقع کیجاتی ہے کہ۔

سرمایہ زائداز ۸۰۰،۰۰۰،۰۰ روپیہ جدید کاروبار۔ بابتہ سنہ ۱۹۲۵ء سنہ ۱۹۲۶ء زائداز ۶۰،۰۰۰،۰۰ روپیہ۔

توسیع بالذات بابتہ ادائی قسط بیمہ، قرض، قیمت بازگشت اقساط و تجدید پالسی منقضی شدہ وغیرہ کے متعلق فیاضانہ شرائط۔ شرح قسط بیمہ (بامنافعہ) کافی کم رکھا گیا ہے اور شرح بلا منافعہ تقریباً سب سے کم ہے۔ لہذا "ہندوستان" ہی میں اپنی زندگی کا بیمہ کرواکر اپنی ذات اور خاندان کی کفالت سے مطمئن رہیئے۔ سب ایجنسی کے لئے درخواست مطلوب ہیں ماہانہ تنخواہ (صہ سے للعہ تک) بہترین شرائط گارنٹی شدہ کاروبار کے لئے۔

تفصیلی معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر دریافت فرمائے

یس۔ جی۔ نائیڈو۔ نارایں آشرم (ترپ بازار حیدرآباد دکن)

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے۔

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـــہ	صہ۸ر	ســے
نصف ؍؍	صہ	عالہ ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع ؍؍	عالہ ۸ر	عہ ۶ر	۲ار
فی سطر ؍؍	۱۰ر	۸ر	۶ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طلبا کی کامیابی

(گذشتہ سے پیوستہ)

ازمولوی حسام الدین صاحب فاضل

درستی اخلاق و عادات | کھانے پینے اور دیگر حرکات میں جانور بھی انسان کا ہم پلہ ہے اور بے سوچے سمجھے بولنے میں طوطا۔ مینا بھی اس کے ہمنوا۔ مگر فرق ہے تو یہ ہے کہ انسان میں ہر ایک کام کے آداب ملحوظ رکھنے کا ملکہ موجود ہے اور جانوروں میں مفقود۔ یہ اپنی گفتگو کو مہذب بنا سکتا اور عقلمندی کی باتیں کہہ سکتا ہے۔ طوطا۔ مینا لکیر کے فقیر ہیں انہیں سکھائی ہوئی باتوں کی نقالی آتی ہے اور بس۔ اب اگر انسان اپنے حرکات و سکنات کو شائستہ بنائے اور اپنی گفتگو کو درست نہ کرے تو چارپایوں کا ہم پایہ ہے اور اگر اس نے بدتہذیبی اختیار کی بد اخلاقی سیکھی تو جانوروں سے بھی بدتر ہے اس لئے کہ وہ مجبور محض تھے اور یہ باوجودِ قدرت ناقص رہا ؎

ولم ار فی عیوب الناس عیبا کنقص القادرین علی التمام

یعنی انسان کا بڑا عیب یہ ہے کہ تحصیل کمال کی قدرت کے باوجود ناقص رہے۔

عزیز طالب علمو آؤ اب ہم اپنے افعال و اعمال۔ حرکات و سکنات پر غور کریں کہ

ان کے لحاظ سے ہم انسان اور ایک کامل انسان کہلانے کے قابل ہیں یا نہیں کیونکہ تحصیل علم سے اصلی غرض یہی ہے کہ انسان انسان بنے۔ اخلاق و عادات درست ہوں سے

علم آدمیتست و جوانمردی وادب ورنہ دَدی بصورتِ انساں مصوری

بعض طالب علم جتنی توجہ تحصیل علم کی طرف کرتے ہیں اخلاق و عادات کی درستی کی جانب نہیں کرتے۔ تعلیم یافتہ ہو کر بھی ان کے حرکات و سکنات نادانوں کے مانند رہتے ہیں ان کا کھانا پینا چلنا پھرنا بات چیت کرنا غرض ہر ایک کام قابل اصلاح۔ ایک دفعہ میں طلبا کے پانی پینے کے مقام کو دور سے دیکھتا رہا تاکہ معلوم کروں کہ طالب علم پانی پینے کے آداب اور صفائی کا کس حد تک لحاظ کرتے ہیں حالت یہ دیکھی کہ کوئی تو زمین پر کا آبخورہ اٹھاتا اور دھوئے بغیر گھڑے میں سے پانی لیتا اور غٹ غٹ پی جاتا کوئی بائیں ہاتھ ہی سے آبخورہ لیتا اور گھڑے میں پورا ہاتھ داخل کرکے پانی لیتا اور اس طرح پیتا کہ آدھا پانی حلق میں تو آدھا اپنے سینہ و شکم پر کوئی پانی پیتے پیتے ہنس پڑتا اور آبدار خانہ کو غلیظ کر دیتا غرض ہر ایک پیاسا طالب علم بدتمیزی میں۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کا مصداق بنا ہوا تھا۔ دو چار ایسے بھی نکلے جنہوں نے آداب کا لحاظ رکھا۔ آبخورہ کو صفائی کے ساتھ سیدھے ہاتھ میں لیا اور ٹھہر ٹھہر کر پانی پیا سانس لینے کے وقت آبخورہ منہ سے ہٹاتے گئے اور مابقی پانی پھینک دینے کے بعد آبخورہ کو احتیاط سے رکھ دیا اور چلے گئے۔

بعض طالب علم بیہودہ گوئی کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں جہاں چار پانچ طالب علم ملے کہ بیکار باتیں شروع ہو گئیں اور بجائے علمی تذکروں کے لاطائل گفتگو میں وقت گذر گیا اور کبھی باہمی تکرار کی بھی نوبت آگئی مثلاً کسی عہدہ دار کی تنخواہ کا ذکر آیا

ہر ایک نے ایک مقدار بیان کی اور اس پر گھنٹوں بحث ہوتی رہی مگر صحیح نتیجہ پر نہ پہنچے ہر ایک نے دوسرے کو جھٹلایا اور باتیں کرتے کرتے جنگ کرنے لگے۔

کبھی طلبار باتوں باتوں میں دوسروں کی غیبتیں کرنے لگ جاتے ہیں نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ استاد کی غیبت اپنے صدر مدرس کی غیبت دلچسپی لیکر بیان کرنے لگتے ہیں۔ غیبت بری چیز ہے پھر اساتذہ کی غیبت نہایت ہی بری یاد رہے کہ جو بات ہم کسی کے سامنے کہنا پسند نہیں کرتے اسے غائبانہ میں بھی نہ کہنا چاہیئے یہ بدترین خصلت ہے کہ کسی کے سامنے تو ہم انتہائے ادب کے ساتھ خاموش رہیں اور اس کے غیاب میں عیب چینی کریں اور برا بھلا کہیں۔

بعض طلبار کی بے ادبی اور بدطینتی کا یہ حال کہ حلم و عفو تو درکنار اور روکے ساتھ رحم و کرم ایک طرف خود اپنے اساتذہ کے ساتھ ہی مقابلہ کے لئے تیار اور انہیں نقصان پہنچانے مستعد۔ ایک جماعت سے حاضری کا رجسٹر گم ہوگیا استاد صاحب نے جماعت میں کہلا بھیجا کہ اگر رجسٹر ملے تو خیر ورنہ سب مار کھائیں گے بس اتنی ہی بات کا سننا تھا کہ چند طالب علم آپس میں کہنے لگے کہ مارنے تو دیجئے دیکھئے ہم کیا کرتے ہیں بعض حق تناس تو یہاں تک کہہ بیٹھے کہ اگر استاد جی ماریں گے تو ہم ان پر فوجداری کردیں گے۔ وہ تو خیر گذری کہ گم شدہ رجسٹر مل گیا ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔ اب غور فرمائیے جو طلبار ابھی سے استاد پر فوجداری کرنے تیار ہوں وہ آیندہ زندگی میں کہاں تک رفع فساد فرمائیں گے اور مقدمہ بازی سے کس حد تک کنارہ کش ہوں گے

جھوٹ بدترین چیز ہے دروغ کو فروغ نہیں مگر اکثر طالب علموں نے دروغ بیانی کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے دیر سے آئے جھوٹ کہہ کے چھوٹ گئے غیر حاضر ہو گئے جھوٹا عذر گھڑ لیا۔ رخصت لینی چاہی تو بعض نافہموں نے درخواستِ رخصت پر جھوٹی تصدیق میں اپنے قلم سے سرپرست کے دستخط قلمبند کر لئے۔ اگر کبھی اور عذرات سے

رخصت منظور ہوتی معلوم نہ ہوئی تو فوراً کسی عزیز کے انتقال کی خبر لکھی اور رخصت مانگ لی۔ جو طلبار بے ضرورت رخصت لینے کے لئے زندہ و سلامت عزیزوں کی خبر مرگ اُڑانے میں کوتاہی نہ کریں ان سے خویش و اقارب کی امیدیں کس طرح وابستہ رہ سکتی ہیں۔ اور آیندہ صلہ رحمی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے

بعض طالب علم جھوٹ اور دھوکہ دہی کی بھی حد کر دیتے ہیں۔ حال ہی کے ایک طالب علم کا واقعہ ہے کہ اسے مدرسہ سے بعلت غیر حاضری خارج ہوئے آٹھ ماہ گزر گئے مگر یہ اپنے والدین کو یہی باور کراتا گیا کہ مدرسہ میں پابندی سے تعلیم پا رہا ہوں روزانہ اوقات مدرسہ میں گھر سے غائب رہتا۔ ابا جان کی بے خبری بھی قابل تحسین ہے کہ اس طویل عرصہ میں بندۂ خدا نے یہ بھی دریافت کرنے کی کوشش نہ کی کہ لڑکا مدرسہ میں حاضر بھی ہو رہا ہے یا نہیں طرفہ یہ کہ شرکتِ امتحان کی فیس بھی ہونہار طالب علم نے اپنے ابا سے وصول کر لی اور چٹ کر گیا۔ والدِ بزرگوار خوش ہیں کہ بچہ شریک امتحان ہو گیا ہے نتیجہ کے منتظر ہیں اور کامیابی کے لئے دست بدعا۔ خدا خدا کرکے نتیجہ نکلا تو دغا باز طالب علم نے کمال ہی کیا کہ اخبار میں اپنے ہمنام کامیاب طالب علم کا نام اپنے والد کو بتایا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ والد کی خوشی کی حد نہ تھی اور رنج و ملال کی بھی انتہا نہ رہی جب وہ مزید اطمینان حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ تشریف لائے اور یہ سن پایا کہ ان کا لائق فرزند کامیابِ امتحان تو کہاں مدرسہ کی حاضری ہی میں مہینوں سے ناکام ہے ؎

ہم کو تو دوستوں ہی سے ملنے کا رنج تھا دشمن سے تم ملے یہ ستم پر ستم ہوا

بعض طلبا اپنی شرارتوں سے استاد کا ناک میں دم کر دیا کرتے ہیں کبھی تو صرف ان کی باہمی لڑائی جھگڑوں کے فیصلے کرنے ہی میں استاد کا عزیز وقت صرف ہو جاتا ہے کبھی حوائج ضروریہ کے لئے طلبا یکے بعد دیگرے اجازت طلب کرنے اور جماعت سے

باہر جانے آنے میں اوقات گزار دیتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ ان حرکات سے اُستاد کو دق کرنے کے جرم کے علاوہ عادت پر برا اثر پڑرہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم میں کسی وقت بھی دلجمعی نہ ہوسکے گی اور امتحان گاہ میں جہاں گھنٹوں ایک ہی کام میں مصروف رہنا پڑے گا یہ بری عادت وہاں بھی بے وقت امتحان گاہ سے نکالے گی اور ناکامی کا باعث بنے گی طلباء کو چاہئے کہ صبر و ضبط سے کام لیں اور ایسی خصلتوں کو ترک کرنے کی کوشش کریں جن کا آیندہ زندگی میں تکلیف دہ اور نقصان رسان ثابت ہونے کا اندیشہ ہو۔

طلباء کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنی زبان کو خراب نہ ہونے دیں اکثر تعلیم یافتہ بچوں میں بھی گالی گلوچ کی بری عادت پائی جاتی ہے جو نہایت مذموم ہے۔ زبان خداداد نعمت ہے گویائی قابل قدر چیز ہے اس کو اچھے اصول پر استعمال کرنا چاہئے۔ فحش کلامی شریفوں کا شیوہ نہیں۔

بعض بدکردار طالب علموں نے زبانی گالیوں سے گذر کر تحریری دشنام دہی کو بھی اپنا ضروری شغلہ بنا رکھا ہے یہ کس قدر قابل افسوس امر ہے کہ مدارس کے بیت الخلاؤں کی دیواریں ان سیاہ کاروں کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہیں اور دنیا بھر کی گالیاں وہاں لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں جو طلباء کی افسوسناک نالایقی کا ثبوت دے رہی ہیں۔

بے محل چیخ پکار بھی بری خصلت ہے۔ اظہار مسرت اچھے اصول پر ہونا چاہئے بعض طالب علم ذرا سی خوشی میں آپے سے باہر ہوجاتے ہیں مثلاً برخاست مدرسہ کے وقت کثرت مسرت سے نعرے لگاتے اور اتنا شور مچاتے ہیں کہ سننے والوں کے کان پھٹے جاتے ہیں۔

اُستاد صاحب سے اگر کسی وقت جماعت خالی رہے تو بھی شور و غل سے طلباء اپنی ناہنجاری کا ثبوت دیتے جاتے ہیں حالانکہ استاد صاحب جماعت میں رہیں نہ رہیں مدرسہ بہرحال مدرسہ ہے جس میں سوائے نوشت و خواند یا اس کے معاون مشاغل کے

دوسرے مشغلوں کو دخل نہیں۔

کسی قصور پر سزا پاتے وقت فریاد کرنا یا چیخ چیخ کر رونا غلاموں اور کمینے انسانوں کا کام ہے۔ طلبار کو زیبا نہیں کہ وہ استاد یا صدر مدرس کی مار کھاتے وقت چیخیں چلائیں بلکہ انہیں چاہئیے کہ صبر و ضبط سے کام لیں اور اپنی خطاؤں پر نادم ہوکر تائب ہو جائیں۔

اکثر طلبا کو عبث حرکات سے گہری دلچسپی رہا کرتی ہے مدرسہ میں سبق ہو رہا ہے اور بعض طلبار کی یہ کیفیت کہ کوئی پنسل کے ذریعہ بیکار لکیریں کھینچنے میں مشغول ہے تو کوئی اپنے دستخط کرنے اور مٹانے میں مصروف۔ کوئی اپنے ناخن کے ذریعہ بے اصول خط ناخن کی بے محل تحریر میں محو ہے تو کوئی اپنے ناخن آپ کترنے میں منہمک۔ ایک ایک حرکت کے ظاہر کرنے سے پہلے طلبار کو سوچ لینا چاہئیے کہ وہ بیکار رہے یا کار آمد بے کار حرکتوں سے خود کو دور رکھنا چاہئیے طالب علمی کے زمانے کی گھڑیاں بہت قیمتی ہیں بیکار مشغلوں میں انہیں برباد کرنا عقلمندی نہیں۔

کھیل کود مفید چیز ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ طلبا صبح سے شام تک کھیل ہی کی دھن میں لگے رہیں بعض طالب علم ایسے بھی دیکھے گئے کہ مدرسہ میں زیر تعلیم ہیں جماعت میں استاد موجود مگر طالب علم ہے کہ اپنے پاؤں سے فٹ بال کو حرکت دینے میں مصروف ہے استاد کی نظر پڑی تو پاؤں ٹھیر گیا ورنہ عین سبق کے وقت بھی کھیل جاری کا جاری ہے کسی طالب علم کو پتنگ بازی کا شوق ہے تو اس حد تک کہ صبح صادق سے مدرسہ کے وقت تک پتنگ۔ دوپہر کی چھٹی میں گھر آیا تو پتنگ۔ برخاست مدرسہ کے بعد سے رات کا اندھیرا چھا جانے تک پتنگ ہی پتنگ۔ کیا غضب ہے کہ ایک میٹرک کا طالب علم صرف پتنگ بازی کے ایک جلسہ میں مبلغ دو سَو روپیہ اُڑا دیتا ہے اور پھر طالب علم ہے۔

شعبان کی عید آتی ہے آتش بازی کی آتش شوق کے شعلے طلبار کے بھی دل و دماغ تک

ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ عید کے بعد مدرسہ کھلتا ہے تو کسی طالب علم کا ہاتھ چلا ہوا ہے تو کسی کا چہرہ جھلسا ہوا یہ سب کچھ تو ہمارے طلبا سے ہو سکتا ہے مگر اپنے ضروری کام اپنے ہاتھ سے آپ انجام دینا نہیں ہو سکتا۔ اپنے گھر کا سودا لانا ناگوارِ خاطر ہے غریب ماں باپ کے گھر پانی بھر دینا سخت ترین ننگ و عار کا باعث خیال کیا جاتا ہے ایک راستے سے میرا گذر ہوا دیکھا کہ پانی کے نل کے پاس ایک طالب علم جو کسی وقت انجمن حمایت میں زیر تعلیم تھا صراحی لئے کھڑا ہے دوسری صراحی نل کے نیچے پانی بھرنے کے لئے رکھ چھوڑی ہے۔ حیرت ہے کہ جیسے ہی اس طالب علم کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھے نل کے قریب سے گذرتا دیکھا صراحیوں کو چھوڑ اس تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگ گیا کہ گویا وہ چوری کرنے میں مشغول تھا اور محتسب نے اسے دیکھ لیا۔

عزیز طالب علمو جب پانی پینے سے تمہیں عار نہیں تو پانی لانے سے کیوں شرم۔ جب تم بازار میں پھرنے اور بیٹھنے سے نہیں شرماتے تو اپنے گھر کا سودا سلف خریدنے سے شرمانے کی کیا ضرورت۔

مڈل پاس طالب علم سے اس کی والدہ عاجزانہ لہجہ میں کہتی ہے کہ چار پیسے کے پان خرید لا۔ طالب علم اپنی والدہ کو ڈرا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے دکان سے پان خرید لانے شرم آتی ہے۔ میرے تعلیم یافتہ ساتھی اگر دیکھ لیں گے تو کیا کہیں گے حالانکہ یہی طالب علم اپنے تعلیم یافتہ احباب ہی کے ساتھ پان کی دکان پر کھڑا ہو گلوریاں خریدتا جاتا ہے۔ اور شرم و حیا کا نام تک نہیں لیتا۔

طالب علمو لیاقت ایسی ناپائدار چیز نہیں ہے کہ دکان پر گئے اور رخصت ہو گئی تم کو پہلے علمائے کرام میں اکثر علما ایسے ملیں گے جو ذہی مقدرت ہونے کے باوجود اپنا کام آپ کیا کرتے تھے۔

ابو الاسودؒ واضع فن نحو پر اخیر عمر میں فالج گرا تھا اور اس کے اثر سے ان کے تم

پاؤں بے کار ہو گئے تھے اس معذوری کی حالت میں بھی وہ ہر روز پاؤں گھسیٹتے ہوئے اپنے کام کی خاطر بازار کو جاتے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ضرورت اُن کو یہ تکلیف کرنے پر مجبور کرتی تھی کیونکہ ابو الاسود بہت آسودہ تھے اور بہت سے خادم ان کی سرکار میں حاضر رہتے۔

حضرت امام بخاریؒ نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی اس تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے اُن میں خود امام بخاری بھی شامل تھے یہ امام اپنے سر پر اینٹیں رکھ کر لے جاتے اور راجوں کو دیتے۔ ایک روز ایک شاگرد نے ازراہ دلسوزی عرض کی کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے امام ممدوح نے فرمایا کہ ھٰذا الذی ینفعنی یعنے یہ کام مجھ کو نفع دے گا۔

یہ اور بات ہے کہ اپنی اوقات کی حفاظت کی غرض سے استطاعت ہونے کی صورت میں خرید و فروخت کا کام خادموں کے ذریعہ لیا جائے کہ یہ وقت بھی تحصیل علم میں صرف ہو۔ تاہم خرید و فروخت کی عادت ضرور رکھنی چاہئے اور کبھی کبھی معمولی چیزیں بھی خریدنے بازار چلے جانا لازمی ہے تاکہ بیجا شرم و حیا باقی نہ رہے اور وہ منافات دور ہو جائے جو طالب علموں نے اپنی کوتاہ بینی سے علم و لیاقت اور خرید و فروخت کے درمیان سمجھ رکھی ہے۔

بعض طلبا اپنے لباس کے بڑے شیفتہ ہوتے ہیں۔ اور ہمہ تن جسم و لباس کی آراستگی ہی میں مصروف رہتے ہیں اور جماعت میں آتے ہیں تو اپنی خوش لباسی کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کرنے لگتے ہیں اور کمال یہ کہ درس کے وقت بھی اپنے سوٹ بوٹ کی وضع و ترکیب ہی کی طرف متوجہ رہتے ہیں حالانکہ ؎

لیس الجمال باثواب تزیننا ان الجمال جمال العلم والادب

یعنے خوبصورتی زینت دینے والے لباس سے نہیں ہے حقیقی خوبصورتی علم و لیاقت سے ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خواہ مخواہ پھٹے پرانے کپڑے پہنا کریں یا صاف ستھرے اچھے لباس سے سروکار نہ رکھیں صفائی و پاکیزگی ضروری چیز ہے حسب حیثیت عمدہ لباس استعمال کرنا مستحسن ہے۔ حضرت امام مالکؒ لباس نہایت پاکیزہ پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے اپنے شہر (مدینہ طیبہ) کے جتنے فقہا دیکھے سب کو خوش پوشاک دیکھا۔

حضرت امام ابو حنیفہ بہت خوش لباس تھے ایک مرتبہ ان کی چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا۔ مگر یہ سب کچھ دین کی شوکت کے اظہار اور خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر کے طور پر تھا نہ کہ دوسروں پر فخر کرنے اور خود مغرور و متکبر بننے کے لئے۔

طلبا میں بعض تو اپنی بدتمیزی کے باعث لباس کو جلد میلا کچیلا کر دیتے ہیں اور غلیظ حالت میں مدرسہ چلے آتے ہیں جس سے ساتھیوں کو نفرت ہونے لگتی ہے اس کے برعکس بعض طلبا، اپنے کپڑوں کی درستگی اور حیثیت سے بڑھ کر عمدہ پوشاک کی دھن میں ایسے لگ جاتے ہیں کہ عزیز اوقات کا اکثر حصہ صرف لباس کی درستگی میں گذر جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ اچھا لباس پہن کر خدا تعالیٰ کا شکر کرتے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے غریب ساتھیوں پر فخر کرنے لگتے ہیں اور ان کے دردِ افلاس کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں۔

ہونہار طالب علمو۔ ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہیں حقیقی کامیابی مقصود ہو اور آئندہ زندگی کی صلاح و فلاح مطلوب تو ہر ایک بری خصلت کو ترک کرو تمہارے تمام معاملات ایسے رہیں جن پر عقلمند ہستیاں حرف گیری نہ کر سکیں اور کسی طبع سلیم کے تنفر کا باعث نہ ہونے پائیں۔

حرکت و سکوں اور گفتگو وغیرہ کے آداب بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے جو کچھ اپنی اپنی کتابوں میں اس کے متعلق پڑھتے جاؤ یا استادوں سے سیکھتے جاؤ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو اور خاص طور پر کوشش کرو۔

ہمدردی ملک و قوم | سردار فوج اور اس کی رہنمائی کے بغیر کسی بہادر و جانباز فوج کی فتح و فیروزی امر محال ہے قافلہ سالار و خضر راہ کے نہ ہوتے کسی قافلہ کا منزل مقصود تک پہنچ جانا خواب و خیال۔ اسی طرح ہر ملک کی ترقی بھی خواہان ملک کے مساعی جمیلہ سے وابستہ ہے اور کسی قوم کا مدارج کمال تک پہنچنا رہنمایانِ قوم کی اعانت و ہمدردی سے پیوستہ۔ چمن کی سرسبزی و شادابی اس کی آبیاری پر موقوف ہے اس کی خوبی و خوش اسلوبی درختوں اور پودوں کی باہمی عمدہ ترتیب پر منحصر۔ اسی طرح باغ عالم کی بہار علم و عقل کے مصفا پانی کی محتاج ہے اور اس کی خوش وضعی انسانوں کی باہمی ہمدردی و حمایت کی دست نگر

کسی بستی میں اگر ایک گھر کو (خدا نہ کرے) آگ لگے اور بستی والے اس خیال سے بے حس و حرکت بیٹھے رہیں کہ ہمارے گھر محفوظ ہیں تو اس بےخبری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تھوڑی سی آگ بڑھتے بڑھتے تمام آبادی کو جلا کر خاک سیاہ کردے گی۔ ع

آتش کہ بلند شد جہاں سوخت

اسی طرح اگر کسی قوم کے ایک فرد میں بھی بدمعاشی و بداطواری کے آثار پائے جانے لگیں اور دوسرے افراد یہ سمجھ کر کہ اس میں صرف اس شخص کا اپنا نقصان ہے خاموش بیٹھے رہیں تو یاد رہے کہ یہ متعدی مہلک مرض بڑھتا جائے گا اور ایک نہ ایک دن قوم کے ہر فرد میں سرایت کرکے رہے گا۔

شفیق طالب علمو۔ اگر اہل علم ہستیاں جاہلوں کو اُن خرابیوں سے آگاہ نہ کرتے رہیں جو ان میں نادانی کے سبب جاگزیں ہوچکی ہیں تو تمہیں بتاؤ کہ یہ برائیاں اُن سے کس طرح دور ہوسکیں گی۔ خدا تعالیٰ نے تمہیں دوسروں سے زیادہ عقل اور علم سے سرفراز کیا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس علم کے ذریعہ اوروں کو فائدہ پہنچاؤ اور جاہلوں کو قعر مذلت و جہالت سے نکالنے کی کوشش کرو ع

چوں استادہ دستِ افتادہ گیر

مگر حالت یہ ہے کہ طالب علموں کو گویا اوروں کی امداد و اعانت سے سروکار ہی نہیں زمانہ طالب علمی میں کم فرصتی کا گلہ رہا اور مدرسہ کی حاضری ۔ امتحانات کی تیاری کے عذر سے کبھی کوئی کلمۃ الخیر تک زبان پر نہ آسکا فارغ التحصیل ہونے کے بعد فکر معیشت و ترقی جاہ و منزلت میں ایسی سرگردانی رہی کہ عمر گذر گئی مگر ملک و قوم کے ساتھ ہمدردی کی نوبت نہ آئی

عزیزو صرف علم سیکھنا فائدہ مند نہیں جب تک اس کا مفاد اوروں تک نہ پہنچے ۔ فقط لائق ہوجانا لائق تحسین نہیں تاوقتیکہ دوسروں کو بھی قابل بنانے کی تجویز نہ کی جائے ۔ یہ نہیں کہتا کہ دوسروں کی خاطر ناقابل برداشت مصیبتیں جھیلو اور عزیز اوقات کو خدمت خلق ہی میں صرف کرو ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ جو کچھ سیکھتے جاؤ اوروں کو اس سے مستفید بھی کرتے جاؤ ۔ جو اخلاقی سبق کو حسب موقع دوسروں کو بھی اس سے واقف کرتے رہو ۔ قوم میں اگر خرابیاں پاؤ تو اس کے انسداد کے لئے متوجہ ہوجاؤ ۔ طالب علمی کے زمانہ میں اپنے ضروری مشاغل کی انجام دہی کے بعد جو کچھ بھی وقت ملے کسی نہ کسی طرح کی ہمدردی کردیا کرو مثلاً کسی بیمار کی حتی المقدور تیمارداری کسی غریب و پریشان حال مصیبت زدہ کے ساتھ غمخواری ہمسایوں کے ساتھ نیک برتاؤ اور معاونت عزیز و اقارب کی حسب ضرورت کچھ نہ کچھ خدمت وغیرہ وغیرہ ۔

جب تعلیم سے فارغ ہوجاؤ تو اپنی تقریر و تحریر سے قوم کو فائدہ پہنچاتے رہو ۔ اگر کسی عہدہ سے تمہیں سرفرازی ہو تو اس نعمت کے شکریہ میں اس عہدے کے ذریعہ سے ملک و قوم کو جس قدر بھی فوائد پہنچا سکتے ہو پہنچاتے رہو اور مخلوق خدا کی کارا جرائی میں دریغ نہ کرو

بد و نیک مردم چو می بگزرند ۔ ہماں بہ کہ نامت بہ نیکی برند

عدل و انصاف کے ساتھ رحم و کرم کو اپنا پیشہ بناؤ ذاتی منفعت کو ملک و قوم کے نقصان پر ترجیح نہ دو بلکہ یہ سمجھو کہ ملک و قوم کا نقصان حقیقت میں اپنا نقصان ہے ۔ اگر تونگری نصیب ہو تو اپنی دولت کو صرف اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل میں صرف نہ کرو بلکہ اپنے

مال ومنال کے ذریعے غریبوں کی امداد کیا کرو اپنے پیسہ میں ان کا بھی حق سمجھو اگر اپنی لیاقت ودیانت کی وجہ سے مرجع خلائق ہو جاؤ تو ہر ایک کے ساتھ اخلاق ومروت سے پیش آتے رہو۔ ان مصیبتوں کی پروانہ کرو جو خدمت خلق میں پیش آیا کرتی ہیں بلکہ خدائے عزوجل کا شکر کرو کہ تم سے اپنے بندوں کی خدمت لے رہا ہے اور تم خیر الناس من ینفع الناس کے مصداق بن رہے ہو ؎

چوں بینی دعا گوے دولت ہزار — خداوند را شکرِ نعمت گزار
کہ چشم از تو دارند مردم بسے — نہ تو چشم داری بدستِ کسے

چونکہ تمہاری پر امن زندگی۔ عمدہ تعلیم۔ اور ملک کی تمام ترقیوں۔ قوم کی ہر قسم کی بہبودیوں کا دارومدار ظل اللہ بادشاہ ذیجاہ کی ذات ستودہ صفات پر ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ اپنے بادشاہ کے ساتھ جان نثاری ووفا شعاری کو اپنا مسلک بنائے رہو اور اپنے جان و مال کو اس کے لئے وقف خیال کرو اپنے ظاہر و باطن کو اس کی محبت وعقیدت کے لحاظ سے ایک رکھو اور خلوص دل کے ساتھ اس کی عمر و اقبال اور جاہ وجلال کی ترقی کے لئے دست بدعا رہو فقط

طریقہ تعلیم اردو (جماعت مڈل)

از مولوی شمس الحسن صاحب زبیری بی اے بی ٹی

ہمارے مدارس میں اردو کی طرف سے اکثر لاپروائی برتی جاتی ہے اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اردو طلبا کی مادری زبان ہے بلا کسی کی مدد کے پڑھی اور سمجھی جاسکتی ہے

اردو کا مادری زبان ہونا ہی اس کی اہمیت ثابت کرتا ہے اور اس کی جانب سے لاپروائی کرنے کی بجائے اس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی شخص کسی غیر زبان کے ادب سے اس وقت تک لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور نہ اس زبان سے کماحقہٗ واقف ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ اپنی مادری زبان میں اچھی قابلیت نہ رکھتا ہو مدرسہ کی زندگی میں ابتدا سے انتہا تک ہر مدرسہ کا فرض ہے کہ اردو کو اہم ترین مضمون خیال کرے۔ اپنی رائے کے مطابق تعلیم جماعت مڈل کے لئے میں ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتا ہوں۔

معلومات سابقہ چودہ سال کی عمر کو پہونچنے تک طلبار کو اپنے مافی الضمیر کو صحیح اردو میں اظہار کرنے کی کافی مہارت اور قابلیت حاصل ہو جانی چاہئے۔ وہ بسہولت بامحاورہ اردو بولنے اور لکھنے کے قابل ہو جائیں اور ان کی تحریر و تقریر دونوں سے یہ ظاہر ہو کہ وہ آسان اردو صحیح پڑھ سکتے ہیں سمجھ سکتے ہیں اور اس میں اظہار خیال کی قابلیت بھی رکھتے ہیں

مقصد چودہ سال کی عمر میں اردو پڑھانے کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ طلبا میں غور و خوض سے مطالعہ کرنے سوچنے اور ادب سے لطف اندوز ہونے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طلبار کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دی جائے اور مدرس محض نگرانی رکھے۔ مدرس ادب کے عمدہ نمونے طلبا کو پڑھ کر سنائے یہ اس طرح پڑھنے چاہیں کہ وہ خود متاثر معلوم ہو تاکہ طلبار پر بھی اس کا اثر پڑے۔ طلبا کے لطف اندوز ہونے کے بعد ان سے اس پر بحث و نکتہ چینی کرائی جائے۔ اگر مشکل الفاظ پیش آجائیں تو ان پر زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کا مفہوم اکثر محل استعمال سے نکل آتا ہے۔ طلبار کو ہدایت کی جائے کہ وہ پارہائے ادب کو افسانوں، مضامین، نظم و دیگر کتب سے خاموشی سے اور بآواز بلند پڑھیں۔ ان پر بھی جماعت میں طلبا کے نقطۂ نظر سے بحث و مباحثہ کیا جائے اور مدرس گاہے گاہے اشارہ دیتا رہے تاکہ بحث صحیح راستہ پر قائم رہے۔ افسانوں سے طلبار کے تخیل کو ترقی ہوگی۔ اردو کے مشہور اہل قلم کے مختلف

مضامین بھی طلبا، خاموشی سے اور بہ آواز بلند پڑھیں اور مدرس ان کی طرف زیادہ توجہ کرے ایک ہی بحث پر مختلف اہل قلم کے مضامین بھی طلباء کو پڑھنے چاہیں تاکہ انہیں ایک مسئلہ پر مختلف مشاہیر کے خیالات معلوم ہو جائیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو کہ ان لوگوں نے اس مسئلہ کو کس طرح پیش کیا اور وہ ان کی زندگی پر عملاً کیا اثر رکھتا ہے۔ مدرس و نیز طلباء مثالیں دے کر اس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔

نظم نظم ہمیشہ نثر سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ مدرس کو بمقابلہ نثر کے اس میں زیادہ احتیاط اور قابلیت کو کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ نظم اس طرح پڑھانی چاہیئے کہ اس کے ظاہری حسن کو قائم رکھتے ہوئے طلباء اس کا اصل مطلب اور مخفی نکات سمجھ جائیں مدرس کو محض وہ نظمیں منتخب کرنی چاہئیں۔ جو اپنی اپنی نوعیت میں مختلف ہوں مگر ان میں کام کی باتیں بھی ہوں۔ وہ نظمیں جن میں قصہ ہو یا اور کسی چیز کا مسلسل بیان ہو پوری کی پوری ایک ساتھ لینی چاہئیں یا خیالات کے اعتبار سے ایک ایک بند کر کے۔ ان نظموں سے جو خیالات طلبا حاصل کریں اپنی سلیس نثر میں لکھیں اور جماعت کے روبرو پڑھیں۔ پوری جماعت اس پر تنقید کرے۔

دوسری قسم کی نظموں کو (مثلاً غزل۔ قصیدہ) اس درجہ میں زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔ انہیں فوقانیہ جماعتوں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اس لئے کہ اس زینہ پر طلبا کی قوت متخیلہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور وہ زیادہ لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

مطالعہ زبان چیدہ چیدہ نظم و نثر کے ٹکڑے بچوں کے گہرے مطالعہ کے لئے مقرر کرنے چاہئیں مشکل الفاظ و محاورات کے لئے طلبا کو لغت دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیئے محاورات کو جملوں میں استعمال کر کے ان کے معنی کی وضاحت کی جائے اور ان کا محل استعمال سمجھایا جائے۔ مدرس جملوں کی نوعیت اور الفاظ کی مناسبت اور اہمیت سے بحث کرے کبھی کبھی مدرس الفاظ کی ترتیب بدل دے اور طلباء اس فرق پر غور کریں جو اس تبدیلی سے

معنی میں ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تاکہ طلبار کو معلوم ہو سکے کہ محض الفاظ کے ردو بدل سے جملہ کے معنی کیونکر بدل جاتے ہیں۔

طلبا کو نظم و نثر کے خاص خاص حصے زبانی یاد کرانے چاہئیں۔ یہ طویل نہ ہوں مگر ایسے ضرور ہوں کہ اپنے مفہوم پر پوری طرح حاوی ہوں۔ اس سے طلبا میں استعارات و کنایات وغیرہ کے سمجھنے کی قابلیت اور طرز بیان میں امتیاز کی قوت پیدا ہوگی۔

مضمون نگاری مضمون نگاری اس جماعت کے نصاب کا جزو ہونی چاہیے مگر اس درجہ پہونچکر وہ تخیل اور غور و خوض سے زیادہ کام لیں۔ مضمون نگاری کے لئے مدرس احتیاط سے مباحث منتخب کرے۔ بعض اوقات کسی بڑے اہل قلم کا مضمون پڑھکر طلبا کو سنایا جائے اور ان سے طرز بیان کی نقل کرنے کی فرمائش کی جائے تخیل کی تربیت کے لئے ان کو ناتمام افسانے دئے جائیں کہ تمام کریں۔ کبھی کبھی اشارات دیدئے جائیں کہ ان سے پورا قصہ مرتب کریں اور اپنی قوت بیان و تخیل کو پوری طرح کام میں لائیں۔ جو کچھ وہ کتاب سے پڑھ چکے ہوں اس کا خلاصہ لکھوایا جائے۔ جوابات لکھنے کے لئے سوالات دیدئے جائیں اور کتابوں کا حوالہ دے دیا جائے۔

ادب کا سمجھنا اور اس سے لطف اٹھانا ادبی ذوق اور اس سے لطف اندوز ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کسی خاص اسلوب بیان سے انسان کے دل میں ایک جوش پیدا ہو اور اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجائے اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مدرس نفس مضمون کا مطالعہ اس طریقہ سے کرے کہ خود اس پر وہ کیفیت طاری ہو جو بوقت تحریر مصنف پر تھی یا جو کیفیت وہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اسی پُرکیف طریقہ سے طلبا کو وہ مضمون پڑھ کر سنایا جائے۔ مدرس کی کامیابی اسی میں ہے کہ اس کے پڑھنے کے طرز سے طلبا متاثر ہوں اور یہ طرز اس قدر موثر ہو کہ اُن پر وہی کیف طاری ہوجائے۔ اس کے لئے وہ ماحول پیدا کرنا ضروری ہے جو اس کیفیت کے طاری کرنے میں موید بن سکے۔ ہم طلبا کو

کسی منظر کی تعریف پڑھاتے وقت اگر کوہ و دشت کی سیر نہیں کرا سکتے تو کم از کم سبق دینے سے قبل اس قسم کی تمہید ضرور بیان کر سکتے ہیں جو ان کے لئے وہ ماحول پیدا کر دے اور اپنے حرکات و سکنات سے انہیں ضرور متاثر کر سکتے ہیں۔ اس سے سبق میں دلچسپی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور ہمارا مقصد بھی پورا ہو سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ اصل سبق دیا جائے کوئی قصہ جو اس قسم کی کیفیت پیدا کر سکے یا کسی منظر کا دلچسپ حال بیان کیا جا سکتا ہے اس کے بعد طلبا کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ایسے جنگل، میدان یا مجمع میں تصور کریں جہاں کہ یہ واقعات رونما ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مدرس اصل سبق شروع کرے۔ ایک ہی منظر کے لئے مختلف اہل قلم کا کلام پیش کر کے اس کی خوبی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اب رہا سمجھنے کا سوال۔ اس کے لئے مدارج ماقبل کی ذہنی تربیت طلبا کی حساس طبیعت اور اس کا رجحان موید ہو سکتے ہیں علاوہ اس کے الفاظ پر قدرت اور عبور بھی ضروری ہے۔ ایک ہی مفہوم کے لئے مختلف الفاظ اور ان کا محل استعمال اور معنی کا اختلاف سمجھایا جا سکتا ہے۔ طلبا اگر لغت دیکھنے کے عادی ہو گئے ہوں تو اس سے بھی اُن کی معلومات میں وسعت ہوتی ہے اور حصول علم کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ مدرسین طلبا کی واقعی اور اصلی دقتوں کے دور کرنے میں ساعی رہیں۔ بے جا امداد بھی نقصان پہونچاتی اور بجا امداد سے گریز اس سے بھی زیادہ نقصان کا باعث ہو جاتا ہے۔ سبق دینے سے قبل مدرس کو تیاری کرنی چاہئے اور طلبا کے نقطۂ نظر سے یہ سوچنا چاہئے کہ اس میں کونسی باتیں انہیں بتائے جانے کے قابل ہیں۔ بتانے کے طریقے پر کافی غور کر لینے کے بعد وہ باتیں جماعت کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا طریقہ پر تعلیم دے کر ہم اپنے طلبا سے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبان (اردو) صحیح بولنے اور لکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس تصور پر

لکھا گیا ہے کہ اس درجہ پر پہونچنے سے قبل طلبا میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کی کافی مہارت پیدا ہو جاتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارا مروجہ طریقہ تعلیم اردو کو اس کا جائز حق نہیں دیتا۔ نیچی جماعتوں میں اردو کی تعلیم کم قابلیت رکھنے والے حضرات کے سپرد کر دی جاتی ہے یا بلا لحاظ استعداد طلبا کو اوپر کی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ٹمل جماعت میں پہونچنے کے وقت طلبا کا تلفظ بھی ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ عبارت بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے اور مدرس کو اپنا بیشتر وقت تلفظ درست کرنے، عبارت پڑھنے کی مشق کرانے اور پھر اس کو صفائی سے بیان کرانے میں صرف کرنا پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے جو کام اسے اس وقت کرنا چاہئے وہ اس سے معذور رہتا ہے۔

کنڈر گارٹن

سید پیر صاحب مدرس درگ چاگھاٹ ہائی اسکول

کنڈر گارٹن جرمنی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی "بچوں کا باغ" ہے یورپ کی زبانوں میں اس کے لئے متعدد الفاظ تجویز ہوئے۔ مثلاً انگریزی میں Playhouse, Paradise of children, Children's garden وغیرہ مگر عام قبولیت اسی جرمنی لفظ کو نصیب ہوئی۔ اردو میں بھی اس کے ترجمے کی کوشش کی گئی، مثلاً گلزار نونہال، بازیچہ اطفال، بالک باڑی، فردوس اطفال، حدیقۃ الصبیان وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جامعیت جرمنی

لفظ ہی میں مضمر ہے۔ یہ نام فروبل نے ۱۸۴۰ء میں تجویز کیا تھا۔ اس لفظ سے اصل مفہوم بخوبی واضح ہوتا ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ بچوں کے لئے سچ مچ پھول پھل والا باغ کوئی موجود ہے۔ بلکہ فروبل ہمیشہ بچوں کو پودوں سے، اسکول کو باغ سے اور استاد کو مالی سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اس لئے اس لفظ سے مراد ایک ایسی تعلیم گاہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مدرسہ میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے بچوں کے قوائے جسمانی و دماغی کی باقاعدہ اور تدریجی نشو نما ہو سکے۔

فروبل ملک جرمنی کے ایک قصبہ میں آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک مذہبی پیشوا کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ گو ان کے پیشرؤں نے بچوں کی ابتدائی طرز تعلیم کے ایجاد میں کافی حصہ لیا تھا مگر اصل کامیابی کا سہرا فروبل ہی کے سر رہا۔ اس خصوصیت سے فروبل اس فن اور طرز کے رفارمر ثابت ہوئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی کٹھن منزلوں کو انہوں نے جس طرح طے کیا وہ قابل حیرت ہے۔ اور اپنے ذاتی تجربوں کی بنا پر انہوں نے جو نتائج اخذ کئے اور جو تعلیمی اصول قرار دئے، آج دنیا کے متمدن اقوام ان سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اس لحاظ سے فروبل اس فن کے موجد بھی کہلائے جا سکتے ہیں۔ اپنی کتاب موسوم بہ "انسان کی تربیت" میں انہوں نے جن پاکیزہ علمی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بالکل انوکھے اور اچھوتے ہیں، جن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو تعلیمی میدان میں "اپنی زندگی اپنے بچوں کے لئے وقف ہے" کے مقولہ پر کاربند ہے۔ جس شخص میں اس طرز کے تحت تدریس و تربیت کا شوق محبت کے درجہ تک پہونچ گیا ہو اس کو زیادہ دقتیں اٹھانی نہیں پڑتیں، کیونکہ اس کا بڑھتا ہوا شوق ہی علمی میدان میں ہر طرح اس کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ خود بخود بچوں سے یہ سیکھتا ہے کہ بچے کس طریقہ سے سکھائے جانے کے لئے تیار ہیں۔ چند اصول اس طرز تعلیم کے ایسے بھی ہیں جو اپنے عمیق فلسفہ کی وجہ سے بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ مگر جن لوگوں نے ان اصول میں سے ایک کو بھی سمجھ لیا، وہ ایک جداگانہ اور نئے

طرز تعلیم کے موجد بن گئے۔ چنانچہ مانٹی سوری سسٹم، پلے ہنڈ، تیشد وغیرہ جو رائج ہیں اور ہو گئے اسی سرچشمہ سے سیراب ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ فروبل نے خود پیشگوئی کر دی تھی کہ اُن کی وفات کے دو صدیوں کے بعد ہی دنیا اس کے خیالات کو کماحقہ سمجھکر عمل پیرا ہو سکے گی۔

یہ ایک مبالغہ نہیں بلکہ امر حقیقی ہے کہ فروبل کے تعلیمی اصول نہ صرف بچوں کی تعلیم کے لئے مختص ہیں بلکہ عام تعلیم کے بھی ممد و موید ہیں۔ امریکہ میں آج تک ضروری ترمیمات کے باوجود بھی یہی اصول رائج ہیں۔ اور امریکہ کی قومیت پر اسی اصول کا زبردست اثر پڑا اور اسی ملک نے ان اصول کا پرزور استقبال کیا، ان کی حمایت کے لئے شہرۂ آفاق علما کو منتخب کیا گیا، جنھوں نے ان کی تبلیغ کے لئے اپنی عمریں صرف کر دیں اس ضمن میں ڈاکٹر ہارس، ادم گراس بولیٹ، بلو، ہارسن اور ہیوز کے نام قابل ذکر ہیں۔ جس اقلیم میں یہ طرز پیدا ہوا وہاں کے دماغ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے لیکن امریکہ نے اس کا نہایت فراخدلی سے استقبال کیا جہاں کی ذہانت، مستعدی، اور جدت پسندی نسبتاً ترقی پر تھی۔ آج اس کی ترویج ملک جاپان میں بھی ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں بظاہر کوئی خاص تعلیمی مقصد، ملکی مفاد کی بناء پر مقرر نہیں ہے اس لئے اصولِ کنڈرگارٹن کے خوشہ چینوں کو سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ باوجود ان دقتوں کے چند قابلِ قدر افراد ہندوستان میں، ایسے بھی موجود ہیں جو اپنی ان تھک کوششوں اور تجربوں سے اصول کنڈرگارٹن کو فروغ دے رہے ہیں امید ہے کہ وہ اپنی اس جد وجہد میں کامیاب ہو کر ملک کو ترقی دیں گے۔

طرز کنڈرگارٹن کا مقصد جیسے کہ فروبل نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ خردسالی کے زمانہ میں، یعنے مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے بچے کنڈرگارٹن میں داخل ہوں اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ بچے ایسے مشاغل میں معروف رکھے جائیں جو ان کی طبیعت کے مناسب ہوں اور ان کے جسموں کو توانا و مضبوط کریں، ان کے حواس کی پرداخت ہو قدرت اور سوسائیٹی کی باتوں کا بذریعہ ذہانت مطالعہ کیا جاے۔ اور خاص کر اُن کے

دل و دماغ کی نشو و نما ہو سکے، یعنے جس طرح یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے اسکول بمنزلہ پیش خیمہ کے متصور ہوتا ہے، اسی طرح اسکول کی تعلیم کے لئے کنڈر گارٹن متصور ہو، اس مقصد برآری کے لئے فروبل نے جن فلسفانہ طریقوں کو تجویز کیا ہے وہ قابل وقعت ہیں۔ خصوصاً ان کے مجوزہ "شغلے" "تحفے" اور کھیل ان کی زندگی کے کاوش، دریافتوں کا نتیجہ، اور نفسیات انسانی کے اصول پر مبنی ہیں۔ جس نے ان کے پوشیدہ فلسفہ کو سمجھا اور اس پر عمل کیا اسے تعلیمی دنیا میں بہترین فریضہ ادا کرنے کا فخر حاصل ہوا۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کنڈر گارٹن کی تعلیم سے بچوں کو کوئی نمایاں فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ بچوں کا وقت بہت ضائع ہوتا ہے یعنے نہ وہ کتاب کے اوراق کو فر فر پڑھ سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی پہاڑہ وغیرہ از بر ہے، ہاں، ان کا یہ اعتراض اس حد تک بجا ہے کہ کنڈر گارٹن میں ایسے کوئی رسمی اسباق کی تدریس نہیں ہو سکتی کنڈر گارٹن کے معلم کے پاس سبق نہیں بلکہ بچہ کی زندگی زیادہ اہم اور قابل احترام ہوتی ہے۔ وہ اس کو تو مدرسہ اور آیندہ زندگی کے لئے تیار کرتا ہے۔ وہ مناسب طریقوں پر اپنے طریقہ تعلیم کی اس طرح تراش خراش کرتا ہے جس سے بچہ خود بخود کھیل اور کام کے ذریعہ سے ایک خاص قانون کے تحت، ان گرانقدر قوا ر ذہنی کا اظہار اور ان کی نشو نما خود بخود کر سکے جو قدرت کاملہ کا عطیہ ہیں۔ بظاہر کنڈر گارٹن میں ایسے اسباق پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا، مگر یہ ایک حقیقی امر ہے کہ کل تعلیمی نصاب میں کنڈر گارٹن کا زمانہ ہی ایک ایسا زمانہ ہے جس میں بچہ مفید اور کثیر معلومات بالواسطہ اور بلا واسطہ حاصل کرتا ہے۔ مناسب کھیل اور شغلوں کے ذریعہ اس کے ہاتھوں میں وہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، جو آیندہ چلکر قلم کی گرفت اور اس کے موزوں استعمال کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتی ہے۔ لکڑی کے ٹکڑوں کے کھیل سے اعداد کا تصور بخوبی ہو جاتا ہے جس سے حساب میں مفید مدد ملتی ہے یا اشکالِ اقلیدس کے مشاہدہ سے آنکھوں کی مرکزیت

قائم ہوجاتی ہے جو بہت اہم ہے۔ گیتوں اور کہانیوں کے ذریعہ سے الفاظ کا ذخیرہ
بڑھتا جاتا ہے جس سے بچہ کے آیندہ اسباق سہل تر ہوجاتے ہیں۔ ان سب قواعد کے
علاوہ کنڈرگارٹن سیرت سازی کا گہوارہ ہے۔ آپس میں مل جل کر کھیلنے سے بھائی چارا
پیدا ہوجاتا ہے۔ میرا یہ خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کنڈرگارٹن کی
اسپرٹ قائم رکھکر تعلیم دی جائے تو ہماری آیندہ نسلوں سے اُن تمام اختلافات کی بیخ کنی
بآسانی ہوجائے گی جو آج ہندوستان کی ترقی میں حائل ہیں۔ میرے کنڈرگارٹن میں یہ
میں دیکھ رہا ہوں کہ سب بچے ایسے ملے جلے رہتے ہیں جیسے حقیقی بھائی۔ رلے بالمکند
آنجہانی ایک وقت تشریف فرمائے ہوے تھے۔ اتفاقاً میں کنڈرگارٹن کا بیونڈ کے
باہر چلا گیا تھا واپس آکر کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب موصوف بلا تکلف بچوں کے ساتھ
کھیل رہے ہیں۔ اور جوں ہی مجھے انہوں نے دیکھا امبار کباد دیتے ہوے فرمایا "
مولوی صاحب آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ ان معصوم بچوں میں اپنا وقت صرف
کرتے ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ اُس کے سب فرشتے یہیں آگئے ہیں" خیر میں تو ہنستا ہوا خاموش
رہ گیا مگر ایک بچہ نے جس کی عمر کچھ اوپر کم چھ سال کی ہوگی اور جو مجھے لپٹا ہوا گفتگو سن رہا تھا
فوراً رائے صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوے دریافت کیا "سر کیا یہ بھی فرشتہ ہیں" تو دوسرے
اور لڑکے نے اس کا جواب اُسی وقت یہ دیا کہ "ہاں یہ بڈھے فرشتہ ہیں" اس واقعہ سے
مجھے صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ بچوں کے اخلاق کے ساتھ ساتھ ان کا تخیل بھی ضرور بڑھتا
رہتا ہے۔ مشاہدہ قدرت کے ذریعہ بچہ بالراست قدرت کے طریقوں کا علم حاصل کرتا رہتا ہے
جس کو اصل مذہب اور مذہب کی تعلیم کا پہلا زینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک چھ سالہ
لڑکا اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کم ازکم اس نتیجہ پر ضرور پہونچ جاتا ہے کہ ایک زبردست طاقت
جس کو وہ دیکھ نہیں سکتا ہر لمحہ اور ہر جگہ اپنا کام کررہی ہے۔ وہی طاقت ہے جو نباتات کو
اگاتی ہے، پرندوں کو اڑاتی ہے مچھلی کو تراتی ہے اور خود کو دو پیروں پر چلاتی ہے وغیرہ وغیرہ

مختصر یہ کہ کنڈرگارٹن میں بچوں کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ یہاں عاقلانہ اصول پر اس فرض کی ادائی کی ابتدائی تربیت و تعلیم دی جاتی ہے جس کے لئے انسان دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔ یہ ایک چھوٹے پیانہ کی سوسائٹی ہے، اور اسٹیٹ بھی جہاں انہیں ان تمام ضروری منزلوں کو خوش آئینی کے ساتھ طے کرنا پڑتا ہے جس کے بعد وہ سوسائٹی اور ملک کے مفید افراد بن سکتے ہیں۔

مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان میں عموماً اس ابتدائی تعلیم کی طرف منصفانہ توجہ نہیں کی جاتی ہے۔ یہ منزل جس قدر اہم ہے اسی قدر غیر موزوں اشخاص کے سپرد کی گئی ہے۔ کیا مقتضائے انصاف بھی ہے کہ شاندار عمارت کی بنا، بیلداروں سے ڈالی جائے اور بڑے بڑے انجنیروں سے تکمیل عمارت کی جائے۔ اور امید یہ رکھی جائے کہ شاندار عمارت منہدم نہ ہونے پائے۔ معلم کی ذہانت کی اگر کہیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو ایسی ابتدائی تعلیم میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسی تعلیم کا اثر بقیہ حصۂ عمر سے وابستہ رہتا ہے کنڈرگارٹن ہی وہ جگہ ہے جہاں زمانہ اور ملک کی ضروریات کے مدنظر افراد بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک نیک فال ہے کہ تعلیمات دولتِ آصفیہ پہلے پہل اس نقص سے آگاہ ہو کر بچوں کی ابتدائی تعلیم میں کافی دلچسپی لے رہی ہے۔ اور آلات تعلیمی کے لئے زر کثیر صرف کیا جا رہا ہے بلکی سالح اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر طرز تعلیم اطفال میں مناسب ترمیمات کر رہے ہیں۔ نفسیات اطفال کے اصول پر کتب شائع ہو رہی ہیں۔ ایک نفیس بچوں کا قاعدہ بھی چھپ چکا ہے کسی نے چھوٹے بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھدی ہیں۔ اور میں نے سنا ہے کہ ایک صاحب نے کنڈرگارٹن کے طرز تعلیم کی کتاب کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے جس کو ایک ماہر فن نے انگریزی میں تالیف کیا تھا۔ جاپان کی تعلیمی تنظیم کا اردو ترجمہ ہو گیا ہے جس سے اس شعبہ کو گرانقدر مدد ملتی ہے الحاصل یہ چہل پہل یقین دلاتی ہے کہ وہ زمانہ

بہت دور نہیں کہ ملک میں ایک زبردست تعلیمی انقلاب ہوگا جو ملک کے حق میں ابر رحمت ثابت ہوگا اور جس سے ملک ترقی کرے گا

کلاسکل زبانوں (السنہ قدیم) کی اہمیت

خطبہ صدارت از اے سی وولنر سی آئی ای ایم اے پرنسپل اورنٹل کالج لاہور جو پنجاب کی تعلیمی کانفرنس میں پڑھا گیا

(مترجمہ مولوی اللہ بخش صاحب بی اے مددگار دار العلوم بلدہ)

غالباً ہر ایک شعبے کے صدر نشین نے کانفرنس میں اپنے اپنے شعبے کی سب سے زیادہ اہمیت ظاہر کی ہے لیکن میں نے کلاسیکل زبانوں کے شعبے کی اہمیت پر جن وجوہ کی بنا پر زور دیا ہے وہ صرف یہی نہیں کہ یہ بحث ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے بلکہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم میں جس قدر مباحث داخل ہیں ان سب کی تعلیمی مشکلات کو رفع کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی ہے اور صرف یہی ایک بحث ایسا ہے جو سب سے زیادہ اصلاح کا محتاج ہے۔

کلاسیکل زبانوں کی اہمیت اُن قواعد وضوابط سے صاف صاف ظاہر ہے جن کی رو سے وہ انٹرمیڈیٹ کے طبقہ تک فنون کے شعبوں میں لازمی قرار دی گئی ہیں لیکن دیگر امور دنیاوی کے لحاظ سے جن میں مالی فوائد بھی شامل ہیں ہر ایک شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کلاسیکل زبانوں کو مطلق اہمیت حاصل نہیں۔

کلاسیکل زبان تعلیم میں کیوں لازمی قرار دی گئی ہے؟ بیشک بہت سے افراد ایسے ملیں گے جو یہ خیال رکھتے ہوں گے کہ ایسا نہ ہونا چاہیے۔ بعض افراد بجائے اس کے

کسی جدید ہندوستانی زبان کو تعلیم میں داخل کرنا پسند کریں گے۔ لیکن میرے خیال میں وہ غلطی پر ہیں۔ کوئی جدید زبان اس وقت تک ایک کلاسیکل زبان کی جگہ حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ خود ایک کلاسیکل زبان کا درجہ نہ حاصل کرلے میں خود آیندہ سطور میں کلاسیکل زبان کی اہمیت کو وضاحت سے بیان کرنے والا ہوں لیکن فی الوقت میں آپ کے روبرو یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ کلاسیکل زبان کے لازمی قرار دینے کی کیا وجہ ہے۔ اس سوال کی دو طریقوں پر وضاحت ہو سکتی ہے اوّل تو یہ کہ لاطینی اور یونانی زبانیں یورپ میں لازمی قرار دی گئی ہیں جب ہندوستان میں مغربی تعلیم رائج کی گئی تو لاطینی اور یونانی زبانوں کو ہندوستانیوں کے لیئے لازمی قرار دینا ایک فضول اور بیکار بات ہوتی لیکن اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی نہ کوئی زبان ضرور اس کے معاوضہ میں رکھی جائے لہٰذا مشرقی کلاسیکل زبانیں بجائے لاطینی اور یونانی زبانوں کے تعلیم میں داخل کی گئیں۔ یہ وجہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھی جاسکتی جب تک ہم اس امر کو اچھی طرح نہ ثابت کردیں کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کو لازمی قرار دینے کی کیا وجہ تھی اور نیز یہ نہ بتلادیں کہ جو اصول ان زبانوں کو لازمی قرار دینے میں مدنظر رکھے گئے ہیں وہی اصول پنجاب میں بھی مفید خیال کئے جاسکتے ہیں۔

دوئم ہر ایک طالب علم کے لئے اپنی مذہبی کتاب کی زبان جاننا ضروری ہے لیکن اگر یہی وجہ قرار دی جائے تو یہ ضرورت ایک عمدہ ترجمہ سے بھی پوری ہو سکتی ہے واقعی کتنے ایسے ہندو ہیں جو سنسکرت جانتے ہیں کتنے عیسائی عبرانی سریانی یا یونانی زبانوں سے واقف ہیں۔ کتنے مسلمان ہیں جو عربی پڑھ سکتے ہیں۔ فارسی اور لاطینی کسی صحیفہ آسمانی کی زبانیں نہیں ہیں گو یہ اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں لیکن پھر بھی جو وجوہ اوپر بیان کئے گئے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور پائی جاتی ہے۔

یونانی اور لاطینی زبانیں یورپ کی ان دو با لامتیاز متمدن قوموں کی زبانیں

رہ چکی ہیں جن کے تمدن پر یورپ کے موجودہ تمدن کی بنا رکھی گئی ہے! اس میں شک نہیں کہ یورپ کے تمدن پر علاوہ ان کے اور دوسری چیزوں مثلاً تورات کی زبان ہونے کی حیثیت سے عبرانی زبان اور نیز ان مشرقی خیالات کا بھی اثر پڑا جو نشاۃ ثانیہ اور علوم وفنون کے دور جدید سے پہلے رائج تھے لیکن حقیقی طور پر یورپ کا تمدن یونانی اور لاطینی لٹریچر کا مرہون احسان ہے

میں بالکل مختصر طور پر ان دونوں زبانوں کی تاریخ بیان کرنی چاہتا ہوں ۔ یونانی اُن آریا حملہ آوروں کی زبان ہے جو جزائر بحیرہ ایجین اور اطراف واکناف کے ان مقامات میں آباد تھے جو اُن سے بھی ایک قدیم تمدن کے مرکز سمجھے جاتے تھے ۔ اُن قدیم باشندوں کے ساتھ جن کی میخی تحریر پڑھی نہیں جاسکتی ان نوواردوں کے خلط ملط ہونے سے ایک ایسی قوم پیدا ہوئی جنہوں نے ایک حیرت انگیز فن مصوری اور لٹریچر کو درجہ کمال پر پہونچا دیا ۔ اس لٹریچر کی سب سے پہلی تصنیف یعنے ہومر کی نظمیں ایشیائے کوچک کے سواحل پر آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے اشاعت پاچکی تھیں یہ عظیم الشان رزمیہ نظمیں یعنے "ایلیڈ اور اوڈیسی" کسی ایک شاعر کی فکر کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ اُن سطرب شعرا کے ذریعے سے تکمیل کو پہونچیں جو نسلاً بعد نسلٍ گروہ بن بن کر امیروں کے گھروں پر سے گذرتے اور ان کو وہ اشعار گا گا کر سنایا کرتے تھے جن میں ان کے آبا و اجداد کے کارناموں کا ذکر ہوا کرتا تھا ۔ ہر نسل میں یا تو ان نظموں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا یا ترتیب و زبان میں تبدیلی ہوتی گئی یہاں تک کہ ایک خاص نسخہ مشخص کر دیا گیا ۔

نظم اور ڈراما کی ابتدا جن کو شہر ایتھنس کے نام کے ساتھ گہرا تعلق حاصل ہے اس جنگ عظیم کے زمانے میں ہوئی جب کہ یونانیوں نے ایشیا کی حکومت کا جوا اتار پھینکا اور خودمختاری حاصل کر لی تھی ۔ فلسفۂ یورپ کی ابتدا بھی اسی زبان یونانی سے ہوئی جو ایک نچلی نہ بیٹھنے والی اور آزاد مشرب قوم کی زبان تھی ۔ یونانی فلسفہ افلاطون

اور ارسطاطالیس کے زمانے میں درجۂ کمال کو پہونچ گیا تھا اور اس میں مزید اضافہ اور ترمیم و اصلاح کئی صدیوں کے بعد عمل میں آئی۔

جبکہ بحیرۂ روم کا کل علاقہ سلطنت روما کے تصرف میں آگیا تو اُس وقت یونانی زبان سلطنت روما کے نصف مشرقی حصے کی دفتری زبان بن گئی تھی ایشیائے کوچک اور مصر کے ایک رومی حاکم کو جس کا نام سسرو تھا اپنے کل کاروبار یونانی زبان ہی میں انجام دینے پڑتے تھے۔ توراۃ جدید بھی یونانی زبان میں مرتب کی گئی تھی جبکہ سلطنت روما کے دو حصے ہوگئے اور قسطنطنیہ مشرقی سلطنت کا دارالسلطنۃ قرار دیا گیا تو وہاں کی زبان بھی یونانی تھی اور لاطینی زبان کو قانون روما کی زبان کی حیثیت سے رواج دینے میں سخت ناکامی ہوئی۔ قسطنطنیہ میں اس وقت تک بھی جبکہ ترکوں نے اس کو فتح کرلیا تھا یونانی زبان بولی جاتی تھی۔ موجودہ یونانی اخبار کی زبان بناوٹ اور لغات کے اعتبار سے پیراکلس کے زمانے کی مروجہ بولی یا توراۃ جدید کی زبان سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتی اگرچہ آج کل کی مروجہ یونانی زبان میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے لیکن پندرہ سو سال کے عرصہ سے اس میں کوئی نمایاں اور معرکتہ الآرا تصنیف ظہور میں نہیں آئی۔ یونانیوں نے ادبیات کی شغل رومیوں کے حوالے کر کے ان کو تو نظم و بلاغت کے فن کا ماہر کر دیا اور خود دینیات کے فروعی مسائل کی موشگافیوں میں مصروف ہوگئے۔

لاطینی زبان کی تاریخ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ اصل میں لاٹیم کی جو دریائے ٹائبر کے جنوب میں واقع تھا دیہاتی زبان تھی۔ دریائے ٹائبر کے بائیں کنارے معمولی بلندی کی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا جس پر متعدد دیہات کا ایک چھوٹا سا مجموعہ واقع تھا جو شاید دریا کے اُس پار قوم یوٹرسکن کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کے لئے زیادہ کئے گئے تھے۔ یوٹرسکن عجیب و غریب لوگ تھے اُن کی زبان بھی عجیب تھی

جو لاٹیم کے باشندوں کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ یقیناً وہ ایشیا سے آئے تھے ہر حیثیت سے ان کا مادی تمدن بہ نسبت لاطینی چرواہوں اور کاشتکاروں کے زیادہ ترقی یافتہ تھا جیسا جیسا زمانہ گذرتا گیا یوٹرسکن لوگوں نے دریائے ٹائبر کو عبور کرلیا اور روما کی پہاڑیوں پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام ان کی قوم کے نام سے ملتا جلتا تھا۔ یہ نیا شہر شمالی یوٹرسکن شہروں اور جنوبی یونانی شہروں کے درمیان واقع تھا۔ ندی کے نیچے اور براہ سمندر کارتھیج کے ساتھ بھی ان کا سلسلہ رسل و رسائل قائم تھا۔ یوٹرسکن اطالیہ کے سب سے پہلے اور بڑے انجنیر تھے جنہوں نے دلدلوں میں نالیاں نکلوائیں جنگلوں کو صاف کروایا اور سڑکیں اور شہر بنوائے جن باتوں کو ہم رومیوں کے تمدن کی خصوصیات خیال کرتے ہیں اور بعض لوگوں کے خیال کے مطابق رومیوں کی عادات و اطوار کے درشت خصائص انہیں قدیم لوگوں سے نسبت رکھتے ہیں آخر کار قوم یوٹرسکن کی قوت کا زوال شروع ہو گیا۔ جنوبی اطالیہ میں انہوں نے یونانیوں کے مقابلے میں شکست پائی اور روما کو چھوڑ دیا۔

نیا لاطینی شہر جو قوم یوٹرسکن کی حکومت میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا (یہ نہیں معلوم کہ زبان پر کس قدر اثر پڑا) طول و طویل معرکہ ہائے کارزار میں مصروف ہو گیا جن میں وہ کبھی اپنی بقا کے لئے معرکہ آرا نظر آتا اور کبھی حرص و آز اور وحشیانہ غیظ و غضب کے جوش میں اپنے رقبۂ حکومت کو وسعت دینے میں کوشاں دکھائی دیتا تھا لاٹیم۔ یوٹرسکن۔ یونانی دیگر اطالوی قبائل۔ شمالی اطالیہ کے کلٹ اقوام۔ فرانس اور برطانیہ۔ ہسپانیہ کے آئیبریں لوگ کارتھیج شمالی افریقہ کی بربری قومیں سب نے شکست پائی اور ان تمام فتوحات کے بعد رومی آبادی۔ رومی قانون۔ رومی فنون اور لاطینی زبان کا دور دورہ شروع ہو گیا لاطینی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو صرف مشرق میں یونانی زبان نے اور شمال میں وحشی قبائل کی جرمن بولیوں نے روک دیا

برطانیہ اور افریقہ نے دوسری زبانیں اختیار کرلیں لیکن اس وسیع رقبے کے بقیہ حصہ میں اب بھی وہی زبانیں بولی جاتی ہیں جو لاطینی زبان سے نکلی ہیں۔

اگرچہ ادبیات میں روما کو ایتھنس سے تلمذ حاصل تھا لیکن اس نے نظم و نثر میں ضبط و تنظیم پیدا کر کے اپنی ایک جداگانہ خصوصیت قائم کرلی جو رومیوں کے عادات و خصائل کو نمایاں کر کے دکھاتی ہے۔ جمہوریتہ کی آخری اور خود مختارانہ حکومت کی پہلی صدی میں روما نے شاندار لٹریچر پیدا کیا۔ لاطینی مغربی یورپ کی دفتری زبان ہوگئی اور اس کے بعد مغرب میں مسیحیت کی زبان قرار دی گئی جو اس وقت بھی کلیسائے روم میں رائج ہے۔ مختلف ممالک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں رسل و رسائل کا وسیلہ بن گئی اور کئی صدیوں تک مغربی یورپ میں یہی زبان تعلیم و تعلم کا وسیلہ بنی رہی چند ہی صدیاں ہوئیں کہ فرانسیسی اور انگریزی یونیورسٹیوں میں بجائے لاطینی کے ذریعہ تعلیم قرار دی گئی ہیں نیوٹن کا مشہور رسالہ لاطینی زبان میں ہی ہے اگرچہ موجودہ زمانے تک بھی علما و فضلا لاطینی زبان کو استعمال کرتے ہیں لیکن جب سے جدید زبانوں نے ترقی پائی ہے کوئی شاندار لٹریچر اس زبان میں پیدا نہیں ہوا۔

اس مختصر خاکے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یورپ کے خیالات کس حد تک یونانی و لاطینی زبان کے مرہون احسان ہیں۔ واقعات ہم کو بتلاتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں نے مسیحیت کی تاریخ میں بھی ایک بڑا حصہ لیا۔ اب لاطینی اور یونانی زبانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کلاسیکل زبان سے ہمارا کیا مطلب ہے۔ ابتدائی زمانے میں ایک کلاسک مصنف (اسکرپٹر کلاسکس) اول درجے کا مصنف اور انشا پرداز خیال کیا جاتا تھا۔ "کلاسکس" سے ادبیات یونان و روما کی منتخب اور بہترین تصانیف مراد لی جاتی تھیں۔ اب یہ اصطلاح کسی قدر وسیع معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ادبیات کی ترقی و توسیع کے

زمانے میں ایک "زرین دور" شروع ہوتا ہے یہ وہ دور ہے جس میں کوئی خاص زبان اور کسی خاص تمدن کے ادائے مطالب و اظہار خیالات کے ذریعے معراج کمال کو پہونچ جاتے ہیں خود زبان ایک انتہائی ترقی حاصل کر لیتی ہے اور اس زبان کا لٹریچر نہایت ہی مکمل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک قلیل مدت میں ایسی انتہائی ترقی کی ایک یا دو موجیں پیدا ہوتی ہیں پھر اس کے بعد ایک نقرئی دور آتا ہے جس میں طرز تحریر اور اسلوب بیان تو بدلا ہوا نظر آتا ہے لیکن کوئی زیادہ جدت کا اظہار نہیں ہوتا اور پھر آخر میں تنزل و انحطاط کا ایک طولانی دور شروع ہو جاتا ہے۔ وہ زبان جس کا لٹریچر اعلیٰ ترین درجہ پر پہونچ گیا اور تازہ و جدید لٹریچر پر تفوق و برتری رکھتا ہو کلاسیکل زبان کہلاتی ہے اس معیار سے دیکھا جائے تو فارسی کلاسیکل زبان ہے اور مجھے اس امر پر یقین ہے کہ فرانسیسی بھی کلاسیکل زبان بن چکی ہے اور وہ زمانہ بالکل قریب ہے کہ انگریزی بھی کلاسیکل زبان کا درجہ حاصل کرے۔

اب ہم کو اپنی خاص تینوں کلاسیکل زبانوں کے بحث طلب مسائل کی طرف توجہ کرنی چاہئے لیکن ان پر بحث کرنے سے قبل میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ یورپ میں کلاسیکل زبان کی تعلیم کس طریقہ پر دینی چاہئے ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر دور جدید علوم و فنون" کے زمانے سے اب تک تقریباً چار سو سال سے ہر ایک صدی میں بہتر سے بہتر دماغ غور کرتے رہے ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں راجر آشام اس امر کی شد و مد سے تبلیغ کر رہا تھا کہ لاطینی زبان کی تعلیم ترجمہ کے ذریعے سے دی جائے اور بہت جلد اس میں بات چیت شروع کرا دینے کے طریقے کا سخت مخالف تھا۔ ملٹن محض تقریری مہارت کو لغو خیال کرتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں کلاسیکل اسوسی ایشن قائم کی گئی جس کا ایک مقصد کلاسیکل زبانوں کی تحصیل کے بارے میں پبلک کو اس امر کی جانب توجہ دلانا تھا کہ قومی تعلیم کے نظام العمل میں کلاسیکل تعلیم کی قدر و قیمت اور اہمیت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے اور دوسرا

مقصد یہ تھا کہ کلاسیکل زبانوں کے طرز تعلیم اور فوائد کے بارے میں آزادانہ بحث و مباحثے کے ذریعہ کلاسیکل تعلیم کے رواج کو ترقی دی جائے۔

کلاسیکل زبان کا معلم کس امر کی کوشش کر رہا ہے اور اس کے مطمح نظر کونسا مقصد ہے

ان سوالات کا جواب چار مختلف مدارج تعلیم پر ترتیب دیا جا سکتا ہے جو ذیل میں درج کئے گئے ہیں۔ درجہ اول۔ سب میں ادنی درجہ ہے جس میں صرف یہی مقصد پیش نظر رکھا جائے کہ کم سے کم محنت میں بہترین سے بہترین نتائج امتحان برآمد ہو سکیں یا کم عمر پنجابی لڑکوں کے دماغ میں صرف اسی قدر مردہ زبان کا ذخیرہ بھر دیا جائے کہ وہ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کر سکیں دوسرا درجہ وہ ہے جس میں کلاسیکل زبانوں کے نصاب سے بہترین طریقے پر کام لینے کی کوشش کی جائے یعنے تکمیل نصاب کے ساتھ ساتھ طالب علم کی ذہنی ترتیب کا بھی خیال رکھا جائے یا قواعد زبان کے اصول کا استعمال اس طریقہ پر کروایا جائے کہ اچھی خاصی دماغی ورزش کا کام دے سکے۔

تیسرا درجہ وہ ہے جس میں کلاسیکل زبانیں نہ صرف لازمی قرار دی جائیں بلکہ ان کی قدر و قیمت اور اہمیت بھی تسلیم کی جائے اور طالب علم کو ایک ایسے طریقہ تعلیم کی ترغیب دی جائے جس سے اس کے ذہن میں جودت اور فہم میں ترقی ہو اور مضمون زیر تعلیم کے متعلق اس کے دل میں ایک ایسی امنگ پیدا ہو جو اس کو خود بخود آگے بڑھنے پر آمادہ کر دے اور شاید عجب نہیں کہ وہ بھی آگے چلکر ہماری طرح ایک معلم بن جائے۔

چوتھا درجہ سب سے اعلیٰ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کلاسیکل زبان کے نصاب کو تعلیم۔ عادات و اطوار کی درستی۔ اور قوت فیصلہ و تخیلہ کی ترتیب کا مرکز بنا دیا جائے متعدد میں اعلیٰ و ارفع خیالات کے ذریعہ کمسن لڑکوں کے دماغوں میں کچھ نہ کچھ زمانہ گذشتہ کی دانشمندی کا ذخیرہ بھر دیا جائے تاکہ موجودہ زمانے کے لڑکے زمانۂ سلف سے دلچسپی لینے لگیں۔ اور ان کے دل وطن کی پاک اور گہری محبت کے جذبے سے معمور ہو جائیں۔

کلاسیکل زبان کا جدید زبان پر اچھا اثر مترتب ہو اور وہ قدیم زبان کے مغلق اور دقیانوسی لغات سے ثقیل اور عسیر الفہم نہ بننے پائے ۔ قدیم روایات میں جو قیمتی سرمایہ ہے اس میں تازہ روح پھونکی جائے اور اس کو جدید پیرائے میں منتقل کر لیا جائے ۔ خاص کر شعبہ علوم و فنون میں کلاسیکل تعلیم سے اس طریقے پر کام لیا جائے کہ طبقۂ اناث و ذکور میں زبردست اور قابل مورخین و ماہرین آثار قدیمہ ۔ علمائے علم اللسان ۔ فلاسفر و سیاست داں و نیز شاعر و انشا پرداز پیدا ہوں ۔

یہ چاروں مدارج چار مختلف قسم کے معلمین کی جانب منسوب ہو سکتے ہیں جن کی ترتیب حسب ذیل ہے ۔

قسم اول ۔ کام چور

قسم دوم ۔ قواعد داں ۔

قسم سوم ۔ فاضل مدرس یا پروفیسر

قسم چہارم ۔ محقق عالم یا مافوق الفطرت دماغ رکھنے والے ۔

ادنیٰ ترین درجہ کو نظر انداز کر کے ہم صرف دوسرے یا تیسرے درجہ ہی سے بحث کریں گے اور ہماری عملی تجاویز کا تعلق انہیں سے ہوگا لیکن اپنی تجاویز کو معرض بحث میں لانے سے پہلے ہم یہ بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ تینوں زبانیں جن سے ہمارا مضمون متعلق ہے بلحاظ بناوٹ بلحاظ تاریخ اور اس تعلق کے لحاظ سے جو اُن کو ہندوستان کے ساتھ ہے آپس میں اہم اور ضروری اختلافات رکھتی ہیں ۔ سنسکرت ایک نہایت ہی قدیم زبان ہے اور ایک وسیع لٹریچر کی مالک ہے ۔ یونانی اور لاطینی کی طرح مکمل صرف و نحو رکھتی ہے اور ادائے مطالب پر اس قدر قادر ہے کہ جو مطلب ہندی اور انگریزی کے کئی لفظوں میں ادا ہوتا ہے اس کے ایک لفظ میں ادا ہو سکتا ہے ۔ اس کی صرف و نحو پیچیدہ ہے جس کا سیکھنا آسان نہیں ہے ۔ اس زبان میں بڑے بڑے مرکب الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۔ جن کا ترجمہ ہندی یا

یا انگریزی میں کیا جائے تو ہر مرکب لفظ کی تشریح کے لئے کئی جملوں کی ضرورت ہو گی
ایک لفظ کا آخری جز دوسرے لفظ کے ابتدائی جز کی مطابقت سے بدل جایا کرتا ہے
مبتدی اس امر کے پہچاننے میں سخت پریشان ہوجاتا ہے کہ ایک لفظ کہاں ختم ہوا
اور دوسرا کہاں شروع ہوا۔ ادبی زبان بول چال کی زبان سے بالکل مختلف ہے غرض کہ
اس زبان کی ابتدائی دقتیں دوسری زبانوں سے بڑھی چڑھی ہیں۔ تاریخی لحاظ سے سنسکرت
کی ابتدا (بشمول زبان جدید زمانۂ رگ وید یعنے ۱۵۰۰ ق۔م۔ یا اس سے بھی پہلے کے زمانے سے
ہوئی اور اسی زمانے کی زبان بناوٹ کے لحاظ سے ہندی یورپین سے ملتی جلتی نظر آتی ہے
جو ان زبانوں کے بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو آئس لینڈ سے لیکر لنکا تک رائج ہیں
انگریزی۔ المانی۔ روسی۔ یونانی۔ لاطینی فارسی وغیرہ سنسکرت سے نہیں بلکہ اسی
ماخذ سے نکلی ہیں جس سے سنسکرت نکلی ہے بعد میں چلکر سنسکرت کی قواعد میں کسی قدر اضافہ
تو ہوگیا لیکن آسانی نہیں پیدا ہوئی کچھ تو نئے نئے مشتقات کے وضع کئے جانے اور کچھ
بیرونی اثرات کے زبان میں داخل ہوجانے کی وجہ سے لغات میں معتد بہ ترقی ہوگئی۔ جب
گوتم بدھ کا زمانہ آیا تو اس زبان کا رواج جاتا رہا اور تیسری صدی ق۔م میں تو یہ ایسی مفقود
ہوگئی کہ شہنشاہ اشوک کے کتبات میں ہم کو ڈھونڈے سے بھی کوئی سنسکرت جملہ نہیں مل سکتا۔
بودھ اور جین مت کی قدیم مذہبی کتب پالی اور آردھامگدھی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ گو یہ
دونوں زبانیں سنسکرت نہیں ہیں تاہم اس سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ بعد میں چلکر
ہندوستان میں بودھ مت کے ایک گروہ نے سنسکرت زبان اختیار کرلی۔ بادشاہ
کنشک کے زمانے میں آسواگوش نامی عالم نے متعدد ڈرامے اور بودھ کے واقعات زندگی
سنسکرت میں لکھے تھے جس میں اس نے نہایت اعلیٰ انشا پردازی کا زور دکھایا تھا۔
رودرادمن جو دوسری صدی میں مغربی ہندوستان میں حکومت کرتا تھا ہمارے لئے خالص
سنسکرت میں کتبے چھوڑ گیا ہے۔ خاندان گپت کا زمانہ سنسکرت ادب کا زرین زمانہ ہے

جس میں راجہ ہرشس کا عہد سلطنت بھی شامل ہے اس زمانے میں اور اس کے صدیوں بعد بھی سنسکرت کی ادبیات میں معتدبہ ترقی ہوتی رہی اور بہت سی از بر نظمیں۔ پورانین۔ قانونی کتب وغیرہ لکھی گئیں اور سنسکرت ادبیات کے بڑے بڑے مصنفین نے اسی عہد زرین میں شہرت حاصل کی۔

سنسکرت تصنیف وتالیف کا سلسلہ اس وقت تک بھی جاری رہا جب کہ شمالی سلطنتیں مسلمانوں کے قبضے میں آگئیں جو مغرب سے آئے تھے۔ رگ وید کی معتبر شرح چودھویں صدی میں لکھی گئی۔ جنوبی ہند میں ادبی لحاظ سے یہ بڑی ترقی اور عروج کا زمانہ تھا اگرچہ کل کے کل واقعات مطابقت نہیں رکھتے تاہم کم سے کم چودھویں صدی تک سنسکرت کی تاریخ کو تاریخ ہند کا آئینہ سمجھنا چاہیئے۔ اب تک بھی سنسکرت کو ہندوستان کی قدیم تہذیب سے ربط وتعلق حاصل ہے اور اب تک بھی وہ ہندوستانی زندگی کی ہر بات میں دخل رکھتی ہے

فارسی سنسکرت کی چھوٹی بہن ہے۔ وہ دارائے اعظم کی زبان یعنے قدیم فارسی سے نکلی ہے۔ قدیم فارسی زرتشت کی مستعمل زبان یعنے اوستا کی بہن اور دور ساسانی کی فارسیٔ متوسط کی ماں ہے۔ جدید فارسی کی ابتدا سنہ ۱۰۰۰ئ سے ہوئی جس کا پہلا ادبی نمونہ فردوسی کے قلم سے معرض ظہور میں آیا۔ فارسی جدید کے ادب کی ابتدا ایران میں عربی زبان کی روک تھام کی غرض سے ہوئی جو ادبی اغراض کے لئے عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔ فارسی شاہی درباروں اور ایران ووسط ایشیا ونیز شمالی ہندوستان کے مہذب وتعلیم یافتہ طبقہ کی زبان بن گئی۔ ایران میں اکثر الحاد یعنے آزاد خیالی کی گرم بازاری رہی ہے جس کی وجہ سے فارسی ایک آزادانہ فلسفہ کے اظہار کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اور اب تک بھی ہے۔ ہندوستان میں فارسی ایک جداگانہ تہذیب اور جداگانہ طرز معاشرت کا نمونہ نظر آتی ہے جو اسلامی علوم کا ذریعہ تعلیم بنی رہی جس میں نہ صرف راسخ الاعتقادی اور مذہبی تعصب سے بھرے ہوئے اصول کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ آزاد اور غیر متعصبانہ خیالات بھی

کام لیا گیا ہے جو ایک جانب ہندی اور دوسری جانب یونانی فلسفہ کے اثرات سے لبریز نظر آتے ہیں۔ ایران کی اس نئی زبان کے ساتھ ہندوستانی سنسکرت کی آمیزش سے ایسے نتائج پیدا ہوئے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس آمیزش کا اثر کبیر وغیرہ شعرا کے کلام اور جدید مذہبی تحریک سے ظاہر ہوتا ہے۔ قدیم کتب نصاب سے دوبارہ دلچسپی اسی آمیزش کا اثر ہے یہ تمام باتیں ہم کو ان جدید خیالات و تحریکات کو یاد دلاتی ہیں جو مغربی یورپ کی جدید تہذیب اور خیالات کے میل جول سے پیدا ہوئیں۔

جس فارسی کی اب تعلیم دی جاتی ہے وہ بالکل جدید ہے قدیم فارسی اور اوستا کی تعلیم ہمارے مدارس اور کالجوں میں مفقود ہے۔ جدید فارسی کی قواعد آسان ہے اور ہم اس کو بول چال کے ذریعہ بہ نسبت سنسکرت کی قواعد کے زیادہ آسانی کے ساتھ سیکھ سکتے ہیں اگرچہ طرز تحریر فصیح اور بلیغ اور صنائع و بدائع سے مملو ہے تاہم مستعملہ زبان کی بناوٹ روزمرہ کی زبان سے زیادہ مغائرت نہیں رکھتی۔ نیز لغات کا ایک بڑا ذخیرہ ایسا ہے جس سے اردو بولنے والے واقفیت رکھتے ہیں۔ جب پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد قائم ہوئی تو اس مسئلہ پر کہ آیا فارسی کلاسیکل زبان ہے یا جدید زبان بڑی بحث ہوتی رہی میں نے ابھی ابھی اوپر بیان کر دیا ہے کہ فرانسیسی اور انگریزی کے مانند اس کا اطلاق کلاسیکل اور جدید دونوں زبانوں پر ہو سکتا ہے۔

فارسی سے واقفیت پیدا کرنا ہندوستان کی تیرھویں صدی کی تاریخ اور ملکی ترقی کے سمجھنے کے لئے ہر حالت میں ضروری ہے۔ اردو زبان کا ضروری اور اہم عنصر ہونے کے علاوہ اس نے ہندوستان کی دیگر زبانوں پر بھی اپنا بہت کچھ اثر ڈالا ہے یہی وہ زبان ہے جو اب تک ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ افغانستان کے تعلیم یافتہ لوگ اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں جہاں سے اس کا استعمال وسط ایشیا تک پھیل گیا ہے وہ ایک ایسے ملک کی قومی زبان ہے جو ایک طول و طویل تاریخ رکھتا ہے اور جس کا مستقبل

شاندار نظر آتا ہے۔

عربی ایک دوسری مکمل صرف و نحو رکھنے والی زبان ہے لیکن اس کی طرز وضع بالکل جداگانہ ہے۔ اس کے سہ حرفی مصادر اور اسم پر فعل کی سبقت اس سامی خاندانی کی مشہور و معروف خصوصیات ہیں جس میں عبرانی اسیریا اور توراۃ قدیم اور عراق عرب کی زبانیں شامل ہیں عربی زبان ایک ایسے دماغ کے اظہار خیالات کا ذریعہ ہے جو ایک ایرانی شاعر کے دماغ سے جو باغ میں گل و بلبل اور شیشہ و ساغر کے ساتھ کے نغمے گنگناتا ہو بالکل جداگانہ ہے اور جو اس سے بھی زیادہ ہندوستان کے محلوں کی طرز معاشرت اور جنگلوں کی درویشانہ زندگی سے ناآشنا ہے عرب اور شاید تمام قدیم سامی قبائل مفتوحہ علاقوں کی دوسری نسلوں سے خلط ملط ہونے سے پہلے صحراؤں میں بود و باش رکھتے تھے گرم ہواؤں اور ریگ زاروں میں پرورش پاتے تھے اپنے اونٹوں کے گلوں میں خاموش زندگی بسر کرتے تھے اور عداوت اور محبت کے معاملات میں ایک ایسی جراوت اور جوش کا اظہار کرتے تھے اور ایسی ایسی سختیاں اٹھاتے تھے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے والوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔ ان کی زبان میں بھی ان سب باتوں کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن بدوی قبائل کی یہی شاعرانہ بولی جو اونٹ اور تلوار کی تعریف میں رجز خوانی کیا کرتی تھی اور جو ہجو اور دشنام میں دشنہ و خنجر سے زیادہ تیزی دکھاتی تھی ایک نئے دین اور ایک ایسی مذہبی تحریک کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی جو مغرب میں اسپین تک اور مشرق میں چین کی سرحد سے لے کر جاوے تک پہونچ گئی۔

فتوحات کے ساتھ ساتھ عربوں نے یونانی علوم و فنون کا کل ذخیرہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور اس کو اتنا اپنایا کہ یورپ کا مغربی حصہ بھی انہیں کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا۔

تیرھویں صدی میں آکسفورڈ اور پیرس کے علاوہ اور دیگر لاطینی یونیورسٹیوں نے جو علوم و فنون کی سخت محتاج تھیں اس میں اور دیگر مقامات کی عربی یونیورسٹیوں سے

بہت کچھ علوم و فنون کا ذخیرہ حاصل کیا۔ اسلام کو جاننے اور سمجھنے اور اسلامی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عربی کا سیکھنا ضروری ہے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا ضروری عنصر بن گئی ہے۔ یہ ہندوستان جدید کا ایک اہم بالشان مسئلہ ہے کہ ان قدیم تعلیم کی نہروں کو زمانۂ حال کے سائنس اقتصادیات سیاسیات اور معاشیات کے اس سیلاب سے جو مغرب سے آرہا ہے ملا دیا جائے اور ساتھ ساتھ انگریزی ادبیات کی ضرورت اور اہمیت کو بھی فراموش نہ کیا جائے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ تمام عناصر ایک نئی تعلیم کے قالب میں ڈھال دیئے جائیں۔

اس مسئلہ کو حل کرنے میں ہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ دنیائے جدید اور دنیائے قدیم دونوں سے واقفیت نہ حاصل کرلیں ایک گولی کا صدمہ اٹھائے ہوئے مریض کے مانند جس کی قوت حافظہ سلب ہو چکی ہو تہذیب و تمدن میں بالکل نئی ترقی کرنا ممکن امر ہے۔ ایک روز ایک فرانسیسی افسر کی کہانی فرانسیسی زبان میں میری نظر سے گذری جو میدان جنگ میں بے ہوش پڑا ہوا تھا المانی اس کو بعض واقعات کی وجہ سے اپنی قوم کا شخص سمجھ کر اٹھا لے گئے وہ ہوش میں تو آیا لیکن اس کی قوت حافظہ بالکل ہی مفقود ہو چکی تھی اس کو بات کرنا لکھنا پڑھنا سب المانی زبان میں سکھایا گیا گو وہ المانی اچھی طرح لکھ پڑھ سکتا تھا تاہم دوسرے المانیوں سے بالکل مختلف معلوم ہوتا تھا اس کی تحریر سے بھی ایک ایسی بات ظاہر ہوتی تھی جس کو المانی اپنے مذاق سے جداگانہ پاتے تھے چند سال کے بعد وہ ایک زبردست انشا پرداز ہو گیا لیکن اس کے خیالات اور اس کے طرز تحریر سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری قوم کا ہے آخرکار اس کے ایک دوست کی کوشش سے جس نے اس کی اصلیت کو دریافت کر لیا تھا رفتہ رفتہ اس کا زائل شدہ حافظہ تازہ ہوتا گیا اور اس کی اصلی شخصیت عود کر آئی یہ کہانی میں نے بطور تمثیل اپنے اس فقرے کی وضاحت کے لئے بیان کی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے یعنے انسان کے لئے اپنے اصلی تمدن کو

فراموش کرکے ایک بالکل نئے تمدن میں ترقی کرنا ناممکن امر ہے۔

اگر ہندوستان جدید سائنس کے کل ذخیرے کو مغربی زبان کی وساطت سے اپنے آپ میں جذب کر لینے کی کوشش کرے تو اس کو نہایت اچھی طرح سے کرسکتا ہے لیکن اگر پرانی یادداشتیں معطل کردی جائیں۔ تو اسکی کوششوں میں کچھ نہ کچھ خامی رہ جائیگی ایسا معلوم ہوگا کہ کسی چیز کو اس نے گم کر دیا ہے۔ اور کوئی چیز اس کے ذہن میں ایسی بسی ہوئی ہے جو اظہار کے لئے بے چین ہے۔ اور جس کے بغیر ہندوستان پوری طور پر اپنی خاص انفرادی حیثیت کو محسوس نہیں کر سکتا۔

قدیم تذکرے اور وہ مباحث جن سے ہم اچھی طرح واقف ہیں قدیم زبانوں ہی کے ذریعہ سے اعلیٰ اور شاندار پیرائے میں ادا ہو سکتے ہیں۔

جو مسئلہ ہمارے زیر بحث ہے اس کا مقصد پرانی اور نئی زبانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے نہ یہ دیکھنا کہ کس زبان کا کس قدر ذخیرہ دماغوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھرا جا سکتا ہے اگر کوئی چاہے تو قدیم روایات کا پابند ہو کر بھی زمانۂ حال کی جدید تہذیب سے آراستہ ہو سکتا ہے اور قدیم حالات و رسم و رواج سے محبت اور انس پیدا کر سکتا ہے۔

ان تمام امور پر بحث کرنے کے بعد اب ہم کو اس امر پر غور کرنا ہے کہ مذکورۂ بالا مسئلہ کو کامیاب بنانے کے لئے کس قسم کی تجاویز سے کام لینا چاہیئے جو مضامین اس شعبے کے متعلق وصول ہوئے ہیں ان میں غالباً اس بحث کے ہر ایک پہلو پر بحث کی گئی ہوگی لیکن میں طالب علموں اور مدرسوں کے متعلق صرف ایک یا دو عمومی امور پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

طالب علموں کو خود کام کرنے اور پڑھنے کی تعلیم دیجائے صرف بیٹھے ہوئے مدرس کی تشریح و توضیح کو سننے اور دئے ہوئے ترجمہ کو یاد کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ہر ایک طالب علم کے پاس لغت کا موجود رہنا ضروری ہے اور اس کو لغت کے استعمال کی

مجبور کرنا چاہیے اور اس امر کی ہرگز اجازت نہ دینی چاہیے۔ کہ وہ مدرس کو زندہ لغت تصور کرکے جس وقت جی چاہے استعمال کرے۔ ہر ایک طالب علم کے پاس قواعد بھی موجود رہے اور اس کو حسب موقع قواعد سے کام لینے کا طریقہ بتلایا جائے محض قواعد کے حصے از بر نہ کرائی جائیں بلکہ سبق کے ساتھ ساتھ ہی قواعد کی تشریح طلب باتیں سمجھادی جائیں خود مدرس کو اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ قواعد کا کس قدر حصہ زبانی یاد کرایا جائے اور کس قدر حصہ قاعدوں کے استعمال وغیرہ کی مشقی تعلیم کے لیے رکھا جائے۔ قواعد کے پیچیدہ اصول پورے طور پر اسی وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جبکہ طالب علم اعلیٰ تعلیمی زینہ پر پہونچ جائے۔ ابتدائی مدارج میں قوت حافظہ سے سوچ سمجھ کر صرف اس حد تک کام لینا چاہیے کہ قوت استدلال میں کوئی ہرج اور فتور واقع نہ ہو۔

ناخواندہ عبارتوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرانے کی تدریجی مشق کرائی جائے۔ موقع بموقع زیر تعلیم زبان کے مباحث کی تطبیق دوسرے مباحث مثلاً تاریخ۔ فیلالوجی (علم اللسان) اور روزمرہ زندگی کے واقعات سے کرائی جائے زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ مدارج میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ کلاسیکل زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس زبان کے ادب۔ تاریخ اور بانیاں ادب کے تمدن سے بھی واقفیت کرائی جائے۔ اور ان کا ماحول یہ ہونا چاہیے کہ تعلیم سے موجودہ زندگی میں استفادہ حاصل ہو سکے۔ اساتذہ ایسے اشخاص ہوں جن کی استعداد اور علمیت بہ نسبت ان لوگوں کے جو عموماً کار آمد تصور کر لئے گئے ہوں زیادہ وسیع ہو۔ سب یکساں نہ ہوں بلکہ بعض ایسے بھی ہوں جو کئی زبانیں جانتے ہوں بعض ایسے ہوں جو تاریخ اور آثار قدیمہ میں اچھی مہارت رکھتے ہوں اور بعض منطق اور فلسفہ کے ماہر اور علم اللسان میں اچھی تربیت پائے ہوئے ہوں غرض کہ ہر حالت میں مدرس ایک عالم اور محقق ہو نہ کہ کندۂ ناتراش۔

مدرس کو ہمیشہ مطالعے اور اکتساب فن میں مصروف رہنا چاہیے جب یہ معلوم ہوجائے کہ

مدرس معلومات کے بڑھانے سے دست کش ہو گیا ہے تو وہ وظیفہ یا بغیر وظیفہ کے علٰحدہ کر دیا جائے۔ اس کو اپنے مضمون پر کامل دستگاہ حاصل کرنا اور عام معلومات پر حاوی رہنا چاہیئے۔

مدرسہ یا کالج میں تعلیم دینے کے لئے گریجویٹ کو ایک ایسی کامل استعداد حاصل کرنی چاہیئے۔ جو ایک ایسے بہترین قسم کے پنڈت یا مولوی میں ہو سکتی ہے۔ جس کی علمی وسعت زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی حاوی ہو۔

میں اس امر سے واقف ہوں کہ شاید ہماری رائے صائب سمجھی جائے۔ کیونکہ بہت سے علما یہ خیال کرتے ہیں کہ جدید خیال کا پنڈت ایک بگڑا ہوا پنڈت ہے اور قدیم روایتی تعلیم جدید خیالات کی آمیزش سے پاک اور محفوظ رہنی چاہیئے۔

متوفی ڈاکٹر اسپونر یہ بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ہم مصری مومیات میں سے کسی ایک کو زندہ کر کے لا سکیں تو وہ مصر قدیم کی زندگی اور خیالات کو بہ نسبت کسی موجودہ عالم کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کر سکتا ہے وہ مصری کتابوں کے بہت سے مقامات کو جن پر تاریکی چھائی ہوئی ہے اور ہم کو ان کا کوئی پتہ نہیں ملتا روشن کر کے دکھلا سکتا ہے۔ صاحب موصوف کا بیان تھا کہ حقیقی پنڈت جس کی قدیم روایتی تعلیم جدید خیالات سے ملوث نہ ہوئی ہو۔ بعینہ وہی حیثیت رکھتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اب بھی عہد عتیق سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو قدیم مصنفین کی کتب سے واقفیت تامہ حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایسا دوبارہ زندگی یافتہ مصری (اگر وہ اتفاق سے فاضل اور ذہین بھی ہو) بہت سے ایسے نکات حل کر سکتا ہے جو ہم کو استعجاب میں ڈال سکتے ہیں۔ اور ترقی یافتہ طالب علم کو اس سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ کم عمر اور نو آموز طلبہ کے لیے بھی قابل مدرس ثابت ہو مجھ سے پوچھئے تو میں اس کی نسبت یہی رائے دونگا۔ کہ اس کو کسی عجائب خانے یا کتب خانے کے ایک گوشہ میں بٹھا دیا جائے۔

لیکن میں ہرگز اس کو کسی مدرسہ میں مدرس بنانے کی رائے نہ دونگا۔

ایسے ہی وہ پنڈت اور مولوی جو صرف قدیم تعلیم ہی سے بہرہ ور ہوں یونیورسٹی میں جگہ پا سکتے ہیں اور ان کی ذات سے اعلیٰ مباحث تعلیم کو فائدہ پہونچ سکتا ہے لیکن دقیانوسی ہونے کی حیثیت سے وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اچھے معلم ثابت نہیں ہو سکتے۔ ایک زمانہ گذرنے کے بعد یعنے میرے خیال میں چار سو سال سے بھی کم عرصہ میں پنڈت اور مولوی یا تو جدید خیالات سے آراستہ ہو جائیں گے یا ان کو مدارس سے اپنا بوریا بدنا اٹھانا پڑے گا۔ ہندوستان کے بچے مدرسے کے کئی معتنم گھنٹوں کو ایک دقیانوسی تعلیم کی نذر کر کے ہرگز ترقی نہیں کر سکتے۔ اس بات کا خیال رہے کہ جدید خیالات سے آراستہ ہونے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لازمی طور پر انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کریں بلکہ وہ ایسے تعلیم یافتہ اور عالم ہوں کہ ساتھ ہی ساتھ جدید تعلیم اور خیالات سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہوں

السنۂ قدیم کو ترقی دینے کی بعض کوششیں عمل میں لائی جا رہی ہیں اگر اصل مقصد کی اہمیت اور کام کی قدر و عظمت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو کوششوں میں دس گنی ترقی ہو جائیگی اور حسب ضرورت فنڈ بھی مہیا ہو جائیگا۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ میں نے اس شعبے کی اہمیت کو ثابت کر دکھانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اب آخر میں کلاسیکل اسوسی ایشن کے ان دو فقروں کو جو ان کے مقاصد میں داخل ہیں اور فی زمانہ ہندوستانی مسائل السنۂ قدیم سے پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں دوہرا کر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عام لوگوں پر شد و مد کے ساتھ کلاسیکل تعلیم کی اہمیت اور قدر و قیمت ثابت کی جائے اور قومی تعلیم کی اسکیم میں اس کے لئے بھی ایک ممتاز جگہ حاصل کی جائے۔

"ایک اور مقصد یہ ہے کہ کلاسیکل تعلیم کی وسعت اور طریقہ ہائے تعلیم پر آزادانہ بحث مباحثہ کے ذریعہ اس کی اشاعت کو ترقی دیجائے۔"

نظام تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت

(ترجمہ مضمون)

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کینٹب)

جو امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لندن میں پڑھا گیا۔

جس طرح انگلستان میں صدیوں تک صرف السنہ قدیم اور دینیات تعلیم کا اہم جزو سمجھے جاتے تھے ہندوستان میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک صرف علوم مشرقیہ اور دینیات کا دور دورہ تھا۔

ہندو بچوں کی تعلیم صرف ہندو مذہب اور سنسکرت اور مسلمان بچوں کی تعلیم صرف دینیات اور عربی تک محدود تھی نظام تعلیم میں مادری زبان کی کوئی جگہ نہ تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے تو ہندوستانیوں کے تعلیمی مسائل میں تغافل سے کام لیا مگر جب ۱۸۱۳ء کے قانون کی رو سے کمپنی کے ڈائرکٹر تعلیم پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کرنے پر مجبور کئے گئے تو انہوں نے اپنی تمام توجہ السنہ شرقیہ کی طرف کی ۱۸۳۵ء کی مکالے کی مشہور رپورٹ نے گورنمنٹ کے اس طرز عمل میں تبدیلی پیدا کر دی۔ جس کے بعد گورنمنٹ نے اعلان کر دیا کہ "برٹش گورنمنٹ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں میں یورپ کے علوم اور سائنس کی تعلیم پھیلائے اور اس مقصد کو پورا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ تمام تعلیمی رقوم اسی مد میں خرچ کی جائیں۔"

اب رہا یہ مسئلہ کہ کونسی زبان ذریعہ تعلیم قرار دیجائے تو اس پر اس زمانے کے تمام لوگوں نے اتفاق کیا کہ دیسی زبانیں ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں کہ وہ اس مقصد کو پورا

کر سکیں۔

گو زبان انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی مگر اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے مادری زبانوں کی ترقی اور مدارس میں ان کی عمدہ تعلیم دیے جانے پر خاص زور دیا۔

انہوں نے غالباً اس بات کو بھی محسوس کیا تھا کہ آیندہ زمانہ میں مغربی علوم کی دیسی زبانوں کے ذریعہ اشاعت کی جائیگی۔ چنانچہ تعلیمی کمیٹی نے سنہ ۱۸۳۶ء کی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ "ہمارا آخری مقصد دیسی زبانوں کے ادب کی ترقی کا ہے اور ہم کو اس کے لئے پوری کوشش کرنی چاہیئے چند سال بعد سنہ ۱۸۵۴ء کے مشہور مراسلہ میں جو گورنر جنرل کے نام بھیجا گیا تھا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اسی اصول کا اعلان کیا اور ساتھ ساتھ یہ اُمید بھی ظاہر کی کہ ہندوستان کی ادبیات میں یورپ کی کتابوں کے ترجموں یا ان حضرات کے جدید مضامین سے جن کے دماغ یوروپین معلومات سے مملو ہیں ایک خاص ترقی ہوگی اور اس طریقہ سے یوروپ کے معلومات کے ذخیرہ سے ہندوستان کے تمام طبقے بہرہ ور ہوسکیں گے۔

اگرچہ گورنمنٹ نے کئی دفعہ اس بات کا اعلان بھی کیا کہ دیسی زبانوں کو ترقی دی جائے تاکہ ہندوستانیوں تک یورپ کے خیالات پہنچ سکیں مگر نہ تو اس کو عملی جامہ پہنایا گیا اور نہ ان کا یہ خیال پورا ہوا کہ اونچے اور متوسط طبقے والے اپنی مغربی معلومات سے ابنائے وطن کو مستفید کریں۔

گورنمنٹ صرف انہی ہندوستانیوں کو ملازمت کے لیے منتخب کرتی تھی جو انگریزی میں ماہر ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا نے ملازمت کی دلفریبیوں کی خاطر انگریزی کی طرف اتنی توجہ کی کہ صرف انگریزی کی قابلیت ہند کی تعلیم جدید کا حقیقی مقصد قرار پا گیا۔ یونیورسٹیوں نے بھی اس سیلاب کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مدارس ثانوی اور کالجوں میں انگریزی کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا۔ اس کی وجہ سے دیسی زبانیں کسمپرسی کی

حالت میں رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے افراد جو یورپ کے علمی ذخائر کا ترجمہ کرسکتے تھے کم ہوتے گئے اور جو اس قابل تھے انہوں نے انگریزی میں مضمون نویسی کو ایک باوقعت چیز سمجھکر انگریزی زبان میں خیالات کے اظہار کو زیادہ پسند کیا۔ اس طرح سے وہ لوگ جو انگریزی سے نابلد تھے جدید خیالات کے استفادہ سے معذور رہے۔

چنانچہ ۱۸۵۴ء کے مشہور مراسلہ کے تقریباً نصف صدی بعد حکومت ہند نے ۱۹۰۴ء کے یونیورسٹی کمیشن رپورٹ میں اس بات کی شکایت کی کہ انگریزی کی تعلیم کی خاطر دیسی زبانوں کو بالکل پس پشت ڈالدیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۴ء کے مراسلہ میں جو یہ اُمید ظاہر کی گئی تھی کہ مغربی خیالات دیسی زبانوں کے ذریعہ عام ہندوستانیوں کے سامنے پیش کئے جائیں اس کی ابھی تک کوئی سبیل نہیں کی گئی۔

دیسی زبانوں کی قربانی کرکے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی معلومات صرف معدودے چند افراد کے دماغوں تک محدود رہیں یعنی ہند کی تقریباً ۳۲ کروڑ آبادی میں سے صرف ۳۰ لاکھ مرد اور ۳ لاکھ عورتیں انگریزی میں نوشت و خواند کرسکتی ہیں۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ انگریزی تعلیم نے اعلیٰ اور متوسط طبقوں پر کیا اثر کیا جن کے لئے یہ نظام تعلیم خاص طور پر ترتیب دیا گیا تھا۔ ہند کے ان طبقوں کی دماغی حالت دوسری اقوام سے کسی طرح کم نہیں مگر پھر بھی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت کم افراد ایسے نکلے جنہوں نے اپنی جدت طبع سے معلومات میں کچھ اضافہ کیا۔ ہند کی یونیورسٹیوں کے بی۔اے پاس حضرات کے دماغوں میں جدت کا مادہ بہت کم ہے اس لئے کہ ان کے دماغ غیر زبان پر عبور حاصل کرنے کی سعی میں اپنی بہت سی قوت بیکار صرف کرتے رہتے ہیں چونکہ ایسے افراد کا بہت سا وقت غیر زبان کی قواعد کے جھگڑوں میں صرف ہوتا ہے وہ اپنا

پورا وقت نفس مضمون پر صرف نہیں کر سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغ بجائے اعلیٰ خیالات سے مملو ہونے کے صرف الفاظ سے پٹے رہتے ہیں۔

بطور مثال ہم ایک تاریخ کے طالب علم کو لیتے ہیں اس کا بہت سا وقت غیر مانوس اصطلاحات اور الفاظ کے حل کرنے میں صرف ہوتا ہے جسکی وجہ سے وہ نفس مضمون پر اور تاریخ کی غایت پر کما حقہٗ غور نہیں کر سکتا۔ اور اس کی وجہ سے اس کو بیحد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ان مصائب کا اس پر ہی خاتمہ نہیں ہوتا۔ اگر اس نے لغت اور استاد کی مدد سے الفاظ کے معنی پر عبور بھی حاصل کر لیا تب بھی وہ ان خیالات کو اپنے الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ ان تمام رکاوٹوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کتب کے بڑے بڑے جملے زبانی رٹنے پر مجبور رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کی دماغی قوتیں بجائے ارتقار کے تنزل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ انگریزی طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ہندوستانی طلبار کی قوت تخیلہ اور جدت طرازی پر بیحد برا اثر پڑا۔

طرز تعلیم کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں قومی روایات۔ خیالات اور اولوالعزمیوں کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا اس طریقۂ تعلیم کا غالباً مقصد یہ تھا کہ ہند کی سرزمین میں انگریزی کلچر اور ان کی قومی روایات کا بیج بویا جائے مگر سرزمین ہند کی ناموافق خاک وآب نے اس پودے کو جڑ پکڑنے نہ دیا۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں جتنی کتابیں نصاب میں مقرر ہوتی ہیں انمیں ہندوستانی خیالات اور حالات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ انمیں انگریزی خیالات اور روایات پر زور دیا جاتا ہے اور مثالیں بھی اس سرزمین کی لی جاتی ہیں۔

اس قسم کی تعلیم ہندوستانی طلبار کے اعلیٰ خیالات کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے اور ان کو ایک مصنوعی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

تعلیم کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ وہ طلبار کو آئندہ

ضروریات زندگی کے لئے تیار کرے۔ مگر جب اس قسم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کوئی لڑکا دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی تعلیم لکچر اور کتابوں نے جس دنیا کا خاکہ اسکی نظروں کے سامنے پیش کیا تھا اس سے یہ دنیا بالکل مختلف ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم جس میں قومی ضروریات خیالات روایات اور تحریکات کا خیال نہیں رکھا جاتا وہ بالکل فضول ہے۔ کسی قوم کی ترقی صرف ان کوششوں پر منحصر نہیں ہوتی جو غیر علوم و تمدن پر عبور حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہیں اور جو کبھی اپنے نہیں ہو سکتے بلکہ یہ منحصر ہوتی ہے قوم کی اس قابلیت پر جس کی مدد سے وہ اپنی ذاتی قدر اور کلچر کو زندگی کے موجودہ حالات کے اعتبار سے زمانہ کی رفتار کے دوش بدوش رکھتی ہے۔ یہی وہ سبق ہے جس کی طرف موجودہ جاپان کی تاریخ ہماری رہبری کرتی ہے جاپان غیر اقوام کے خیالات سے مستفید ضرور ہوا مگر اس نے ان خیالات کو اپنے ملکی اور قومی سانچوں میں ایسا ڈھالا کہ وہ بالکل اسی کے معلوم ہونے لگے۔

اسی سلسلہ میں میں ان خیالات کا اعادہ کرونگا جو نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات نے اپنے لکچر میں ظاہر فرمائے تھے۔ جنہوں نے جاپان کا دو دفعہ سفر کر کے وہاں کے تعلیمی حالات کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔

"جاپان یورپ اور امریکہ اس طرح گیا۔ جس طرح کوئی سودا سلف کے لئے بازار جاتا ہے اور صرف وہی چیزیں جاپان نے لیں جن کی ضرورت تھی۔ دوسری طرح یوں کہہ سکتے ہیں کہ جاپان نے دودھ پر سے بالائی اتار لی اور اس کا خیال نہیں کیا کہ گائے کس کیفیت کی ہے"

اس خذ ما صفا کی چال کا پھل یہ ملا کہ بجائے اس کے کہ جاپان پر مغربی رنگ

جڑ ہ جاتا اس نے مغربی تمدن کی کارآمد چیزوں کو جاپانی بنالیا۔ جاپان پر فرانس کا اتنا ہی اثر ہے جتنا انگلستان کا اور اسی قدر امریکہ کا رنگ ہے۔ جس قدر جرمنی کا۔

ہم ہندوستانیوں کے برعکس جاپانیوں نے اپنی ساری توجہ ایک ہی ملک پر مبذول نہیں کی۔ انہوں نے ساری مغربی دنیا کو تفصیلی اور جزئی مطالعہ کی غرض سے چھان مارا۔ اور یہ چھان بین بھی تقریباً خوردبین کی سی تھیں۔ کہ ذرا سی چیز بھی ان کی نظر سے نہیں بچ سکی۔

جاپانی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جن معاملات کا تعلق فنون لطیفہ اور فلسفہ سے ہے یعنے ان چیزوں میں جو انسانی روح سے پیوستہ ہیں۔ ان کو مغرب سے کوئی بات سیکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ ان کے اپنے سماجی رواج اور قومی عقیدے یورپین لوگوں کے رواج اور عقیدوں کی طرح نفیس اور منطقی حیثیت سے اتنے ہی مضبوط ہیں۔ چنانچہ اس قوم کی باطنی زندگی اسی رُخ پر بہتی رہی جس پر بہتی آئی ہے اور اس پر بیرونی ملکوں سے جو چیزیں لی گئی ہیں ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔"

اس کے برخلاف ہندوستان میں اجنبی طرز تعلیم جس کا ہماری تعلیم سے زبردست تعلق ہے ہماری قومی زندگی کا جزو نہ بن سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنی تمدن و تہذیب کو پس پشت ڈالدیا اور باوجود ایک صدی کی انگریزی تعلیم اور قدرتی ذرائع کے میسر ہونے کے ہم ابھی تک غریب نادار اور نسبتاً تاریکی و پستی میں ہیں اور دنیا کی اقوام کی محفل میں اس جگہ کو حاصل نہیں کر سکے جس کے ہم اپنی قدیم روایات اور کلچر کی وجہ سے مستحق ہیں۔

جب موجودہ طرز تعلیم کے حامی جو ہندوستانیوں میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ اس طرز تعلیم نے ہم کو مغربی خیالات اور طریقوں سے آشنا کردیا تو وہ اس بات کو مدنظر نہیں رکھتے کہ اس طرز تعلیم نے ہندوستانیوں میں صرف نقالی

کا مادہ پیدا کر دیا۔ اور جب وہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ موجودہ طرز تعلیم نے ہماری آنکھوں کے سامنے مغربی علوم کے مال خانے کھول دئے تو وہ اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ ہم ان معلومات کو بالکل اپنا نہ کر سکے۔

اگر ہم یہ چاہیں کہ قوم آزاد خیالات اور مفید طریقوں سے بہرہ ور ہو تو ہمیں چاہیئے کہ اس کے افراد کے دماغوں کی موثر طریقہ سے تربیت کریں۔ لیکن اس قسم کی دماغی تربیت ایسی تعلیم سے جس کا ذریعہ غیر زبان قرار دی گئی ہو ناممکن ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ موجودہ طرز تعلیم کے اکثر نقائص (مثلاً دماغ پر بے جا بار پڑنے۔ نفس مضمون کو چھوڑ کر صرف زبان پر قدرت پیدا کرنے کی لاحاصل کوشش۔ قوت متخیلہ کی کمزوری۔ جدت واختراع کا فقدان۔ دیسی زبانوں سے تغافل تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ کے زبردست فرق) کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔ اور موجودہ طرز تعلیم کی تبدیلی کے لئے صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے۔ بلکہ تبدیلی کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں تقسیم بنگالہ کے بعد ہی جو قومی تحریک پھیلی اس کے مقاصد میں دیسی زبانوں کا احیا ربھی ایک مقصد عظیم تھا اس دوران میں ہند کی تمام خاص زبانوں مثلاً اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ ٹامل۔ تلنگی اور کنڑی کے ادب میں مختلف مضامین اور ترجموں سے معتدبہ اضافہ ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں کو نصاب تعلیم میں خاص جگہ دی جارہی ہے۔

اس تحریک کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ابتدائی مدارس میں پہلے جو عمر انگریزی تعلیم شروع کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اب اس میں زیادتی کی گئی ہے۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ بچوں کو انگریزی بطور زبان دوم کے بھی اس وقت تک شروع نہ کروائی جائے جب تک کہ وہ اپنی مادری زبانوں میں کافی ورک حاصل

نہ کرلیں۔ اسی اصول کو مدنظر رکھکر پنجاب میں ابتدائی مدارس سے انگریزی اٹھادی گئی اور ریاست حیدرآباد میں جہاں کی نمائندگی کا مجھے اس وقت فخر حاصل ہے۔ انگریزی سوم جماعت یعنی ابتدائی تعلیم کے چوتھے سال تک شروع نہیں کروائی جاتی۔

مدارس ثانویہ میں بھی انگریزی کی بجائے دیسی زبانیں آہستہ آہستہ ذریعہ تعلیم بنائی جارہی ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اس اصول کی بہت زور سے تائید کرتے ہوئے سفارش کی کہ میٹرک تک انگریزی صرف لازمی زبان دوم کی طور پر پڑھائی جائے اور مدارس میں اس کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے۔

اس اثناء میں یونیورسٹیوں میں دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کی تحریک کی طرف پیش قدمی کی جاچکی ہے۔ اس تحریک کے علمبردار انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ اس کے فوائد کو مانتے ہوئے (کہ اسکی وجہ سے یورپ کی آزاد خیالی سے لوگ بہرہ ور ہوتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ یہ تعلیم ہندوستانیوں اور انگریزوں میں اتفاق کا باعث ہوئی بلکہ اس نے خود ہندوستانیوں میں بھی اتفاق و اتحاد کی روح پھونک دی) اس بات کے خواہشمند ہیں کہ انگریزی بجائے ذریعۂ تعلیم قرار دئے جانے کے بطور لازمی زبان دوم کے کالجوں اور مدارس ثانویہ میں پڑھائی جائے۔

ہندوستان کے قریب قریب تمام تعلیمی ماہر اس بات پر متفق ہیں کہ کالجوں اور مدارس میں مادری زبانیں ذریعہ تعلیم قرار پائیں۔ اگر کوئی مخالفت کی بھی جاتی ہے تو عملی دقتوں کی بنا پر لیکن اس خصوص میں ریاست حیدرآباد نے ایک جرأت آمیز تجربہ اور ایک یونیورسٹی قائم کرکے جس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے ان تکالیف پر غالب آنے کا راستہ بتلادیا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی جس کا نام اس کے عظیم الشان بانی اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے نام نامی پر رکھا گیا ہے ۱۹۱۶ء میں قائم ہوئی

اس کے مقاصد کی توضیح اس کے عظیم الشان بانی کے منشور خسروانہ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

"جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل کر سکے۔ اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف تو طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیجائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالبعلم پر لازمی گردانی جائے"۔

اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے بہت سے ابتدائی مراحل طے کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ باوجود اردو ادب کی ترقی کے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اردو زبان میں سائنس اور فنی تعلیم کی کتابیں اتنی کم تھیں کہ ان کی مدد سے یونیورسٹی کی تعلیم مشکل تھی اس لئے سب سے پہلے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا جس نے پانچ سال کے عرصہ میں ترجمہ اور تالیف سے نصاب کی تقریباً تمام کتابیں تیار کیں۔ فنی اصطلاحات کا بنانا بھی ایک اہم کام تھا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کیلئے کمیٹیاں قائم کی گئی جن میں علوم قدیم اور جدید کے ماہرین شریک ہیں ان کمیٹیوں نے بہت سے نئے الفاظ گھڑے اور بعض وہ انگریزی الفاظ جو اردو میں بلا تکلف استعمال ہوتے تھے ویسے ہی استعمال کئے گئے جس طرح کہ بعض لاطینی اور یونانی

الفاظ اس وقت انگریزی میں موجود ہیں۔ ان کمیٹیوں اور دارالترجمہ کی متحدہ کوشش کی وجہ سے اُردو ادب میں اتنی ترقی ہوگئی کہ علوم جدیدہ کی تعلیم اس میں آسانی اور عمدگی سے دی جاسکتی ہے۔ دارالترجمہ کی ان محنتوں کا یہ بھی اچھا صلہ ملا کہ ہندوستان کے مختلف صوبہ جات نے ان گھڑے ہوئے الفاظ کو نہ صرف یہ کہ قبول کیا بلکہ اس وقت مشہور اہل قلم ان کو اپنے پر مغز مضامین میں استعمال بھی کر رہے ہیں۔

اس تحریک سے طلبار کے خیالات اور انداز بیان میں خاص ترقی ہوئی اور اس وقت ہمارے پاس اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی سواد موجود ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبار مختلف مضامین پر بہ نسبت دوسری یونیورسٹیوں کے طلبار کے ممتاز عبور اور دسترس رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ انگریزی تعلیم تمام امتحانات کے لئے ضروری کردی گئی ہے اور یونیورسٹی کا مقصد بھی یہی ہے کہ انگریزی میں یہاں کے طلبار دوسری یونیورسٹیوں کے طلبار سے کم نہ رہیں اس یونیورسٹی کے گریجویٹ جب دوسری یونیورسٹیوں میں علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتے ہیں تو کسی طرح اور طلبار سے کم نہیں رہتے۔ بلکہ قوائے ذہنی کی باقاعدہ اصول پر تربیت اور نفس مضمون پر نسبتاً زیادہ قابو ہونے کی وجہ سے دوسری یونیورسٹیوں کے طلبار سے اکثر گوئے سبقت لے جاتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں ہم ان ممتاز کامیابیوں کا اظہار کر سکتے ہیں جو ہمارے طلبار نے ڈھاکہ جیسی مشہور یونیورسٹی میں حاصل کی ہیں حسب توقع عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے ریاست حیدرآباد میں ایک زبردست علمی ہل چل پیدا کردی اور یہ احیائے علوم کسی ایک طبقہ تک محدود نہیں بلکہ اُردو میں کافی مواد ہونے اور اچھے اردو دانوں کی کثرت کی وجہ سے عوام اور مستورات جو خاص حالات کی وجہ سے انگریزی جیسی اجنبی زبان کے سیکھنے میں کما ینبغی وقت نہیں دے سکتے تھے وہ بھی اب جدید معلومات سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

جہاں عثمانیہ یونیورسٹی نے یہ بات ثابت کردی کہ اُردو میں جدید علوم وفنون کی تعلیم ہوسکتی ہے پروفیسر کاروے کی یونیورسٹی نے جو پونہ میں ہندو مستورات کے لئے کھولی گئی ہے یہ بات بھی ثابت کر دی کہ مرہٹی بھی ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔ اسی اثنار میں اندھرا یونیورسٹی میں جو ابھی مدراس میں قائم ہوئی ہے تلنگی کو اور بڑودہ میں آیندہ قائم ہونے والی یونیورسٹی میں گجراتی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے مسئلہ پر غور کیا جارہا ہے بنگالیوں سے بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ بھی اس مثال کی تقلید کرینگے اس لئے کہ بنگالی زبان اب اس قابل ہوگئی ہے کہ وہ بھی اُردو مرہٹی گجراتی اور تلنگی زبانوں کی طرح ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے۔

گو اس تحریک کے حامیوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی ہے مگر پھر بھی اس نے اتنی ہردلعزیزی حاصل نہیں کی جس کی کہ یہ مستحق ہے۔ اب بھی اس پر اعتراض کرنے والے بہت ہیں اور ان کے یہ اعتراضات ہیں۔ پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ نہ تو سائنس اور فنون پر اچھی کتابیں موجود ہیں اور نہ ان مضامین کے اظہار کے لئے جتنے الفاظ کی ضرورت ہے وہ یہاں کی زبانوں میں موجود ہیں۔ غالباً معترض حضرات اس واقعہ سے لاعلم ہیں کہ حال میں ان خامیوں کو رفع کرنے کے لئے دیسی زبانوں کو کافی ترقی دی گئی ہے۔ اور ملک میں ایسے قابل افراد کی کچھ کمی نہیں جنکی تصانیف وتالیف انگریزی کتب نصاب کی جگہ لے سکیں ظاہر ہے کہ رسد طلب کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ اگر ان زبانوں کی ہمت افزائی کی جائے اور ہر ایک مجوزہ یونیورسٹی کے تحت ایک دارالترجمہ اور محکمۂ تالیف قائم کیا جائے تو بہت تھوڑی محنت میں تمام زبانیں اس قابل ہو جائیں گی کہ وہ ذریعۂ تعلیم بن سکیں بہر حال ہماری مشکلات جاپان کی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے بہت کم ہیں۔ ہماری زبانیں پھر بھی یورپ کی زبانوں سے بہ نسبت جاپانی زبان کے قریبی تعلق رکھتی ہیں اور جب جاپان نے اپنی زبان کو اس قابل کر دیا کہ اس میں جدید علوم وفنون کی

عمدگی سے تعلیم دی جا سکتی ہے تو ہمیں نا اُمید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اچھے سے اچھا دار الترجمہ رکھنے کے باوجود بھی علوم و فنون میں زمانہ کی برق رفتاری کا ساتھ دینا مشکل ہے اس اعتراض کا جواب آسان ہے اول تو یہ کہ دیسی زبانوں کا ادب زمانہ کی علمی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ پروفیسر اور لکچر دینے والے حضرات طلبار کو جدید معلومات سے اثنائے لکچر میں اسی طرح واقف کرا سکتے ہیں جس طرح کہ ایک جرمنی پروفیسر اپنے طلبار کو انگلستان کی جدید علمی تحقیقات سے اثنائے تعلیم میں واقف کراتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ انگریزی تعلیم بھی اس تحریک کا ایک اہم جزو ہے اس لئے ہندوستانی طلباء نفس مضمون کے متعلق انگریزی کتب کا اسی طرح مطالعہ کر سکتے ہیں جس طرح کہ انگریز طلبا، فرانسیسی اور جرمنی زبان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی خاص مضمون کا دیسی زبانوں میں مواد کم ہے اور طالب علم کثرت سے انگریزی کتب کے مطالعہ پر مجبور رہے تو ایسی حالت میں بھی دوسری یونیورسٹیوں کے طلبار کے مقابلہ میں اس کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ امتحانات میں اپنی مادری زبان میں جواب دے سکتا ہے۔ اور یہ کچھ کم فائدہ کی بات نہیں۔ اس لئے کہ گو غیر زبان کے ذریعہ سے معلومات حاصل کرنا مشکل ہے مگر اس سے کہیں زیادہ مشکل اجنبی زبان میں ان خیالات کا اظہار ہے

تیسرا خوف یہ لگا ہوا ہے کہ اگر دیسی زبانیں ذریعۂ تعلیم قرار دی گئیں تو انگریزی کا معیار گھٹتا جائے گا یہ خطرہ بے بنیاد نہیں لیکن اگر انگریزی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے تو ایسی یونیورسٹی کے طلبار جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہو دوسری ایسی یونیورسٹی کے طلبار سے جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو کسی طرح انگریزی میں کم نہیں رہ سکتے اس لئے کہ اول الذکر طلبار اپنے اُن اوقات کو جو دیگر مضامین کے مادری زبان میں پڑھنے کی وجہ سے بچتے ہیں انگریزی کی تعلیم میں صرف کر سکتے ہیں

چند سال قبل جب کہ صوبہ جات متحدہ کے ثانوی مدارس میں بجائے انگریزی کے دیسی زبانیں ذریعۂ تعلیم قرار دی گئیں تو اس تحریک کے مخالفین نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ انگریزی کا معیار گھٹ جائیگا۔ مگر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک کی رپورٹ میں یہ بات ظاہر کی گئی کہ اس پنجسالہ عرصہ میں جہاں تک معلوم ہو سکا گذشتہ پنجسالہ عرصہ کے مقابلہ میں انگریزی کا معیار ترقی پذیر رہا بہر کیف مادری زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے اگر انگریزی کا معیار گھٹ بھی جائے تو صرف انگریزی کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر صحیح اصول تعلیم کا خون کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھا اعتراض جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ہند میں ایک نہیں بلکہ متعدد دیسی زبانیں ہیں دیسی زبانوں کی کثرت ایک مشکل ضرور ہے مگر اس دقت کو ہر زبان کی ایک ایک یونیورسٹی اس صوبہ میں جہاں وہ کثرت سے بولی جاتی ہے قائم کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی ہندوستان کی ملکی تقسیم زبانوں کے اعتبار سے عمل میں لانی پڑے گی۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نظام تعلیم کی بنیاد اس اصول پر نہ رکھی جائے۔

سب سے آخر اعتراض یہ ہے کہ مختلف زبانوں کے ذریعۂ تعلیم قرار دئے جانے سے ہندوستان کے اتحاد و اتفاق میں فرق آئیگا۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ انگریزی یہاں کے سب لوگوں کی نہ تو مادری زبان ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے ہاں صرف تعلیم یافتہ طبقے اس کو عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے اور چونکہ زیر بحث نظام تعلیم میں انگریزی کو لازمی قرار دیکر اس کی اہمیت باقی رکھی گئی ہے اس لیے انگریزی دیسی زبانوں کے ذریعۂ تعلیم قرار دئے جانے کے بعد بھی وہی اتحاد و اتفاق کا باعث ہوگی جیسا کہ اب تک رہی ہے۔

آجکل ہندوستان میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تعلیم قومیت اور معقولیت پر مبنی ہو مگر یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جبتک کہ غیر زبان ذریعۂ تعلیم بنی رہے

ہندوستان اپنی قومی ذہنیت میں اسی وقت ترقی کرسکتا ہے جب کہ ویسی زبانوں کو قعر مذلت سے جس میں کہ وہ آج کل پڑی ہوئی ہیں بچایا جائے۔ جاپان نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے اور اس کی تقلید میں ہمارا فائدہ بھی ہے۔ نواب مسعود جنگ بہادر نے اپنی کتاب "جاپان اور اس کے طریقہ تعلیم" میں نہایت دلچسپ پیرایہ میں بتایا ہے کہ کس طرح جاپان نے اپنی غیر مانوس زبان کو اس قابل بنادیا کہ وہ جدید خیالات کی حامل ہوسکی اور یہ کہ اسکی وجہ سے کس طرح بہت تھوڑے سے عرصہ میں جاپانی اس قابل ہو گئے کہ وہ موجودہ ترقی یافتہ اقوام کی دوش بدوش شاہ راہ ترقی پر گامزن پائے جاتے ہیں انہی ذرائع کی بدولت ہندوستان بھی اپنی قومی خصوصیات میں ترقی کر کے دنیا کی اقوام میں وہ جگہ حاصل کرسکتا ہے جس کا کہ ہند کا ہر سپوت دل و جان سے متمنی ہے۔

دیہاتی تعلیم کو اہل دہ کے مناسب حال بنانے میں مشکلات اور ان کے دفعی تدابیر

(ترجمہ مضمون

مولوی محمد حسین صاحب بی۔ اے آکسن)

جو امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لندن میں پڑھا گیا

مضمون زیر بحث بلحاظ اپنی نوعیت کے نہایت اہم اور بسیط ہے۔ ہندوستان میں تقریباً سات لاکھ دیہات ہیں اور تقریباً اس کی نوے فی صدی آبادی ان میں بسر کرتی ہے۔ پس ہندوستان کی دیہاتی تعلیم سے مراد لاکھوں باشندگان کی تعلیم ہے۔

قبل اس کے کہ میں ان مشکلات کو ظاہر کروں جو دیہاتی کو دیہاتی زندگی کے مناسب حال بنانے میں درپیش ہیں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم عرض کروں کہ رائج طریقہ کیا ہے اور دراصل کیا ہونا چاہیئے۔

نہایت افسوس کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں دیہاتی تعلیم بحالت موجودہ صحیح طریقہ پر رائج نہیں ہے۔ جملہ ماہرین فن تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ جو تعلیم دیہات میں دیجاتی ہے وہ کلیۃً ادبی اور کتابی ہے اور اہل دہ کی روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی خصوصاً ان کی زندگی سے جن کا پیشہ زراعت ہے۔ مزارعین اپنی اولاد کو تعلیم دلانے میں اس لئے تامل کرتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی اولاد آبائی پیشہ سے متنفر ہوجاتی ہے اور اُن کے دلوں میں سرکاری خدمات مثلاً محرری اور مدرسی کے حصول کی ہوس پیدا ہوجاتی ہے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تعلیم بجز اس کے نہیں ہے کہ اطفال اپنے والدین اور اساتذہ کی مطلب براری کا ایک ذریعہ قرار پائیں۔ والدین کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اون کی اولاد کچھ معاش کمائے اور مدرس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ طالب علم کامیاب ہوکر اس کی ترقی کا ذریعہ اور وسیلہ بنے۔ یعنے یہ کہ طالب علم کی کامیابی کو اپنی کارگزاری سمجھتا ہے اور ترقی کا طالب ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ موجودہ طریقہ تعلیم طلبہ کے سامنے ان کی زندگی کا غلط مطمح نظر پیش کرکے اُن کو باطل اُمیدوں میں ڈالتا ہے جس سے اُن کی زندگی کی بنا غلطی پر قائم ہوتی ہے اور اپنی آیندہ فلاح و بہبود کے لئے اپنی ذاتی قابلیت اور شخصیت کے بل بوتے پر عمل پیرا ہونے کے عوض دوسروں کی مدد کے محتاج ہوجاتے ہیں۔ تعلیم کے زمانہ میں علم کو اس کے حقیقی معنوں کے لحاظ سے حاصل کرنے کے بجائے صرف امتحان میں کامیابی حاصل کرلینا اور انعامات کا مستحق ہونا اُن کا مقصد اصلی ہوتا ہے اور غیر متعلق

مشاغل کا انہماک انہیں اپنی جسمانی اور دماغی حالت سے بے خبر رکھتا ہے اور امتحانات کی دلفریب ملمع کار ارادوں پر اپنی عزیز جانوں اور بیش قیمت صحتوں کو نثار کر دیتے ہیں

موجودہ طریقہ تعلیم نے طلبار کے رجحان فطری کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے کیونکہ ایسی غیر متعلق چیزیں سکھائی جاتی ہیں جن سے طلبار کو بالطبع نہ کوئی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ان کی آئندہ زندگی میں مفید اور کارآمد ہو سکتی ہیں۔

یہ میرا عقیدہ ہے کہ ابتک ہندوستان میں دیہاتی تعلیم اس وجہ سے ناکام رہی کہ موجودہ طریقہ تعلیم صحیح اور مفید اصول پر مبنی نہیں ہے۔ دنیا نے جو اصول طریقہ تعلیم کے لئے صحیح اور مفید قرار دئے ہمارے یہاں معدوم اور ہمارا عمل اس میدان میں قطعاً ان اصول کے برعکس رہا۔ بالخصوص نفسیاتی اصول اور طلبار کے ماحول سے غفلت برتی گئی۔

طالب علم جب مدرسہ کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے تو وہاں کا کچھ اور ہی رنگ پاتا ہے وہاں کی حالت اپنے گھر کی حالت سے بالکل جدا دیکھتا ہے در و دیوار نئے نظر آتے ہیں۔ جماعت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی گویا اس کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنے حساب کتاب۔ دوات اور قلم سے دوچار ہوتا ہے جو اس کے گھر کے مشاغل سے بالکل جدا ہوتے ہیں اور بہت جلد ہل بیل بکھر۔ اس کی نظروں سے اوجھل اور ذہن سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مدرسہ کے اوقات کچھ ایسے مقرر کئے جاتے ہیں کہ طالب علم زراعتی مشاغل میں اولیار اور والدین کو مدد دینے کے قابل نہیں رہتا جس کا نتیجہ اس کے والدین کی اس کی تعلیم سے وہ ناخوشی ہے جس کی شکایت عام طور پر کیجاتی ہے۔

موجودہ طریقہ تعلیم پر کافی روشنی ڈالی گئی اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ دیہات میں جس طریقہ سے تعلیم دیجاتی ہے صحیح اصول پر مبنی نہیں ہے۔ اب ان استقام کو

ظاہر کرنے کے بعد میں اپنا فرض یہ سمجھتا ہوں کہ اصلاحی تحریکات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میری رائے ناقص میں حسب ذیل اصلاحات مفید ثابت ہونگی۔
وہ یہ کہ دیہاتی مدارس کے لئے جو نصاب تعلیم مقرر کیا گیا ہے اس کی نظر ثانی کر کے اصلاح کیجائے اور نصاب میں وہ جملہ مضامین شامل کئے جائیں جو خود طالب علم اور اس کے قبیلے کے لئے مفید اور موزوں ثابت ہوں جب تک ایسا نہ کیا جائیگا۔ طالب علم قومی سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں پا سکے گا۔ اور اس میں رہ کر اس کی اصلاح اور ترقی کا باعث نہ ہوگا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ دیہاتی طالب علم زراعتی آب ہوا میں نشو و نما پاتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری اور لازمی ہے کہ مدارس میں دیہاتی تعلیم کو اہل دہ کے مناسب حال قرار دینے کے لئے مدارس میں زراعتی فضا پیدا کر دیجائے۔ تاکہ مدرسہ کی زندگی اور گھر کی معاشرت میں قدرے یکسانیت پیدا ہو جائے نصاب میں پڑھنے لکھنے اور حساب کے علاوہ مضامین ذیل بھی شامل کئے جائیں۔ (۱) مطالعہ فطرت (نیچر اسٹڈی) (۲) باغبانی اور مطالعہ زراعت۔ (۳) دستی مشاغل (دستکاری) (۴) حفظان صحت (۵) ورزش جسمانی اور ایسے کھیل جو اہل دہ کے لئے مناسب ہوں۔

دوسرے۔ یہ کہ ہر مدرسہ کے لئے خوش وضع ہوادار اور روشن عمارتیں بنائی جائیں ہندوستان کے مدارس تنگ و تاریک اور ناکافی امکنہ کی وجہ سے بدنام ہیں۔ ہر ابتدائی مدرسہ میں ایک باغیچہ لگایا جائے جس کا رقبہ تقریباً ایک ایکڑ ہو اس قسم کے باغیچے مدارس کو خوشنما بنانے کے علاوہ زراعتی فضا پیدا کرینگے جس سے طالب علموں میں زراعت کا شوق پیدا ہوگا۔ اور ان پر زراعت کی اہمیت اور جسمانی محنت کی قدر و قیمت ظاہر ہو گی۔ اس کے علاوہ اضلاع میں زراعتی مڈل اسکول اور ہائی اسکول قائم کئے جائیں۔

تیسرے یہ کہ جو اساتذہ دیہاتی مدارس میں مامور کیے جائیں وہ سب ٹرینڈ ہوں فی زمانہ ہندوستان میں ٹرینڈ مدرسین کا قحط ہے۔ علم زراعت وفلاحت کی ابتدائی تعلیم نارمل اسکول کے نصاب میں شریک کیجائے تاکہ اساتذہ اُن فنون سے واقف ہوں اور مدارس میں ان کی تعلیم خاطرخواہ دے سکیں۔ متذکرۂ صدر وہ چند طریقے ہیں جن کے اختیار کرنے سے موجودہ طریقہ تعلیم میں اصلاح ہو سکتی ہے ان تدابیر کو اگر اعلیٰ پیمانہ پر جاری کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اہل دہ میں تعلیم کا شوق نمایاں ہو جائیگا۔ اور تعلیم ملک میں قابل۔ سمجھدار۔ اور تندرست افراد پیدا کر سکے گی۔

ابتداً موجودہ طریقہ تعلیم پر روشنی ڈالی گئی۔ بعدہٗ اصلاحی تحریکات پیش کیگئی اب وہ مشکلات اور موانع بیان کئے جاتے ہیں جو اس اصلاحی طریقہ تعلیم کی اشاعت میں درپیش ہونگے۔ اہم ترین موانع جن کا رفع کرنا لازمی ہوگا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) روپیہ کی ضرورت (۲) ٹرینڈ مدرسین کی قلت۔

اگر ان دو دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کر لیا جائے تو دوسری منزلوں کا طے کرنا نہایت آسان ہے موجودہ طریقہ تعلیم میں اصلاح کرکے اس کو اہل دہ کے مناسب حال بنانے کے لئے کوئی ارزان تدبیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ جو اصلاحی تحریکات میں نے پیش کی ہیں ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے متعدد نارمل اسکول کے قیام۔ مدارس کے ساتھ باغیچوں کا وجود ٹرینڈ معلمین کا تقرر۔ امکنہ مدارس کی تعمیر لازمی ہوگی۔ اور یہ سب ایسی چیزیں ہیں۔ جن کے لئے رقم کثیر کی ضرورت ہوگی دیہاتی تعلیم کی اس وسیع اسکیم کو جاری کرنے کے لئے میری رائے میں صرف دو ذرائع ہیں۔ پہلا ذریعہ حکومت کی امداد اور دوسرا خانگی امداد۔

خانگی امداد | ہندوستان میں جس کا افلاس ضرب المثل ہے خانگی امداد پر

بھروسہ کرنا حماقت ہوگا۔ بیشک ہندوستان میں زمینداروں۔ جاگیرداروں۔ ساہوکاروں اور زراعت پیشہ افراد کی جماعت موجود ہے لیکن یہ بمقابل جملہ آبادی بالکل قلیل اور ناقابل لحاظ ہے۔ ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض بہی خواہاں ملک نے گرانقدر عطیات تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لئے دے ہیں۔ لیکن یہ بھی ملک کے کثیر ضروریات کے مقابلے میں ایسے شاذ و نادر ہیں جن کو نظر انداز کرنا مناسب ہے ہندوستان کا افلاس مسلمہ ہے اور جہاں جائے اور جس کام کو شروع کیجئے یہ افلاس مثل بھوت کے اپنی ڈراونی صورت سے مبہوت کر دیتا ہے اور سد راہ ہوتا ہے۔ جب اپنے ملک کی مالی حالت اس درجہ سقیم اور خستہ ہو تو خانگی امداد کا خیال ذہن سے نکالدینا اور صرف حکومت کی امداد پر سارا دارو مدار رکھنا چاہیئے۔

حکومت کی امداد ہر ملک میں تعلیم سرکاری امداد سے جاری رہنی اور حکومت کے موازنہ میں تعلیم کے مد کو پہلے جگہ ملنی چاہیئے اور ملک میں قابل اور باہنر افراد پیدا کرنے کے لئے ہر ریاست بلا چوں وچرا روپیہ صرف کرے حکومت کا تعلیمی معاملات میں بخل اور کفایت سے کام لینا مستحسن اور قابل ستائش نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ ایک مُسلّمہ امر ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جنگ عظمیٰ کے دوران میں جن ریاستوں نے حصہ لیا کامیابی کی دھن میں روپیہ کو مثل پانی کے بہا دیا۔ اگر حکومتیں بنی نوع انسان کی تباہی کے لئے روپیہ اس طرح صرف کر سکتی ہیں تو یقیناً ان سے یہ توقع کیجا سکتی ہے کہ وہ بنی آدم کی بہبود و فلاح کے لئے بخل سے کام نہ لیکیں چاہیئے کہ برٹش انڈیا اور نیز دیسی ریاستوں کے موازنہ میں تعلیم کا مد پہلا قرار دیا جائے جس قدر ممکن ہو سکے تعلیم کے لئے روپیہ دیا جائے میری رائے میں برٹش انڈیا اور دیسی ریاستوں کے دوسرے محکمہ جات میں تخفیف اور بچت کی بہت گنجائش باقی ہے اگر ان میں تخفیف کا عمل کیا جائے تو بہت کچھ روپیہ تعلیم کے لئے برآمد ہو سکتا ہے۔

اور اگر اس پر بھی ضروریات تعلیمی کی تکمیل نہ ہو تو قومی قرضہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اب تعلیم کے متعلق برٹش انڈیا کی پراونشل حکومتیں اور نیز دیسی ریاستیں کسی قدر فیاضانہ روش اختیار کر رہی ہیں۔ اور بمقابلہ سابق زیادہ روپیہ تعلیم پر صرف کر رہی ہیں بایں ہمہ واقعات اور حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ ملک کی تعلیمی ضروریات اس سے کہیں زیادہ ہیں ۱۹۲۵ء میں برٹش انڈیا میں تعلیم پر تقریباً (۱۴) ملین پونڈ صرف ہوئے جس میں سے (۹) ملین پونڈ ابتدائی و ثانوی تعلیم میں صرف کئے گئے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے جس کی کثیر آبادی کا شمار (۳۲۰) ملین ہے (۱۴) ملین پونڈ کا صرفہ ہوا جو بالکل ناکافی ہے۔ سال گذشتہ انگلستان میں جس کی آبادی (۴۵) ملین ہے تعلیم پر (۷۶) ملین پونڈ صرف کئے گئے۔

جاپان جو ایک مشرقی ملک ہے تعلیم کے لئے روپیہ صرف کرنے میں مغربی ممالک سے کچھ کم نہیں۔ نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات حیدرآباد نے جو کتاب جاپان کے طریقۂ تعلیم کے متعلق لکھی ہے۔ اس میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ جاپان نے تعلیم کے میدان میں اس قدر ترقی کی کہ ایک موضع میں جسکی آبادی (۴۲) نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک ابتدائی مدرسہ پایا گیا چنانچہ ہر ریاست کا فرض اولیں ہے کہ اپنی رعایا اور ان کی آئندہ نسلوں کی تعلیم کی کافی طور پر دیکھ بھال کرے لہذا برٹش انڈیا اور پراونشل حکومتیں اور ہندوستانی ریاستیں ہر ممکنہ ذریعہ سے اخراجات تعلیم کی فیاضانہ سربراہی کریں۔

مالی مشکلات اور ان کے ارتفاع کے متعلق کافی بحث کیگئی۔ اب میں امر دوم یعنے اساتذہ کے مسئلہ پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان اب تک اساتذہ کے معاملے میں نہایت بدقسمت رہا ہے۔ ہزارہا مرد۔ اور عورتیں معلمی کر رہے ہیں لیکن ان میں معدودے چند حقیقی معلم کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ہندوستان میں اچھے اور قابل معلمین کا کال ہے۔ اور جب تک لائق معلمین نہ ملیں دیہاتی نصاب کو کامیابی نصیب نہیں

ہو سکتی۔ ایک مدرسہ تحتانیہ کا معلم ممکن ہے کہ معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب کی تعلیم آسانی سے دے سکے اور طلبا کو اسباق حفظ کرا کر امتحان میں کامیاب کرائے لیکن اصول تذکرہ صدر کے بموجب تعلیم دینے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ پس یہ ضروری ہے کہ مدارس دیہی کے لئے بہتر معلمین فراہم کئے جائیں۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے میں تدابیر ذیل پیش کرتا ہوں وہ یہ کہ:۔

(۱) مدارس دیہی میں قابل اور ٹرینڈ اساتذہ مامور کئے جائیں بحالت موجودہ ہر مڈل یا تحتانیہ کامیاب شخص ابتدائی مدارس کی مدرسی کا اہل سمجھا جاتا ہے جو صحیح نہیں مدرسہ تحتانیہ کا مدرس اقلاً ایف اے کامیاب ہو اور معیار بتدریج بڑھایا جائے اور گریجویٹ کا تقرر کیا جائے

دوسرے یہ کہ کوئی معلم بجز اس کے کہ وہ کسی نارمل اسکول میں فن تعلیم حاصل کرے مامور نہ کیا جائے اور جو تعلیم نارمل اسکول میں دی جائے وہ اس نوعیت کی ہو کہ مدرسین دیہاتی مدارس کا نصاب آسانی اور عمدہ طریقہ سے پڑھانے کے قابل ہو جائیں۔

تیسرے یہ کہ مدرس کی مالی حالت کو بہتر کیا جائے۔ ہندوستان میں مدارس ابتدائیہ و تحتانیہ کے مدرسین نہایت قلیل تنخواہ پاتے ہیں۔ برٹش انڈیا میں ایسے مدرس کی تنخواہ ایک پونڈ دس شلنگ یعنی تقریباً ۲۰ - ۲۵ روپیہ ہوتی ہے۔ بسا اوقات اس سے بھی کم۔ ریاست حیدرآباد میں مدرسین کی حالت کسی قدر بہتر ہے یہاں ایک مدرس مڈل کامیاب اور ٹرینڈ ہو تو ۳۰ تا ۶۵ کے گریڈ کا مستحق ہوتا ہے اچھی قابلیت اور حیثیت کے مدرسین اس وقت ہمیں دستیاب ہوں گے جب کہ مدرسین کے مشاہرے معقول رکھے جائیں اور ان کے مستقبل کو امید افزا بنایا جائے۔ مدرسین مدارس تحتانیہ کے مشاہرات کی مقدار اتنی ہونی چاہیئے کہ

یونیورسٹی کے گریجویٹ بھی خوشی سے قبول کریں اور اس طرح مدارس تحتانیہ میں ہم یونیورسٹی کے گریجویٹ مامور کرسکیں۔

مضمون زیر بحث پر کافی روشنی ڈالی گئی اور میں اب آپکا زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا صرف خلاصہ مضمون پیش کرکے تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ جو بڑی مشکلات دیہاتی تعلیم کو دیہات کے مناسب حال بنانے میں حائل ہیں وہ یہ ہیں (۱) روپیہ کی ضرورت (۲) قابل اساتذہ کی قلت۔

ایک دفعہ یہ دو مشکلات حل کردے جائیں تو۔ پھر دیہات میں ایسی تعلیم جو اہل دیہہ کے مناسب حال ہو جاری کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا اور کوئی مشکل باقی نہ رہیگی۔

شہنشاہی تعلیمی کانفرنس

مولوی سید علی اکبر صاحب یم۔اے (کینٹب)

شہنشاہی تعلیمی کانفرنس (امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس) کا تیسرا اجلاس بمقام لندن ۲۰ جون سے ۸ جولائی تک منعقد ہوا جس میں سلطنت برطانیہ کی ۴۵ حکومتوں کے نمائندے شریک تھے ڈچیز آف ایتھال پارلیمنٹری سکرٹری وزارت تعلیمات صدر منتخب ہوئیں۔ لیکن ان کی خواہش پر بعض اجلاسوں کی صدارت مسٹر آر منزلی گور پارلیمنٹری انڈر سکرٹری وزارت نوآبادیات نے فرمائی۔ ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا اور اپنی افتتاحی تقریر میں کانفرنس کی اہمیت اور مختلف ممالک کے عہدہ داران تعلیمات کے اجتماع اور تبادلہ خیالات سے جو تعلیمی اتحاد عمل اور دیگر فوائد مترتب ہو سکتے ہیں ان کا ذکر فرمایا۔

کانفرنس میں جن تعلیمی امور پر غور کیا گیا ان میں سے اکثر ہندوستان کی دلچسپی سے متعلق تھے۔ سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ نصاب اور طرز تعلیم ایسا ہونا چاہیئے کہ مدرسہ کی تعلیم اور مدرسہ کے باہر کی طالب علم کی زندگی اور ماحول میں باہمی تعلق پیدا ہو جائے اور نیز یہ کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ تحتانیہ کا نصاب ختم کر کے طلبہ اپنے رجحان کے مطابق کسی پیشہ کی یا ادبی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس اصول کو عام طور پر تسلیم کیا گیا کہ مدارس تحتانیہ کی تعلیم حتی الوسع عملی ہونی چاہیئے لیکن پیشہ کی تعلیم کا آغاز اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ طالب علم تحتانیہ کا نصاب ختم کر کے گیارہ یا بارہ سال کے سن کو نہ پہنچ جائے۔

ہندوستان میں پیشوں کی تعلیم کا ذکر فرماتے ہوئے مسٹر رچی سابق کمشنر تعلیمات حکومت ہند نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں صنعتی تعلیم صرف کانپور جیسے مقامات پر کامیاب ہو سکتی ہے جہاں اس کی مانگ ہے اور طلبا کو بعد فراغت تعلیم آسانی سے معاش کے ذرائع میسر آ سکتے ہیں۔ زراعتی تعلیم کے متعلق صاحب موصوف نے فرمایا کہ خالص زراعتی مدارس وسطانیہ قائم کرنے سے بہتر تو یہ ہوگا کہ معمولی مدارس وسطانیہ میں ایسے طلبا کو جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے زراعتی تعلیم دی جائے۔

دیہات کی تعلیم اور دیہاتی زندگی میں تعلق پیدا کرنے کی مشکلات پر مولوی سید محمد حسین صاحب اور دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے مسئلہ پر راقم الحروف کے مضامین اسی پرچہ میں علیحدہ درج ہیں۔ دیگر مضامین میں ڈاکٹر ویسٹ کا مضمون انگریزی کی تعلیم پر قابل ذکر ہے۔ صاحب موصوف نے یہ فرمایا کہ ہندوستان میں انگریزی کی تعلیم اس طرح دینی چاہیئے کہ طلبا میں نہ صرف درسی بلکہ دیگر انگریزی کتب کے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو تاکہ وہ جدید معلومات سے بہرہ ور ہو سکیں۔

امتحانات کے بارہ میں مقررین نے عام طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ مدارس کی تعلیم محض امتحانات کی خاطر نہیں ہونی چاہیئے اور اس ضمن میں بچوں کے تعلیمی رکارڈ رکھنے پر زور دیا گیا اور معائنہ مدارس کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے گئے کہ افسران معائنہ کنندہ کو نہ صرف مدرسہ کی عمدہ تعلیمی حالت جانچنی چاہیئے بلکہ ان پر لازم ہے کہ وہ تعلیمی معاملات میں مشیر اور رہبر بھی بنیں۔

علاوہ معمولی اجلاسوں کے حسب ذیل مضامین کے لئے خاص اجلاس مقرر کئے گئے جن میں ہر مضمون کے ماہرین کو مدعو کیا گیا تھا۔ (۱) تاریخ وجغرافیہ سلطنت برطانیہ (۲) تعلیم میں سینما کا استعمال (۳) لاسلکی کی مدد سے تعلیم (School Broadcasting) (۴) تعلیم بالغان (۵) ذہنی پیمائش (۶) کند ذہن بچوں کا مسئلہ (۷) طبی معائنہ مدارس اور تربیت جسمانی سینما پر تقاریر کے ضمن میں تعلیمی فلم بتلائے گئے جو مطالعہ فطرت اور جغرافیہ سے متعلق تھے۔ ان ہر دو مضامین و نیز ایک حد تک تاریخ کی تعلیم کے لئے سینما نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ مدرس صحیح طریقہ سے اس کا استعمال کرے۔ کانفرنس میں یہ بھی بتلایا گیا کہ انگلستان کے مدارس میں غیر زبانوں اور موسیقی کی تعلیم میں لاسلکی سے کس طرح مدد لی جاتی ہے۔

منجملہ اور دعوتوں کے حکومت برطانیہ کی جانب سے کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں کو ڈنر دیا گیا اور بتاریخ ۲۴ ہر جون ۲۷ء بکنگھام پیالیس میں جو گارڈن پارٹی منعقد ہوئی اس میں شرکاء کانفرنس نے ملک معظم و ملکہ کے سامنے پیش ہونے کی عزت حاصل کی۔ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد نمائندوں نے مختلف تعلیمی مقامات کا ایک نظام العمل کے تحت معائنہ کیا۔

اس کانفرنس سے دوسرے فوائد کے ساتھ ساتھ نمائندوں پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ باوجود ملکی و نسلی اختلافات کے بہت سے تعلیمی مسائل ایسے ہیں جو مشترک

ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ تعلیمی امور میں اتحاد عمل صرف اسی قسم کے جلسوں سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ مختلف ممالک کے نمائندوں کو ایک دوسرے سے میل جول پیدا کرنے اور تعلیمی تجربوں حالات اور مسائل پر تبادلۂ خیالات کا اچھا موقعہ ملا۔

سیر گولکنڈہ

مولوی شیخ محبوب صاحب مددگار مدرس مدرسۂ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ

کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ تاریخی مقامات کی سیر کو ماہرین تعلیم نے جو اہمیت دی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یوں تو طلباء اساتذہ حضرات کے سبق اور نقشوں کی مدد سے تاریخی معلومات حاصل کر سکتے ہیں مگر جب ان واقعات کو ایسی جگہ پر جہاں وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں سمجھایا جاتا ہے تو طلباء کے ذہن میں وہ معلومات پتھر کی لکیر ہو جاتے ہیں بڑے بڑے سلاطین کے حالات جب ان کے قبور پر لے جا کر طلباء کو سمجھائے جاتے ہیں تو اچھی طرح سے سمجھنے کے علاوہ ان مقابر اور اس کے اندر آرام کی نیند سونے والوں سے بیحد عبرت ناک سبق حاصل ہوتے ہیں۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے مدرسہ ہذا کے طلباء کی ایک تعلیمی سیر کا انتظام کیا گیا تھا۔ گولکنڈہ جانے سے قبل متعلقہ اساتذہ نے طلباء کو پہلے ان حالات سے آگاہ کیا جو وہاں پر بتائے جانے والے تھے تمام طلباء کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے اساتذہ کے حوالے کیا گیا تھا اور طلباء کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کاپی اور پنسل رکھیں اور اساتذہ جو باتیں بتاتے جائیں ان کے مختصر نوٹ لکھ کر گھر میں آکر ان پر ایک مضمون لکھیں۔

طلباء کی سواری کے لئے موٹر لاریوں کا انتظام کیا گیا تھا جس کے لئے

ہم مولوی عبدالعزیز صاحب مالک کریم موٹر ٹکسی ہوز کے بیحد ممنون ہیں کہ صاحب موصوف نے اپنی عنایت سے کرایہ میں خاص تخفیف کر دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مدارس کے طلبار کے ساتھ اسی قسم کی رعایت کرنے کا وعدہ بھی کیا

غرض صبح کے ½ ٦ سے تمام طلبار مدرسہ کی عمارت سے موٹر لاریوں کے ذریعہ گولکنڈہ روانہ ہوئے۔ وہاں پر ٹھیرنے کے لئے موتی محل میں انتظام کیا گیا تھا۔ تمام طلبار کے پہنچنے کے بعد ان کی حاضری لی گئی اور چونکہ مطلع ابر آلود تھا اور جائے قیام سے مقابر کسی قدر فاصلہ پر تھے پہلے مقابر کی طرف بچوں کو لے جایا گیا ہر ایک مقبرہ کے سامنے متعلقہ اساتذہ کے علاوہ مولوی غلام دستگیر صاحب اول مددگار مدرسہ نے صاحب مقبرہ کے حالات بیان کئے۔ خاصکر جب طلبار کو محمد قلی قطب شاہ اور اس کے بیٹے جمشید قلی قطب شاہ کے مقابر پر پہنچنے کے بعد یہ سمجھایا گیا کہ تاریخ اپنے قصہ کو دہراتی ہے اور جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی۔ مقابر سے لوٹنے کے بعد طلبار نے خوب جی بھر کر کھانا کھایا۔ اور کھانے سے فراغت پا کر طلبار اور اساتذہ میں کچھ دیر تک مقابر کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اس کے بعد قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ قلعہ میں پہنچکر طلبار کو قلعہ اور مشہور عمارتوں کے تاریخی حالات بتائے گئے اور بالاحصار پر پہنچکر طلبار کو کاغذی برج اسکی وجہ تسمیہ اور اس مقام کا معائنہ کرایا گیا جہاں پر اورنگ زیب عالمگیر کی فوج کا کیمپ تھا۔ گولکنڈہ پر حملہ اور اس کے فتح کے تمام واقعات سمجھائے گئے اور جامع الفاظ میں طلبار سے قلعہ کی اس حالت کا حال بیان کیا گیا جبکہ اس میں ابوالحسن تاناشاہ قیام پذیر تھے۔ ان حالات کے سننے میں طلبار نے خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کے بشرے سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اسی ماحول اور اسی زمانہ میں مجھ رہے ہیں۔

قلعہ کی سیر میں شام ہوگئی وہاں سے لوٹ کر طلبار نے چائے پی اور روانگی کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ واپسی کے وقت سورج کی زرد زرد شعاعیں مقابر کے کلس پر ایک خاص لطف دے رہی تھیں۔ شام کے وقت جو مقابر پر سناٹا چھایا ہوا تھا وہ بیحد عبرت ناک تھا۔ مدرسہ ہاشمیہ کے صدر مدرس صاحب خاص طور پر قابل شکریہ ہیں جنہوں نے برتن فرش اور پانی کا انتظام کر کے طلبار اور اساتذہ کو بیحد آرام پہنچایا۔
واپسی کے دوسرے دن طلبار کے مضامین دیکھے گئے۔ مضامین کے دیکھنے اور سوالات کرنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ طلبار پہلے سے زیادہ تمام حالات سے واقف ہو گئے ہیں اور اب وہ ان تمام حالات کو عمر بھر فراموش نہیں کر سکتے۔

متفرقات

کُل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

یوں تو دنیا چل چلاؤ کی جگہ ہے۔ جو چیز عدم سے وجود میں آتی ہے اس کا پھر کتم عدم میں پنہاں ہونا ضروری ہے۔ ہماری ہستی فنا کا پیش خیمہ ہے۔ مگر قابل افسوس ہے وہ موت اور قابل حسرت ہے وہ جدائی جو قبل از وقت ہو۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

یہ کل کی بات ہے کہ نہ صرف ہم بلکہ وہ تمام حضرات جن کو ادبی دنیا سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کے پاس جاتے تھے اور صاحب موصوف اپنی زریں و صائب رائے اور قیمتی مشوروں سے رہنمائی فرماتے تھے لیکن کیا خبر تھی کہ ایک ہنستی بولتی ہستی جو طاقت و صحت کا مجسمہ تھی، چند ہی مہینوں کی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہکر ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے جائیگی۔

مرحوم دھلی کے باشندے تھے مگر ایک عرصہ سے حیدرآباد میں قیام پذیر تھے مختلف خدمات کو انجام دینے کے بعد دفتر کمشنری امتحانات کے عہدۂ معتمدی سے سرفراز کئے گئے تھے۔ مرحوم جس محکمہ میں رہے اس کو اپنی ہمدردی قابلیت اور جانفشانی سے کہیں کا کہیں کر دیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا دفتر مجلس اپنے ابتدائی مرحلوں کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں مرحوم ہی کا رہین منت ہے۔ اخلاق کا یہ حال تھا کہ

غریب سے لے کر امیر تک سب کے ساتھ آپ کا برتاؤ یکساں رہتا کسی نے آج تک آپ کو کبھی مغموم نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ روحانی اور جسمانی تکالیف کے مواقع پر بھی آپ کے ہونٹ تبسم سے خالی نہیں رہتے تھے۔ آپ فرقہ واری جھگڑوں سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ آپ کے پاس ملکی غیر ملکی ہندو مسلمان عیسائی اور پارسی سب برابر تھے۔ ابرِ نیساں کی طرح آپ کا فیض عام تھا اور ہر شخص حسب استعداد و ظرف جلب منفعت کرتا تھا۔ باوجود اردو اور انگریزی میں ماہر ہونے کے آپ ہمیشہ شہرت سے بھاگتے رہے۔ آج تک کسی نے آپ کی زبان سے کوئی تعلّی آمیز جملہ نہیں سنا۔

مرحوم کی علمی زندگی اور ذوق و شوق کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اردو دنیا کا کون ایسا شخص ہے جو مرحوم کی انوکھی ہندی بحروں میں اردو سخن سنجی اور نت نئے مضامین نثر سے واقف نہیں ہند کی شاعری جو عربی اور فارسی کی اجنبی بحروں کے جامہ میں عشوق بدلباس کے مثل تھی اپنی موجودہ ابتدائی نکھار کے لئے آپ ہی کی رہین منت ہے۔ انوکھی اور غیر مانوس ہندی بحروں میں اردو شاعری کا ڈھالنا آپ ہی کا حق تھا۔ شاعری کے اس تغیر کے لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ مرحوم اپنے زمانہ کے حالی تھے تو بیجا نہ ہوگا اور اس میں تو کسی کو شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ صاحب موصوف کی موت ایک قومی نقصان ہے۔

صاحب موصوف کو انجمن اساتذہ مستقر بلدہ۔ سے خاص دلچسپی تھی۔ اظہار رنج و غم کے لئے ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں

مولوی احمد حسین خاں صاحب نے پہلے تو مختصر طور پر مرحوم کی زندگی کے حالات بیان کئے اور اس کے بعد یہ رزولیوشن پیش کیا:۔

"اراکین انجمن اساتذہ بلدہ حیدرآباد مولوی عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم معتمد کمشنر امتحانات سرکار عالی کی بے وقت و جوان مرگ وفات پر اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوے محسوس کرتے ہیں کہ اس وفات سے نہ صرف ملک سرکار عالی میں تعلیمی مفاد کو بلکہ اردو ادب کیلئے مرحوم کی خدمات کے مدنظر سارے ہندوستان کو سخت نقصان پہنچا اور اراکین انجمن مذکور اس جانکاہ مصیبت میں مرحوم کے پسماندگان سے خلوص دلی کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ حاضرین مجلس نے خاموش کھڑے ہو کر اس تحریک کو منظور کیا"

ایلباٹی کیمپ سٹی کالج کے اسکاوٹس کا ایک کیمپ چہارشنبہ ۷ ستمبر ۲۷ء سے یکشنبہ ۱۱ ستمبر ۲۷ء تک رسالہ جبوشس کے قریب کی پہاڑیوں پر ڈالا گیا تھا۔ کیمپ کا محل وقوع اسکاوٹنگ اور عام نقطۂ نظر سے نہایت اچھا تھا۔ اس کیمپ میں ۸ پٹرول کے ۵۲ اسکاوٹس شریک تھے۔ دوران کیمپ میں جماعتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ انفرادیت کا بھی کافی لحاظ رکھا گیا۔ پروگرام نہایت دلچسپ تھا کام کی ابتداء مالک حقیقی کے چوکھٹ کی ناصیہ فرسائی سے جو ایک فطرتی امر ہے شروع ہوتی تھی۔

پہلی شب میں تمام طلبار کو رصدگاہ نظامیہ میں اجرام فلکی کی سیر کرائی گئی تیسری شب کی کیمپ فائر میں مسٹر سید محمد ہادی ناظم ورزش جسمانی و اسکاوٹس بعض احباب کے ساتھ شریک محفل تھے۔ دوران قیام کیمپ میں مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل

سٹی کالج اور ایک اسکاوٹ نے تمام اسکاوٹس کو چائے پر مدعو کیا تھا۔
آخر دن صدر اعظم بہادر باب حکومت نے اپنی تشریف آوری سے کیمپ کو زینت بخشی مہاراجہ بہادر تقریباً ایک گھنٹہ تک کیمپ میں ٹھیرے رہے۔ طلباء نے فوری امداد مجروحین پل بنانے اور جھنڈیوں کے کام دکھائے جن کو دیکھکر معزز مہمان نے اظہار خوشنودی فرماتے ہوئے دوسو روپیہ کے گراں بہا عطیہ سے سرفراز فرمایا اور اپنے صاحبزادوں کو بھی اس عالمگیر برادری میں شریک کرنے کی خواہش ظاہر فرمائی کیمپ کو کامیاب بنانے اور حسن انتظام پر مسٹر ٹی۔ ین۔ سیون کیمپ چیف قابل مبارکباد ہیں

اسکاوٹس ڈے اسکاوٹنگ کی عالمگیر تحریک کا یہ مبارکباد دن ہر سال ۱۴ اکتوبر کو دنیا کے ہر حصہ میں منایا جاتا ہے۔ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی حیدرآباد کے اسکاوٹس نے اس دن کو نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منایا اور نلگنڈہ کے طلباء نے شرکت سے اپنے دلی جوش اور سرگرمی کا ثبوت دیا۔

گو اس روز غیر معمولی طور پر صبح سے بارش ہو رہی تھی مگر فدایان تحریک کے ولولوں اور جوش کی آتش کو یہ بھی فرو نہ کرسکی۔ باوجود تقاطر کے مہاراجہ بہادر ٹھیک وقت پر تشریف فرما ہوئے۔ مختلف ٹروپس نے اپنے اپنے کام دکھائے اور ایک ٹروپ کو جو جھنڈیوں کے اشارے سے اردو میں پیغام رسانی میں مصروف تھی مہاراجہ بہادر نے ایک پیغام دیا جو دوسری طرف بالکل صحیح وصول ہوا۔ مہاراجہ بہادر نے اس پر اظہار خوشنودی فرمایا۔ مہاراجہ بہادر کی تقریر دلپذیر کے بعد سر سید محمد ہادی نے معزز مہمان اور دیگر حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

واپسی ریاست حیدرآباد کی طرف سے مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری نائب ناظم

تعلیمات اور مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ جو امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لندن میں حصہ لینے بھجوائے گئے تھے۔ ۱۰ اکتوبر ۲۷ء م ۱۴ آبان ۳۶ف یوم شنبہ کو شام کی گاڑی سے واپس ہوئے۔ صاحبان موصوف کی استقبال کی خاطر تعلیمات و دیگر محکمہ جات کے عہدہ دار اور اساتذہ حضرات اسٹیشن پر تشریف فرما ہوئے تھے مدارس وسطانیہ دارالشفاء اور شاہ علی بنڈہ کے اسکاوٹس بھی استقبال کے لئے موجود تھے۔

مسٹر کپتھال اپنی طویل رخصت کے بعد حیدرآباد واپس ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے طلبار و مدرسین اور دوسرے محکموں کے بعض حضرات نے اسٹیشن پر صاحب موصوف کا استقبال کیا۔

مدرسہ فوقانیہ بیدر صدر اعظم بہادر باب حکومت کے قیام بیدر کے زمانہ میں وہاں کے مدرسہ کے اساتذہ اور طلبار نے آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ جس کے جواب میں نواب صدر اعظم بہادر نے اپنے دلی جذبات اور تعلیمی معاملات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے طلبار کو نصیحت فرمائی کہ وہ بھی تعلیمی معاملات میں دلچسپی لیں اور ملک و مالک کی وفاداری میں ثابت قدم رہیں۔

مدرسۂ وسطانیہ سنگاریڈی سے صدر اعظم بہادر کی تشریف آوری کی رپورٹ آئی ہے جو مجملاً ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

صدر اعظم بہادر کی تشریف آوری سے قبل تمام دفاتر کو اسکی اطلاع مل چکی تھی اور ان تمام محکمہ جات نے دفاتر کو مزین کرنے میں نہایت فراخدلی سے کام لیا تشریف آوری سے ایک روز قبل مولوی عبدالعزیز خاں صاحب بی۔ اے صدر مہتمم تعلیمات صوبہ میدک وہاں موجود تھے۔ مدرسہ کو خوب آراستہ کیا گیا تھا اور مدرسہ کے دروازہ پر صدر مہتمم صاحب اور مہتمم صاحب تعلیمات اور صدر مدرس صاحب بغرض استقبال کھڑے ہوئے تھے صدر اعظم بہادر کی تشریف آوری کے بعد اسکاوٹس نے سلامی اتاری اور

اس کے بعد صدر اعظم بہادر مدرسہ کے ہال میں جو خوب سجایا گیا تھا تشریف فرما ہوئے
مدرسہ کی جانب سے ریشمی پھولوں کا ہار جو خود مدرسہ کا تیار کیا ہوا تھا پیش کیا گیا جس کو
شرف قبولیت بخشا گیا۔ اس کے بعد مدرسین پیش کئے گئے۔ حمد باری۔ ترانہ اور قصائد
سنائے گئے۔ صدر اعظم بہادر نے تمام جماعتوں کا معائنہ فرمایا اور ایک نابینا بچہ کو جو حفظ
کلام مجید کے لئے مدرسہ آیا کرتا تھا (صہ) کے عطیہ سے سرفراز فرمایا۔

مدرسہ کی جانب سے صدر مہتمم صاحب میدک نے معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا
جس کے جواب میں صدر اعظم بہادر نے مدرسہ کی تعلیمی حالت پر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور بوقت
مراجعت (مار) ایک سو روپیہ مدرسہ کو شیرینی کے لئے اور پچاس روپیہ نظم خوان بچوں کو عطا فرمائے

مسز سروجنی نائیڈو مسز سروجنی نائیڈو نے اپنے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں سٹی کالج کا
معائنہ کیا اور سٹی کالج کے بڑے ہال میں لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے اتفاق و اتحاد اور
ملک و مالک کی وفاداری کے متعلق زریں خیالات کا اظہار کیا۔ کالج کا معائنہ کرکے
مسٹر سید محمد اعظم پرنسپل کے حسن انتظام اور سلیقہ کی داد دی۔

طلبائے قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ نے بتاریخ ۱۲ اکتوبر بوم جمعہ مسز سروجنی نائیڈو کو
سینٹ جارجس کے بڑے ہال میں (Youth and Tomorrow) شباب اور فردا
پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا تھا گو جلسہ کا وقت ۶ ½ ساعت شام رکھا گیا تھا مگر بلبل ہند
کی نغمہ سرائی جسکی مدت سے آرزو تھی وارفتگان ادب کو وقت سے بہت پہلے کھینچ لائی
ٹھیک وقت پر صاحبہ ممدوحہ تشریف فرما ہوئیں۔ حضار مجلس میں سے بعض ہستے چلتے حضرات
نے لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ممدوحہ سے کھلی جگہ میں تقریر کرنے کی استدعا کی۔ مضمون
زیر بحث پر تقریباً ایک گھنٹہ تک تقریر ہوتی رہی جس میں ملک کے نوجوانوں کو انکے
اسلاف کے کارنامے بیان کرکے انکی تقلید اور زائل شدہ رفعت کو حاصل کرنے کیلئے
ابھارا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اتفاق و اتحاد کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ریاست

حیدرآباد اور اس کے عظیم الشان مالک کی وفاداری پر ثابت قدم رہنے کی نصیحت کیگئی۔

انجمن اتحاد کلیہ عثمانیہ کی طرف سے ٹاؤن ہال میں مسز نائیڈو کو (The candle of woman) پر تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ ہال میں داخلہ کے لئے ٹکٹ مقرر کئے گئے تھے جو عثمانیہ کالج کی طرف سے قدیم اور موجودہ طلبار کو تقسیم کئے گئے۔

پروفیسر سیشادری کو جو بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں یونیورسٹی کی طرف سے حیدرآباد میں مدعو کیا گیا تھا۔ صاحب موصوف نے یونیورسٹی کی طرف سے دو لکچر "انگریزی ادب" پر ٹاؤن ہال میں دئے۔ اثنائے قیام ہیں۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ نے بھی پروفیسر موصوف کو ایک عام جلسہ میں "مدارس ثانویہ میں انگریزی ادب کی تعلیم" پر اظہار خیالات کے لئے مدعو کیا تھا۔ یہ جلسہ نظام کالج میں بتاریخ ۱۱۔ آذر ۱۳۳۵ف م ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء بصدارت مسٹر کے۔ برنٹ پرنسپل نظام کالج منعقد ہوا۔ پروفیسر صاحب نے پون گھنٹہ تک اصل موضوع پر تقریر فرمائی۔ اور صدر جلسہ کی تقریر کے بعد مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے (کینٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و میر مجلس انجمن اساتذہ نے صدر جلسہ۔ مقرر صاحب اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ بلدہ اور سکندرآباد کے تقریباً ڈھائی سو مدرسین کے علاوہ تعلیمات کے بہت سے عہدہ دار اور پروفیسر صاحبان نظام کالج و طلبار موجود تھے۔

انجمن اساتذہ شاخ ریسیڈنسی میں وکٹوریہ کالج گوالیار کے پروفیسر مسٹر آر۔ کے۔ ککلکرنی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے بتاریخ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء بصدارت مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے (کینٹب) "جدید تعلیمی خیالات" پر ایک پر مغز تقریر کی۔ اثنائے تقریر میں صاحب موصوف نے جرمنی اور امریکہ کے ان مدارس کا ذکر کیا جن کا انھوں نے معائنہ کیا تھا اور آجکل یورپ اور امریکہ میں جو جدید تعلیمی لہر پھیل رہی ہے اسکی خصوصیات بیان کیں۔

پہلے یہ کہ طلبار خود بخود عمل اور مطالعہ کے ذریعہ سے اپنی معلومات بڑھائیں اور

دوسرے یہ کہ مدرسہ کے انتظامات خود طلباء کے سپرد کئے جائیں اور تیسرے یہ کہ جسمانی سزا مطلق نہ دی جائے۔ اور طلباء میں حتی الامکان عمدہ عادات پیدا کرنیکی کوشش کیجائے۔

اختتام تقریر پر صدر صاحب جلسہ نے جرمنی کے حالات اختصار کے ساتھ بیان فرمائے اور اسی ضمن میں وہاں کے طلباء کے اولیاء اور اساتذہ کے تعلقات طبی معائنہ مدارس اور جسمانی تربیت کے طریقوں پر روشنی ڈالی اور آخر میں انجمن کی جانب سے پروفیسر کللکرنی کا شکریہ ادا کیا۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس اس سال ٹاؤن ہال میں منعقد ہوئے تھے کانفرنس دیوالی کی چھٹیوں میں ہوتی رہی۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر کا خطبہ صدارت پر از معلومات اور دلچسپ تھا۔ کانفرنس کے تفصیلی حالات پر آیندہ اشاعت میں روشنی ڈالی جائیگی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بتاریخ ۲۶-۲۷ و ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء منعقد ہوں گے حیدرآباد کے تعلیمی اور قومی شوق کو ابھارنے کے لئے ایک مقامی کمیٹی قائم کیگئی ہے جس کے صدر نواب سر امین جنگ بہادر۔ نائب صدر نواب ذوالقدر جنگ بہادر معتمد اعزازی مولوی عبد العزیز خاں صاحب صدر مہتمم میدک اور مولوی حفیظ اللہ صاحب پرنسپل ٹرننگ کالج شریک معتمد مقرر ہوئے ہیں۔ اس کانفرنس کی استقبالی کمیٹی کا چندہ رکنیت دس کلدار اور عام رکنیت کا چندہ (صہ) کلدار ہے۔

جو صاحب اس کانفرنس میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنا چندہ مولوی حفیظ اللہ صاحب پرنسپل ٹرننگ کالج خیریت آباد کے پتہ پر روانہ فرما سکتے ہیں۔ جہاں سے ان کو ایک رسید ملیگی جس کے بوقت اجلاس پیش کرنے پر ٹکٹ داخلہ حاصل ہوسکیگا۔

ٹریننگ کے لئے اس سال ریاست حیدرآباد کی طرف سے دو مدرس ڈھاکہ اور چار مدرس مسلم یونیورسٹی علیگڈھ بھجوائے گئے ہیں۔

(۱) مسٹر ڈنکر نارائن راؤ بی۔اے صدر مدرس مڈل اسکول دارالشفاء۔
(۲) مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب بی اے (عثمانیہ) صدر مدرس ہائی اسکول کریم نگر۔
(۳) مولوی شیخ علی حسین صاحب بی۔اے (عثمانیہ) مڈل اسکول مستعد پورہ۔
(۴) مولوی اسد اللہ صاحب رضوی بی اے (عثمانیہ) مدوگار ہائی اسکول پربھنی۔
(۱) مسٹر راجندر راؤ صاحب بی۔اے مدوگار گورنمنٹ ہائی اسکول چادرگھاٹ۔
(۲) مسٹر جوشی اورنگ آباد۔

قطعہ تاریخ وفات مولوی عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم
مولوی محمد فاضل صاحب مدرس مڈل اسکول شاہ علی بنڈہ

مہر تابانِ آسمان ادب — در سحاب اجل چو روے نہفت
سالِ رحلت بگوشِ دل ہاتف — کاملِ عصر عظمت اللہ گفت
۱۹ ۲۷ء

تنقید و تبصرہ

یوں تو بہت سے اخبارات جاری ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی نوابتدا اور انتہا ایک ہی ہوتی ہے اور بعض رطب و یابس لئے اپنی زندگی کے دن گذارتے رہتے ہیں۔ مگر بہت کم اخبار ایسے ہیں جو حقیقی معنوں میں ملک کی خدمات بجا لاتے ہیں۔

اگر ہم "صبح" کے سالانہ نمبر کے متعلق یہ کہیں کہ ہندوستان کے روزآنہ اخبارات میں صرف یہی ایک اردو اخبار ہے جس نے اپنے سالانہ نمبر کو اچھی تصاویر کے ساتھ نہایت آب و تاب اور بصرف زر کثیر شائع کیا تو بیجا نہ ہوگا جس کے لئے مولوی سید احمد محی الدین صاحب مدیر اور مولوی عبد اللہ خاں صاحب شریک مدیر قابل مبارکباد ہیں اور یہ سالانہ نمبر مقامی حالات کے مضامین اور شہریار دکن ملک کی سربرآوردہ ہستیوں

اور مشہور مقامات کی تصاویر کے لحاظ سے اپنا آپ نظیر ہے۔
مختلف مذاق کے مضامین جمع کئے گئے ہیں سنجیدہ مضامین کے ساتھ ساتھ پر لطف
مضامین لئے گئے ہیں۔
غرض ہر لحاظ سے ہمارے ملک کے اخبار کی یہ کوشش نہایت اچھی اور کامیاب ہے

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نام پلی سے وہاں کے سالانہ جلسہ کی روئداد دیر میں ملی۔ تاہم مختصراً چند اہم باتیں درج کیجاتی ہیں۔ فوقانیہ کا سالانہ جلسہ نواب ذوالقدر جنگ بہادر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جسمیں شہر کے مدارس کے اکثر صدر مدرسین دوسرے عہدہ داران تعلیمات اور طلبا رکے اولیا رمدعو تھے صدر مدرس صاحب نے مدرسہ کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں مدرسہ کی تعلیمی حالت پر اظہار خوشنودی فرمایا مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے (کینٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے معزز صدر اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مدرسہ کے اسکاؤٹس نے بعض کرتب دکھلائے۔ مدرسہ کے بچوں کو انعامات بھی تقسیم کئے گئے۔ مدرسہ کی طرف سے تعلیمی نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

جاگیردار کالج میں تبادلہ ہونے اور وہاں سے علیگڈھ جانے کی وجہ سے رسالہ ہذا اپنے قدیم ایڈیٹر مولوی ندیم الحسن صاحب کی خدمات سے اب محروم ہوگیا۔ صاحب موصوف نے رسالہ کے ابتدائی زمانہ میں جس دلچسپی اور محنت سے کام لیا اس کے ہم شکر گذار ہیں۔

نظام گزٹ

ہفتہ وار

چار مینار حیدر آباد دکن

کا پہلا پرچہ ۹ دے ۱۳۳۷ف بروز دوشنبہ اعظم اسٹیم پریس سے
نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا اور ہر دوشنبہ کو شائع ہوگا۔

چندہ ہندوستان کے لئے

سالانہ مع محصول ڈاک	لے
ششماہی "	۸ر
سہ ماہی	عاں
فی پرچہ	۲ر۶مر

اشتہارات کے ساتھ اجرت ہر صورت میں پیشگی وصول ہونی چاہیئے۔
اشتہار کا مضمون صاف خط اور صحیح اردو میں ہو۔ خلاف تہذیب اشتہار نہیں لئے جائینگے
دفتر سے اشتہار کا نرخ معلوم ہوسکتا ہے۔ فقط

منیجر

on the other. The sonnets of his college days won for him the admiration of his professors and others. The study of his favourite poem Tennyson's Immemoriam', made him early in life tackle the eternal problems of life and death. My friendship with him ran an uninterrupted course of over twenty-five years, and early in 1926 I noticed him reading a voluminous work called "Death and its Mysteries". When questioned why he worried himself with such gloomy subjects, he courteously replied "Sooner or later death must come to all; shall we not seek solace by such a study"? The conversation which then followed convinced me that the soul was soaring high above the sensuous plane or, at least, had the premonitions of a journey into a region "from the bourne of which no traveller returns".

His out-look on life was naturally broad and his sympathies were no less cosmopolitan. If his work on "Nationalities" should ever see the light of day, it would be a valuable contribution to our national literature.

His Urdu poems were indeed excellent, both from the stand-points of inimitable style and profound thought, and remind one of a Shelley or a Keats. Urdu literature is poorer for this sudden disappearance of a young promising poet.

His official career demanded of him strenuous labour and when one observed him delightfully wading through voluminous official files and examination records, one always felt that to him, as to Thomas Carlyle, "Duty is religion".

His genial disposition and many fine qualities of head and heart entitle him to be regarded as an example of a perfect gentleman.

May his soul rest in peace!

OBITUARY NOTICE.

It is which feelings of deep regret and sorrow that we announce the sad death of Mr: Azmattullah Khan, B. A., Secretary to the Commissioner for Government Examinations, which occurred on the 14 th October, 1927 at Madanapally, where the deceased had been removed for treatment. The late Mr: Azmatulla Khan was one of the ablest and most popular officers of the Education Department. His untimely death is greatly mourned by the members of the Hyderabad Teachers' Association, who at a meeting held on the 17 th October, 1927, passed the following resolution :—

"The members of the Hyderabad Teachers' Association express their deep sense of regret and-sorrow at the untimely death of Mr: Azmatullah Khan, Secretary to the Commissioner for Government Examinations, and consider that his death is not only a great loss to the cause of education in Hyderabad, but also to the cause of Urdu literature throughout India. They also desire to offer their heartfelt condolences to the members of the bereaved family".

We publish below a short note on the late Mr. Azmattullah Khan which we have received from Mr. G. A. Chandawarkar. M. A., Head Master, Residency Middle School, Hyderabad Deccan :—

The late Mr: Azmatullah Khan received his early education in the Hyderabad Residency High school and later on took his B. A. degree from the Ajmere College (Allahabad University) with philosophy as his optional subject. Besides being fond of philosophy, he was endowed with a poetic gift of no mean order, and was an admirer of the poems of Shakespeare, Wordsworth and Tennyson on the one hand, and Firdousi, Sadi and Hafiz

Y. M. C. A. Physical Training School in Madras, and hoped that the matter of training would be extended to the entire staff. In the end, he supported the claim of the Methodist Boys' High School to receive from H. E. H. the Nizam's Government and the Residency Authorities the same liberal treatment as regards grant-in-aid as other schools were receiving

A feature of the day was an exhibit of school work, including class work, Kindergarden work and a variety of garden vegetables.

Nampalli High School.

The 3rd Anniversary of the Nampalli High School was held on the 28th October under the presidency of Nawab Zulkadar Jung Bahadur, M.A. (Cantab), Barrister-at-Law, Home Secretary. The report read on the occasion by the Head Master Mr. R. Chary, B.A., B.T, showed that the school had made satisfactory progress in all directions. After distributing the prizes, Nawab Zulkadar Jung Bahadur made a speech in the course of which he expressed his appreciation of the work done in the school, particularly in regard to physical education and manual training. Mr. S. Ali Akbar, M.A., (Cantab:), Divisional Inspector of Schools, thanked the President on behalf of the school.

We regret that lack of space compels us to hold over for a future date the tabular statement showing the results of the various examinations, which we promised in our last issue.

education, the characters of boys, and warned against judgment based entirely on the statistics presented. "How many of us", he said, "have picked up casually the treasures of wisdom that we prize most? ....A boy is often made of marred by what he does in his leisure time." Opportunities for growth and the development of responsibility were given an important place in the programme of the school. In this connection twelve trades were mentioned as being carried on commercially in the hostel, including whitewashing, carpentering, cooking, gardening, tailoring, book-binding, tinning, goat and poultry raising, commercial photography, painting and shop-keeping.

The chairman spoke warmly of the phenominal growth of the school since its inception six years ago to its present enrolment of 240 students, and urged that its development in all its phases be continued as in the past.

In congratulating the school on its emphasis on vocational training, he remarked:—"In my recent vist to Europe I noticed this strikingly apparent everywhere—in England, Germany and Switzerland. Of course, examination certificates are a vocational preparation in so far as they prepare candidates for Government service, but already there is an over-supply of such candidates in this city, and it is becoming more and more important that schools should prepare students to support themselves by work when they leave school. I might remark in this connection that personally I do not feel that vocational training should be allowed to invade the primary schools. Manual training may be made effective use of there, but I feel that our primary schools should limit themselves to fundamentals and leave the training of students in their life vocations for upper schools to take care of."

The chairman further complimented the school on having an athletic director trained in the very excellent

her peoples justify her claim until her inhabitants have learnt the same lessons of mutual toleration and respect ".

Before concluding his speech, the Chairman announced a few generous donations from the parents of the pupils.

The meeting came to an end after a vote of thanks had been proposed to the Chairman by Nawab Sir Amin Jung Bahadur.

Methodist Boys' High School.

Mr. S. Ali Akbar, M. A., (Cantab) presided at the Anniversary gathering of the Methodist Boys' High School held in their beautiful hall on October 7th.

A varied programme was given to a large and appreciative audience. A number of clever recitations and songs brought a hearty applause. One tableau depicting "A Day in the Methodist Boys' School" cleverly illustrated the events of a day in school. For example when "food disappeared into hungry stomachs," a little boy disappeared into an empty box labelled "Empty stomachs," and when four o'clock comes, another boy labelled accordingly dashes into the stage with an enthusiastic shout. A scene from "The Merchant of Venice" was given in Indian costume and exceedingly well done in the case of Shylock. The appropriateness of the costumes showed well how catholic are the characters of the great dramatist. It will be remembered that a version of Shakespeare given in London a couple of years ago in which bowlers and sack coats featured aroused considerable comment, and there is a real opportunity for such a production of Shakespeare from the Indian standpoint.

The Principal Mr. George Grden, M. A., in his report regretted the impossibility of attempting to sum up the progress made during the year in that most important phase of

College Section	.... The Osmania College
High School Section	.... The City High School
Middle School Section	.... The Residency Middle School.
Primary A. Section	.... The Nampalli High School
Primary B. Section	... The All Saints' High School

In the Inter-school Cricket Tournament, which has been inaugurated this year, the Madrasae Aliya beat the City High School in the final, Meraj Ali scoring 100 runs in the 1st and 198 in the 2nd innings for the winning team.

School-day Celebrations.

St. George's Grammer School.

St. George's Grammar School, Hyderabad, held its Prize Distribution Day on the 23rd July, 1927, under the Chairmanship of the Hon'ble Mr. L. M. Crump, C.S.I, C.I.E., I.C.S., Resident at Hyderabad. The occasion was also made use of for opening the new school building. After a few items had been gone through by the pupils, the schoool report for 1926 read by the Principal and the prizes distributed, the Chairman made a long speech in the course of which he praised the good work done by the school. Speaking about the necessity for boys of different creeds learning the value of mutual respect and toleration, he remarked :—

"I do not wish to say one word against religion as such, but the greatest sword of division among peoples has been the bigoted intolerance that religion has from time to time produced. To take an example from Europe, Germany was never able to unite and realize its own strength until Roman Catholics and Protestants learnt to live side by side with mutual respect and toleration. Similarly, I do not believe that India will ever take in the comity of nations the high place to which her ancient history and spiritual capacity of

ters Rovers in Urdu. The Medak Scouts gave a display of scout games. At the conclusion of this part of the programme, His Excellency distributed the renewed warrants and charters to the Scout Masters and trophies for the competitions organised by the Head Quarters to the following successful teams :—

First Aid	....	City College.
Signalling	...	Vivek Vardhani School,
Fire Lighting	....	Residency Middle School.
Bridge Building	....	Mufeedul Anam School.

Mr. S. M. Hadi, Director of Boy Scouts, thanked His Excellency for honouring the function with his presence and gave a brief account of the progress of the Scout Movement in Hyderabad. He said that there were 870 scouts on the rolls and scout troops were being organised in the districts also. Speaking about some of the objections raised against scouting, he emphatically denied that scouting interferred with the studies of the boys, pointing out that out of the 410 scouts who had appeared in different examinations this year, no less than 327 had been successful.

His Excellency in his reply congratulated Mr. S. M. Hadi on the progress that scouting had made under his directorship. He said that he was very pleased with all that he had witnessed during the function and hoped that more troops would be formed soon. Scouting, he said, was going to confer great benefits on the young generation of the State.

The function terminated with three Cheers to H. E. H. the Nizam and to His Excellency the Maharaja Bahadur.

Football and Cricket.

The following is a list of school and college teams which won the various football tournaments held recently under the auspices of the Hyderabad Athletic Association :

countries. Nawab Zulkadar Jung Bahadur also advocated the establishment of adult schools and the provision of greater facilities for the education of the children belonging to the so-called depressed classes. In the end, he drew attention to the fact that Government could not do much for the educational advancement of the country without the cooperation of the public.

Scout Day Celebrations.

The Hyderabad Boy Scouts celebrated the Scout Day on the 4th October at the Nizam College under the distinguished patronage of H. E. Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur. Twenty two Boy Scout and Rover Troops, including those of Nalgunda and Medak, took part in the march past and the displays.

On his arrival, His Excellency was welcomed by a general salute. After the ceremonies of the flag hoisting, the renewal of the scout oath and the investiture of new scout-masters had been gone through, all the troops marched past before His Excellency.

Then followed an interesting programme of scout displays, some of which were conducted simultaneously. In spite of the fact that it was raining during the function, the ground was surrounded by a large number of spectators.

The special displays of Pyramids, Flag-drill, First Aid and songs given by the Chaderghat, Nalgunda, Dharamvanth and Madrasai Aliya Scouts respectively were much appreciated by everyone present. Then His Excellency inspected the various bridges that had been prepared by the City College and Head-Quarters' Rovers and Jagirdar College Scouts, the fire brigade drill of the City College Scouts and the huts and tents improvised by the Nampally High School and Residency Middle School Scouts. The Vivek Vardhani Scouts signalled a message in English and the Head-Quar-

ideas mentioned by Prof: Kulkarni being practised in a number of schools in Berlin. He then described how parents in Germany cooperated with the schools in the physical welfare of the boys. He also referred to the important part played by music, rythmic exercises and excursions in the German schools. On the question of corporal punishment, he remarked that never having been a school teacher himself, he was unable to say whether this kind of punishment could be entirely dispensed with, but he agreed with Prof: Kulkarni that much depended on the personality of the teacher. Finally, he expressed his appreciation of the work done by the League of Parents and Teachers, and on behalf of the Teachers' Association, thanked Professor Kulkarni for his interesting and instructive lecture. Mr. Chandawarkar, M. A., Branch Secretary of the Association, proposed a vote of thanks to the Chairman.

The Hyderabad Educational Conference.

The 8th Session of the Hyderabad Educational Conference was held on the 25th and 26th October, 1927. In his able and illuminating Presidential Address,* Nawab Zulkadar Jung Bahadur, M.A. (Cantab), Barrister-at-law, Home Secretary, gave facts and figures to show the progress of education in H. E. H. the Nizam's Dominions in recent years. He regretted that from the point of view of literacy, the Hyderabad State was still very backward, and he expressed the opinion that only the introduction of compulsory primary education could break down ignorance in the State. Referring to the question of the education of women, he said that inasmuch as the Purda system was the greatest obstacle in the way of the social and intellectual uplift of women, this system must be modified, especially as the kind of Purda which was now prevalent in India was neither sanctioned by religion, nor had a parallel in other Islamic

---

* Extracts from this address will be published in our next issue.

travelled in America and Germany with a view to studying the new experiments in education which were being carried on in those countries.

In the course of his address, Prof: Kulkarni described the Experimental Schools which he had visited in Hambourg. He said that the leading characteristics of these schools were: (1) that they worked not according to a time-table prepared by the Head-Master, but according to the choice of subjects made by the pupils themselves; and (2) that discipline was maintained through love and sympathy and not through fear. The learned lecturer condemned corporal punishment on the ground that it was brutal and calculated to destroy all initiative in the boys. The other new tendencies in education to which he referred were medical inspection of schcols, intelligence measurements, self-government, the separation of backward boys, the teaching of the principles of the League of Nations and the importance attached to rythmic exercises, music and dramatic performances. Speaking about the personality of the teacher, Professor Kulkarni regretted that too many Indian teachers lacked idealism and preferred to move in ruts. He pointed out that it was not enough for a teacher to be a master of his subject. He should also be modest and sympathetic. He, therefore, suggested that in selecting a candidate for a teacher's post, Inspectors of Schools should not be guided merely by his academic qualifications, but that they should, after a personal interview, make sure that he also possessed other qualities essential in a teacher. In the end, Professor Kulkarni explained the objects of the League of Parents and Teachers and expressed the hope that the League would receive the sympathy and support of the Hyderabad public.

In his concluding remarks, the Chairman said that though he had not had an opportunity of visiting any Experimental Schools in Germany, he had seen many of the

The Government of Bombay have appointed a strong and representative Committee under the chairmanship of the officiating Director of Public Instruction to consider and report on (*a*) the reorganization of Primary and Secondary school courses with a view to their proper co-ordination and the removal of duplication of studies in the Vernacular and English, and (*b*) the introduction of vocational and industrial training in Primary and Secondary schools of the Presidency. Another Committee is to inquire into and report on the question of making physical training compulsory for boys in the Primary and Secondary Schools of the Presidency.

Educational Re-organisation in Bombay.

With a view to popularising agricultural training in the secondary schools, the Punjab Government had introduced in 1919, as an experimental measure, a scheme providing for the establishment of small farms in certain schools in the Province. In the course of the past 8 years, the results of this experiment have been remarkably satisfactory. The Punjab Government has now appointed a Committee to give a more definite and detailed guidance in the matter. In an agricultural country like India, this is decidedly a move in the right direction, and we hope that before long the example set by the Punjab will be followed in the other parts of India.

Agricultural Training in the Punjab Schools.

Under the auspices of the Residency Middle School Branch of the Hyderabad Teachers' Association, Mr. R. K. Kulkarni, M.A., LL.B., Professor, Victoria College, Gwalior and Secretary of the League of Parents and Teachers, delivered an interesting lecture on "New Ideas in "Education" on 12th October, 1927. Mr. S. Ali Akbar, M. A., (Cantab:), presiding on the occasion, introduced the lecturer as one who had

Prof: Kulkarni's Lecture on "New Ideas in Education".

connection with the Extension Lectures organised by the Osmania University. During his stay here, he gave, at the request of the Hyderabad Teachers' Association, a lecture on "The Teaching of English Literature in Indian Secondary Schools" This lecture, a summary of which will be published in our next issue, was full of useful information and was much appreciated by the audience. Mr. K. Burnett, M. A., (Oxon :), Principal, Nizam College, presided.

The Bombay Muslim Teachers' Conference.

A Conference of Muslim Teachers of the Bombay Presidency was held on the 16th October, 1927 under the auspices of the Muslim Educational Conference. The Conference was opened by Dewan Bahadur Hari Lal Desai, Minister for Education, Bombay Government, who in an interesting speech deplored that teachers were mainly concerned with their personal gievances and advancement and totally neglected their duty to advance the education of their pupils. Why should, he asked, pupils require tuition at home if the teacher did his duty during school hours? Referring to the question of medium of instruction, he advised Muslims to be content with the teaching of Urdu as a second language. Lastly, he emphasised the need for the appointment of Muslim women teachers for primary schools.

In his Presidential address, Mr. Fazul Ibrahim Rahimtoolah dealt mainly with the various grievances of the Muslim community in regard to educational facilities in the Bombay Presidency. Mr. M. R. Jayaker also spoke on the occasion. He said that one of the aims of education in India today should be to bring the Hindu and Muslim youths together in a spirit of common brotherhood. He advocated the preparation of text books on the beauties of democracy in Islam, which would be studied and appreciated by the Hindus, and in that way he thought the Hindu and Muslim communities would be brought closer together.

NOTES AND NEWS.

Mr. Syed Mohamed Husain, B. A., (Oxon :), Deputy-Director of Public Instruction and Mr. S. Ali Akbar, M. A., (Cantab.), Divisional Inspector of Schools, Hyderabad Deccan, returned from Europe on the 20th September, 1927, and were received at the Nampalli Station by a large number of friends, officials of the Education and other Departments and teachers. At the conclusion of the Imperial Education Conference in London, Mr. Syed Mohamed Husain visited Denmark to study the organisation of rural education in that country, while Mr. Ali Akbar attended the World New Education Conference at Locarno and subsequently visited a number of Secondary and Primary schools in Germany. We publish elsewhere an account of the Imperial Education Conference as well as papers read on that occasion by the Hyderabad delegates. We hope to receive from them later on other articles dealing with their tour on the Continent.

Under the auspices of the Osmania College Old Boys' Association, Mrs. Sarojini Naidu delivered a lecture on "Youth and Tomorrow" on the 13th October, 1927. She pointed out that Hyderabad had always been noted for its traditions of Hindu-Moslem unity, and made an eloquent and impassioned appeal to the students to maintain these traditions. At the same time, she warned them against narrow patriotism and exhorted them to live up to the ideal of universal brotherhood, which knew no bounds of country, creed or community.

Professor Seshadri, M. A., Professor of English, Benaras Hindu University and President of the All-India Federation of Teachers' Associations, visited Hyderabad recently in

The strength of these invisible bonds of friendship is incalculable; in hours of crisis they have even averted wars. Hence the school has an exceptional opportunity of engendering that "spirit of goodwill," which a leading writer has said is the first essential towards the solution of racial differences. An ounce of humour and a sense of fair play and understanding of each other is often worth pounds of fervid eloquence about racial unity. The words of the Oxford tutor quoted by the Resident could apply to others as well as to teachers. "Do you attach any meaning to your words"? To get into the arena where the work of moulding the future generation is slowly but surely being done would sometimes be a more telling way of achieving the desired end. It may of course involve sacrifice, but in the school lies the solution of much that is agitating India to-day.

From this point of view we must deplore the tendency, too much in evidence of recent years, to establish communal or denominational schools. It necessarily makes for narrowness and a false outlook if education is run on class or communal lines. The first produces snobs and the second bigots who become feeders of social or racial prejudice. A school is a miniature world and, as such, should have room for the composite elements that make up the world as we know it. A certain international students' federation has for its motto "Ut omnes unum sint" (that they all may be one) and it is an ideal we would commend to all those in charge of our educational institutions for their consideration in the shaping of their school policy if the schools are to make their contribution to the solution of India's present day problems. The opportunity is there if we care to use it.

EDITORIAL.

Education and Racial Differences.

THE Hon'ble Mr. Crump, C. I. E., Resident at Hyderabad, in his speech at the recent Prize Function at St. George's School did well to call attention to the service rendered by our schools to the cause of national peace and understanding. The personal and more selfish ends of education are so much more apparent that the deeper and more social aspects are at times forgotten and overlooked. Service to the community was the basic idea of Greek education. They first saw clearly that true education must not only individualise but also socialise, and planned accordingly. In recent times, though in a somewhat different way, we have the object lessons of Japan and Germany, who have shown to the world how the whole outlook of a nation can be changed in a few decades by means of educatiou. It is strange that this fact tends somehow to be overlooked as a solvent towards remedying present-day problems in India.

It is not only by emphasising in the curriculum ideas of the unity and the mutual dependence of mankind that the desired end is to be reached; it is more particularly through the almost unique opportunity that the school provides for developing that fellowship of race with race in all the intimate associations that make up school life. It is a great thing to see boys of different nationalities playing together on the football field under a captain elected irrespective of race and all pulling together in the team work essential for a common end. It is this spirit we must try and conserve and continue. When all is said and done, the relations of the races with each other are not determined by government or congress resolutions, but by the personal contacts in a myriad ways of multitudes of individuals with each other.

(6) The teaching of history must be freed from national bias and false patriotism. History teachers must be men of broad vision and wide sympathies, who can see their national history in its true position as regards the history of the world.

Along with the Conference had been organised an educational exhibition, which gave one an idea of the attempts that are being made in the New Education Schools to develop the creative instincts of the pupils.

What impressed me most about the Conference was its free and friendly social atmosphere. Those present mixed with one another without reserve and exchanged views freely, each one being eager to learn something from his or her colleagues. There was not the slightest evidence of national or racial prejudice at this international gathering, which shows that the members of the New Education Fellowship are really sincere in their efforts to promote international sympathy and goodwill by means of education.

Director of the International Bureau of Education, Geneva. Nearly 1200 educationists from 42 different countries were present.

An interesting and useful feature of the Conference was that experts conducted study groups on the various problems connected with the New Psychology in Education, Individual Methods, Experimental Schools and New Ways of Teaching. Among the formal lectures organised by the Conference was one by Sir J. C. Bose, F. R. S., on "The Unity of life". The great Indian botanist explained how his discoveries that trees and plants have nervous organisms like those of human beings illustrated the unity of life. Drs. Harold Rugg and Washburne of U. S. A. delivered interesting and instructive addresses on "Curriculum Making" and "Freedom by Individual Mastery" respectively. I regret that, owing to lack of space, I cannot report these lectures in the present article, but I hope to be able to do so at a future date.

The chief points urged by the other speakers whom I heard were as follows:—

(1) The aim of education is the release of faculty and not the accumulation of facts. The child develops through activity and self-expression. He should therefore be freed from passive receptivity, while the environment should be so organised as to bring out his best instincts.

(2) The curriculum should be fitted to the child, and not the child to the curriculum.

(3) Discipline must not be based on fear. Self-government should be a feature of all progressive schools.

(4) Social instincts should be cultivated in each child.

(5) No real education can be attained without the co-operation of parents both at home and in the school.

The World Conference on New Education

BY

S. ALI AKBAR.

One of the educational movements started in Europe and America after the War is the movement represented by the New Education Fellowship. The main principles which this society advocates are the development of the spiritual power and individuality of the child, the provision of an outlet in the school curriculum for the innate interests of the child, the promotion of individual self-discipline tending to self-government of the school community in collaboration with the teachers, the substitution of a spirit of co-operation for the spirit of selfish competition in each school and the co-operation of the two sexes in and out of class hours. It is claimed that schools rightly conducted along these lines "will develop in each child not only the future citizen ready and able to fulfil his duties towards his neighbours, his nation and Humanity as a whole, but also the man conscious of his own dignity as a human being and recognising the same dignity in every one else".

A few private schools have been established in Europe and America for the purpose of putting the above-mentioned principles into practice. The Fellowship also endeavours to promote its aims and objects by publishing international magazines in English, French and German and holding an international conference every second year.

I took advantage of my recent visit to Europe to attend a few sessions of the 4th Conference of the Fellowship, which was held at Locarno from the 3rd till the 15th. August, 1927, under the presidentship of Professor Pierre Bovet,

self-expression that are surging in him, well and good; he accepts arithmetic and composition as part of the scheme of things, as values that he can appreciate and strive for. Otherwise they represent but an unreal world of symbols which the incomprehensible ways of the adult have imposed on him and which has to be faced with ill grace. It is a recognition of this truth that has revolutionized instruction in early stages in countries where light has dawned. There the attempt of the teacher is to subordinate learning to life or rather to make learning grow out of the life of the child as a necessary part of the game and as helping to further the purposes he has in view. Consequently, the school life of children has no cramping or repressive influence. It rather releases their energies; they are happy because they work with a will, and the devil is defeated in his machniations!

Such, in the spirit of its working, will be the school of the future—an environment enriched not only by the intellectual and spiritual treasures of the past, but permeated with the peace and harmony of beautiful surroundings. It will truly be a "kindergarten", a garden of children, where they will work and create, in freedom and joy. And they will create not only things of material value, but their own selves, entities which can grow only from within and which can never respond to purely outside dictation.

a subject and a living way of doing so. Even a small change like letting the boy choose his own theme for composition would make a great deal of difference in the spirit with which he sets about his work. The main thing is to avoid undue formalizing and a hard treatment and to allow every child, so far as possible, to choose his own method of work. By so doing you enlist his whole being, which is really bubbling with vitality, into the service of the task to be accomplished. If to this freedom of choice, you add the further stimulus of working for an end which the child accepts as his *own*, you have secured the ideal conditions for free, spontaneous and self-directed activity.

How is this to be brought about—this acceptance of the end as his own by the child? Ordinary common sense psychology helps us here. We know what a significant part is played by motive or purpose in adult activities. We *would* not do a thing whole-heartedly till we can see its purpose and recognize that it furthers some end we have in view. A wood-cutter, for example, finds his daily toil made tolerable, because of his bread-winning purpose. At the other end of the scale is the philanthropist, who labours in silence and unrewarded for the good of mankind. His labours are sweetened by the thought that they will bear fruit in days to come. Now is it not strange that we expect a child to work without this stimulus of purpose, without letting him see the end of the activity in which he is engaged? In the nature of things, he has a much smaller power of concentrated attention and of visualizing a remote end. But we either give him no clue at all to an appreciable end, or provide him with an end so remote as "getting educated for later life", which can have very little meaning for him. What is needed is to make the child feel that his studies are growing out of his life situations and helping him to meet them. If arithmetic, for example, helps him to achieve the purpose of planning out a garden, or composition serves as a channel for the forces of

child should be able to interest himself in the dictated tasks. Such work—whether in reading and writing, or in history and geography or in the so-called "arts"-does not give room to the child to express whatever is unique and distinctive in his individuality. It makes no appeal to his creativeness or originality. That is why his compositions are lifeless and drab; his history and geography are strings of names and dates rather than living growing realities; and even his drawing and painting have the same formal, mechanical quality. That is also the reason why the most active and vital interests of the child lie outside the class-room, in fact outside the school altogether—in sports, in social life, in personal hobbies of which the school usually takes no cognisance.

I have so far suggested two points. Firstly, that there should be an introduction of such real, practical, vital activities as will engage the child's whole being and cater for all his diverse interests. The formation of various societies and clubs for organising corporate games and studies of different kinds, the bringing out of a school magazine, the organization of scouting, social surveys and other similar movements belong to this category. And, secondly, I have hinted that a mere "patching on" of these extras, half-heartedly, over and above the regular routine work, will not do. These formal studies, themselves, have to be transformed into delightful pursuits by approaching them in a creative spirit. You have to turn your composition "lessons" into joint ventures of the teacher and the class at the "creation" of literature—prose and poetry—your history and geography lessons into an exploration of the adventurous life of man on earth, your science lessons into research work in the natural forces and phenomena and so on. The change will be certainly one of method, but more so of the point of view. It is not possible here to enter into practical details, but it is obvious that there is a mechanical way of teaching

activity, comprising the elements of work and play for which the boy's soul craves. At home play is his chief occupation. In school, therefore, there should be adequate facilities for play, only in a more educative and interesting form. In the workshop or the farm, the boy learns the use of tools and begins to understand practical processes of different kinds. At school, he should be allowed opportunities for doing manual work, organized and arranged in such a way that it will develop his practical powers more effectively and systematically. Thus the school is to be conceived of as an environment in which conditions of activity prevailing outside are reproduced in an idealized form—a sort of "controlled" environment—so as to yield the best results for the formation of the nascent personality. It must work out that happy harmony in work, play and life to which the "mad" priest in "John Bull's Other Island" refers—"where work is play and play is life—three in one and one in three". It is only when this new Trinity has been realized, first, in the miniature world of the school and then, through it, in the wider world outside, that education and life will be cured of the tension and unhappiness which now characterize them.

What represses most the free growth of the child's personality in school, the spontaneity of his spirit, is lack of opportunity for "creative" work. Work is creative when it is accompanied with joy, and the feeling that the worker is expressing some worthy element of his personality in it. Such is the work of a true poet, of a musician, of an expert batsman who feels that, with every stroke he is giving form and expression to his energy. They are all artists, doing creative work of one order or another. Work degenerates into drudgery when there is no call from within, when the motive force is an external compulsion with which the worker does not indentify himself. Work in school is mainly of the this sort. Everything that the child has to do and does is minutely prescribed, and it is expected that somehow every

ched race", and disappeared. And with him disappeared also the "school" which he had so cleverly devised.

The above is the translation of a parable which I read in a thought-provoking litte book, "Transformons L ' Ecole", ("Let us transform the school") by Dr. Adolphe Ferriére of the J. J. Rousseau Institute at Geneva. As I read it, I thought I could not find a better introduction for the ideas which I want to bring out in this article. For it expresses, very vigorously and picturesquely, a protest against making the school a prison house for small children.

I believe all will agree that our schools, as they are at present organized, fail to capture the interest and stimulate the "joie de vivre", (the joy of living) in children. It is equally obvious that this state of affairs is a source of incalculable waste—waste of time and energy on the part both of the teachers and the taught. And in so far as our schools kill the joy, spontaneity and initiative in children, they are open to the charge of cherishing ideals which, as this parable puts it, Satan propagated hundreds of years ago. I want to make a few suggestions to indicate how we should set about transforming the school environment in order to make it a happy medium of interesting activity, ministering ceaselessly to the expression of the child's life and powers.

First of all, our teachers in India need definitely to get out of the belief that the school is primarily a place of "instruction"—a place where you have to "teach" certain "subjects" to more or less unwilling victims of your "pedagogy"! When you take away a boy from the active home environment which is teeming with all sorts of pleasurable pursuits, when you largely cut him off from work at the farm or in some workshop, which, in spite of all its shortcomings, is a valuable training ground for practical life, you must provide within the school, opportunities for varied

left them no time. Nothing was explained to them; they were simply coerced to do things.

Then they learnt what they had never learnt before. They tried to dissemble, to trick and to tell lies. The school forced itself by punishment, detaining and supplementary tasks to master the students whom it called insolent because he overflowed with the joy of living and the vital energy in him. It accused of transgression the healthy defensive instincts of the right spirits. For a moment it seemed that it had succeeded. The devil believed himself to be victorious. All schoolmasters, taking him for a saint, were devoted to him and laboured to kill the soul of children, to throttle their spontaneity, to over-burden their memory, to spoil their sane reason, to satiate them with book knowledge.

And from that day one sees this. According to the wish of the devil, a good number of people have become enervated, lean, wise, passive and disinterested in all things. They forgot the precept of Saint Paul, "Rejoice always, be always happy". God no more existed for them. For God lives only in healthy souls.

But the school hall was not prefect; it lacked that which forms the glory of prison-houses—the big keys, the locks, padlocks, and corruption.

Somehow the devil had made a miscalculation. One sees children jumping about in fields, climbing trees, making fun of the "false man of God". One sees them taking part in adventures, getting out of scrapes, becoming strong, pratical, ingenious, and perservering. They will gain from this health, happiness, self-control, and self-sacrifice. They will know love, and repeat with the Evangelist, "God is love."

Then the devil ceased to laugh in his sleeves. He ground his teeth, he brandished his fist and cried to them, "Wret-

phemy. Children should know neither joy nor laughter. The love of one's mother is a danger—it effiminates a boy's soul. It is necessary to separate the child from the mother so that nothing may stand in the way of his communion with God. It is necessary that the young should come to know that life is effort. Saturate him with labour. All that may possibly excite interest should be banished. Disinterested labour alone is good. Pleasure means perdition ".

Thus spoke the devil. The crowd bowed. They cried, " We want to be saved. What shall we do "? " Create the school " and at the devil's instigation, the school was created.

The child loves nature; we shut him up in closed rooms. The child loves to play; we make him work. He loves to see his activity serving some end; we see to it that his activity should have no end. He loves to move about; we oblige him to remain immobile. He loves to handle objects, we put him into contact only with ideas. He loves to use his hands; we only put his brain into action. He loves to talk; we constrain him to keep quiet. He wants to reason out things; we make him memorise them. He wants to search for truth; we give it to him ready made. He wants to follow his fancies free; we curb them. He wants to show off his enthusiasm; we invent punishments. He wants to serve of his own free will; we teach him to obey passively.

Very soon this regime bore fruit. The children toiled for a while to adapt themselves to the conditions of this artificial life. At first the mothers missed their children; they were told: "It is as it ought to be". The fathers complained that their children did not help them at home or in the workshop; they were persuaded to believe that it was better that they should be at school. The children grieved at being separated from their home; the duties of the school

dealt with in different countries, is bound to lead to closer co-operation in education. But as His Royal Highness the Prince of Wales had observed the chief value of the Conference was to be found in the personal contacts which it enabled each member to establish and the opportunity it gave him for exchanging ideas and experience with his colleagues in the educational service of other countries.

THE CREATIVE SCHOOL

BY

KHWAJA GULAM-US-SAIYIDAIN, M. ED. (LEEDS)

Reader, Department of Education,

Muslim University, Aligarh.

THIS IS A TRUE STORY.

The devil one day came to earth and declared with regret that he still found people in the world who believed in goodness. As the devil is not wanting in a spirit of *finesse*, he soon discovered that these people presented certain common characteristics: they were good, that is why they believed in goodness; they were happy, that is why they were good; they were calm and balanced, that is why they were happy. The devil concluded that, from his point of view, all was not well in the best of all worlds and he pondered over the means of changing all this.

" In childhood lies the future of the race, let us begin with childhood ".

He appeared to men in the form of a man of God and a reformer of society. " God ", said he, " enjoins on you the mortification of the flesh. It is right that this should begin with the child. Joy is a transgression. Laughter is blas-

tion in promoting mutual understanding and good-will among the different parts of the Empire. A hearty vote of thanks was accorded to the Duchess of Atholl as Chairman and the Conference expressed its appreciation of the arrangements made by the Secretary and Staff of the Board of Education.

The social arrangements of the Conference included receptions given to the members by His Majesty's Government, the League of Nations' Union, Victoria League, League of the Empire, Lady Astor, Viscount Haldane, a dinner by His Majesty's Government and a garden party by Lord and Lady Eustace Percy. Earl and Lady Winterton invited the delegates and representatives of India to a tea party. Finally, the delegates had the honour of being presented to his Majesty and Her Majesty the Queen Empress at the garden party held at the Buckingham Palace on the 24th June.

There was also a tour programme arranged for the Conference. This included visits to the Scouts' Training Centre at Gilwell Park, Essex; Oxford, where a garden party was given by the Hon'ble Mr. H. A. L. Fisher, Warden of New College; Cambridge, where the Vice-Chancellor entertained us at lunch; Agricultural College, Wye; College of Physical Training for Girls, Dartford; and Technical Training Institution for Aircraft Apprentices, Halton Camp, Buckinghamshire.

The conference was really an informal meeting for the interchange of views between those responsible for education in the different parts of the Empire. The deliberations of the Conference revealed that in spite of the dissimilarity of conditions in the different parts of the British Empire, there were many educational problems which were common either to all or to the majority of them. A knowledge of these common problems as well as of the way in which they are

in England and Wales were: (*a*) medical examination of all children; (*b*) the following up of special cases; (*c*) provision of medical treatment; (*d*) provision of special education for defective children; (*e*) organised system of physical training; (*f*) the teaching of hygiene; and (*g*) the provision of meals for malnourished children. The service had now been extended to Secondary and Nursery schools. Among the points about which children were examined were (*a*) minor ailments, (*b*) defective vision, (*c*) conditions of the throat, (*d*) deafness and ear diseases, (*e*) dental defects and (*f*) tuberculosis. There were special schools for the blind and deaf. But while the School Medical Service did all this for the defective or diseased child, it did not neglect the normal child. The fundamental principle was that every pupil should come before the doctor at least three times during his elementary school career and twice during his secondary school career. Sir George then remarked on the importance of suitable physical training for every child, and in this connection, favoured the modified Swedish system, which, he said, was cheap, and applicable to all children.

Close of the Conference.

The final session of the Conference was held on the 8th July. Lord Eustace Percy, President of the Board of Education, thanked the delegates on behalf of the Government for the work they had done. A resolution was then passed expressing the loyalty and devotion of the delegates of the Conference to His Majesty and Her Majesty the Queen Empress and expressing their belief that education should be one of the greatest factors in promoting mutual knowledge and understanding and thereby fostering sentiments of active friendships and good-will between the different parts of the Empire. In the reply which was sent to the Conference by His Majesty's command, His Majesty reciprocated the views of the Conference as to the importance of educa-

Miss Evelyn Fox said that a teacher, especially a teacher of infant children, must possess a knowledge of the individual child and a power of adaptation. Therefore, it was necessary to train teachers for the task of handling such children.

Psychological Tests.

Dr. Myers introduced this subject. He remarked that psychological tests were useful in selecting students for various types of schools and advising them as to their future careers. The group tests were being much employed now for various purposes. It must be remembered that verbal tests were not enough for vocational guidance. Realising this, the Americans were now using objects as tests. But whatever tests were employed, they should be used as one's servants and not masters.

Dr. Ballard said that the word "intelligent" was often misunderstood. Too often it meant "interested in things which interest me". The psychological meaning was different. In the ordinary sense, "intelligence" began to grow at the age of 16; in the psychological sense, it ceased at that age. From the latter point of view, intelligence was independent of training, of knowledge, of culture, and even of interest. The distinction between promise and performance must be borne in mind. The psychologist looked not for performance but for promise. The usual verbal tests should be supplemented by other tests in order to secure the best results. In the end, he pointed out that intelligence tests were intended to supplement the ordinary examinations and not to replace them.

School Medical Service and Physical Training.

Sir George Newman (Chief Medical Adviser to the Board of Education) said that England was spending 3 million pounds a year for the physical care of the school children. The chief features of the School Medical Service

There followed a short discussion on Adult Education in India. Mr. Staley (Central Provinces, India) said that in view of the enormous volume of illiteracy existing in India, all the resources available had to be concentrated on the adult of the future and there was little available for the education of the adult of the present. Mr. Tydeman (Panjab) showed how Adult Education had raised the percentage of literacy in the Panjab. He added that adult schools were especially valuable for countering the lapse into illiteracy of the agricultural population. About 80,COO pupils attended such schools in the Panjab—at present, all of them men. Mr. McCoy (South Australia) expressed the opinion that the proper remedy for illiteracy in India would be compulsory education. The present writer said that for a speedy removal of illiteracy, it was necessary that, side by side with compulsory education, there should also be provision for adult education. He then pointed out that adult schools could be conducted very cheaply, and explained that this could be done by holding the classes in the existing school buildings in the evenings and engaging the teachers of Boys' schools for the teaching work on small allowances. Mr. Vakil (Bombay) spoke about the Women's Institutes which were beginning to be established in India.

The Problem of the Sub-normal Child.

Dr. Cyril Burt, Psychologist to the London County Council (Education Committee), dealt with the various types of so-called "Subnormal" children—Mentally Defective, Dull and Backward, Delinquent etc., the proportions in which they are found in school population and the necessary differences in their treatment accordingly as the causes of trouble are innate and largely irremediable or accidental and curable. He also showed the importance of detecting at an early age children who might otherwise become permanently neurotic in later life. The foundation of all such work, he said, was the close study of the individual child.

advice to teachers and education authorities actually using or contemplating to use wireless in schools. The wireless lesson was given in the form of a lecture, but the class could and did take its part—*e. g.* in music and folk-dancing. Two things were necessary for the success of the wireless lesson:—(1) the teacher should understand how to handle it; and (2) the receiving set must be a good one. In the end, Sir John Reith said that the B. B. C. was making experiments for instituting in England a service which could be picked up in the Colonies and Dominions.

A short discussion followed, after which the Conference heard a demonstration, including a music lesson, a French lesson and a lecture on the Eclipse. Subsequently, the delegates visited the studios of the British Broadcasting Corporation.

Adult Education.

After tracing the history of the Adult Education movement in England, Mr. R. H. Tawney said that in recent years the movement had grown so rapidly that there were now about 26,000 students in England and Wales attending classes of one kind or another organised by the Workers' Educational Association and other voluntary organisations. The subjects were chosen by the classes and varied widely, but social and economic studies played the most important part, and all courses were non-vocational. Sir Percy Jackson remarked that Adult Education was not solely concerned with intellectual improvement; it should impart information to adults about hygiene and other branches of science. It could build up the physique, widen the mental and aesthetic horizon, and even improve the industrial efficiency of the people by giving them a knowledge of the science of the industry in which they were engaged. Mrs. Nugent Harris described the work of the Women's Institutes.

facture. The great point in favour of educational films was that the children liked them immensely. Care should be taken to see that the language used in the captions was suitable. The film habit, she said, had come to stay, and it was for all concerned to try to improve the standard of taste in films.

The following resolution was then passed :—

"That this Conference, recognising the far-reaching educational influence of the Cinema both inside and outside the school, on the one hand, earnestly hopes that the competent authorities will take every possible step to prevent the display of demoralising films, and on the other hand, desires to emphasise the importance of the production and use of wholesome and suitable films which will convey an accurate impression of the life and conditions of all parts of the Empire."

On the 6th July, the delegates attended an exhibition of educational films and cinema apparatus, organised for their benefit by the Film Group of the Federation of British Industries.

The Use of Wireless Broadcasting in Education.

Sir John Reith described the organisation founded in England for using wireless broadcasting as a social and educational force. This organisation, he said, was a compromise between Government control and independent management, the revenue being collected by Government and the details of routine administration being left to a body, which, while independent, had no commercial motive. On the educational side, the British Broadcasting Corporation had set up advisory committees of experts. Besides broadcasting educational matter, they issued "follow-up leaflets", notes, maps, etc. and gave, on technical and educational points, free

culum. To divorce geography from economics, he said, was to take from each its greatest significance and its best contribution to a sound liberal education.

In her concluding remarks, the Duchess of Atholl agreed that in view of the limited school time, it was a mistake to give too much attention to the details of "Domesday Book" or of the Feudal System, to the neglect of more important matters. She also agreed with Dr. Paranjpye that children could not be interested in history unless they were told something about the great men of their own country.

The Cinema in Education.

Mr. H. J. R. Murray (Divisional Inspector, Board of Education) at first drew attention to the limitations of the cinema as a means of education. The film was a mass method, while the general movement in schools to-day was away from mass methods, towards individual treatment. The film could convey information, but it could never train the pupil in the art of thinking. However, the film was useful in suggesting new interests. It might also be employed profitably for the purpose of revision. It should always be borne in mind that the film was never intended to supplant either teachers or books. The general scheme of work should guide the film and not *vice versa.*

Other speakers spoke about the usefulness of the film in teaching geography, nature study and, to a certain extent, history, and the desirability of producing really good films of the Empire.

The Duchess of Atholl, in summing up, said that the possibilities of the cinema in school were no doubt limited, but the film could be used profitably for stimulating interest, *e. g.* in nature study, geography, and processes of manu-

19th centuries, as was usually done at present in schools and colleges. The student of politics could not find a better laboratory than the Empire for pursuing his researches.

Professor Newton of the London University drew attention to the need for preparing suitable text-books for school students. In the ideal text-book the story of the economic development of the Empire must play a larger part than it did in the text-books now in use, for economic problems always had a vital influence on the life of a nation.

Professor Clarke (South Africa) suggested that the history of British expansion should not be entirely detached from that of other European, African and Asiatic peoples.

Dr. Paranjpye complained that the history text-books now in use in Indian schools and colleges were unsatisfactory. These institutions, he said, needed text-books which would deal less with wars and more with the careers of great Indians and with the economic and social development of the country, and which would, above all, be impartial.

Mr. E. A. Benians of the Cambridge University said that the teaching of Imperial History should be carefully co-ordinated with the teaching of geography. In the school the child must begin with his own history, the history of his own locality, and proceed from that to the history of the larger country of which he was a member, and then to the outer world.

Mr. Ormsby-Gore, M.P., said that in the past geography had been taught as topography and cartography, and that too mechanically. It was too often forgotten that geography was a realistic, human and scientific study, and that with its roots in geology, archaelogy, anthropology and social science, it could become a sister science to history. Mr. Ormsby-Gore also emphasised the need for giving to economic geography a more prominent place in the curri-

not arrived. At the same time, schools should not be allowed to be dominated by external examinations. If the principle that the varied capacities of children demanded various courses of studies were accepted, it followed that within reasonable limits there should be alternative examinations. The school record was undoubtedly a useful safeguard against the undue domination of examinations. With regard to the value of inspection, she remarked that the day of the Examiner might go; that of the Inspector would never go. Inspection was important not merely as a means of testing the efficiency of a school, but as a means of proving guidance and stimulus. In fact, the Inspector should be regarded as the counsellor and friend rather than as one who imposed tests.

Special Sessions.

The subjects in Group D. were dealt with in special sessions, to which were invited experts representing the Universities, Associations of Local Education Authorities, teachers and other bodies.

Music in Education.

A very interesting paper was read on this subject by Sir Henry Hadow, a resumé of which will be published in the next issue of the *Hyderabad Teacher.*

Empire History and Geography.

Professor Coupland of Oxford, who opened the discussion, strongly recommended the inclusion of Empire History and Geography in the curriculum of all schools in the Empire. He thought that perhaps the practice at Universities of commencing at the chronological beginning and often never reaching modern times was chiefly responsible for the present ignorance of the history of the Empire among University students. It was far better, he said, to ignore Julius Caesar or William the Conqueror than to ignore the great figures of the Expansion of England in the 18th and

not valuable, because study thus regulated could never be satisfactory. Mr. Richey then welcomed the movement for freeing schools from the indirect control of external examining bodies and also favoured the plan for introducing practical, or non-university subjects, into the curriculum. With proper arrangement for the co-operation of teachers, an examination was much less harmful educationally and in these non-University subjects the co-operation of teachers was essential. Referring to the Cambridge Local Examinations, he said, that they were considered useful for such students in India as wished to proceed to Europe. But he thought that a proper solution would be to institute, for the benefit of such students, an examination in India recognised in the British Isles.

The admirable paper read by Mr. W. W. McKechnie, Deputy-Secretary, Scottish Education Department, is published elsewhere. Professor Peacock (Burma) and Mr. Tate remarked that an examination alone was not a sufficient test ; the school records should also be taken into consideration. Mr. Davies (Cochin) thought that it was difficult to satisfy the requirements of public service and the various professions without an examination. An efficient school generally fared well in examinations. All that was necessary was to avoid unsuitable question papers. Disagreeing with Mr. Davies, the writer of this article expressed the view that a school which prided itself on its examination results was not neceessarily an efficient school, as it might possibly have secured good results at the expense of sound education and such activities as were generally necessary for the formation of the character, and the improvement of the physical health, of the pupils. So, he said, care should always be taken to prevent examinations producing this result.

The Duchess of Atholl, summing up the discussion, said that the time for putting an end to examinations had

Dr. Merchant (Canada) stated that in Canada local effort had always been combined with central control, the responsibility for administration being divided between the Central Government and the Local Boards. The question was one of the manner in which each system had evolved. The Australian system might be the best for Australia; but in Canada a centralised system was not favoured.

Mr. Mathan gave an account of the system obtaining in Mysore, where, he said, over 90% of the Primary schools were maintained and administered by Government. He thought that the direct administration of education by the local bodies was not a satisfactory system.

Mr. Hodgson (Travancore) spoke in favour of the voluntary system. In Travancore the policy of Government was to help private enterprise liberally, and the result of this policy was that 65·6% of the pupils of school-going age were actually under instruction.

Dr. Viljoen (South Africa) described the School Committees existing in South Africa. These Committees, he said, were the local representatives of the Education Department and were very jealous of their powers. A useful rule in South Africa was that no school should be opened unless the local authorities were in a position to provide the site and building.

Examination and Inspection.

Mr. Richey (Goverment of India) spoke on "External Examinations". He started by saying that examinations no longer commanded the respect which they formerly used to do. They were never popular. An external examination he said, was not a part of education; properly regarded it was not the completion of an educational stage, but the beginning of the next stage. As an entrance test to a new course, it had its uses. As an incentive to study, it was

private and public management, he remarked that Government endeavoured to maintain a high standard in their schools. The efficiency of the voluntary agency was sometimes high, sometimes low. It should, however, be the policy of Government to encourage and subsidise private effort. Referring to the question of administration, he agreed with Mr. Richey about the usefulness of *ad hoc* committees, but he said that it was necessary that Government should lay down the principles on which such committees should work and should also exercise the ultimate control.

Finally, Dr. Paranjpye expressed the view that the Central Government should have an important share in matters relating to University education. It was a mistake, he said, to hand over University education to provincial Governments.

Mr. Smith (New South Wales) said that in New South Wales the whole cost of education was borne by the Central Government, and that practically no school boards existed there. Mr. Tate (Victoria) stated that there were school Committees in Victoria, but they had no important administrative control, their function being merely to provide school equipment, buildings, etc. He claimed that many things in Australia were done better than they would be done if the system were managed by the local authorities. One of the disadvantages of private schools was that the teachers often stagnated in the same school for years. Under a centralised system, if the Department were alive and if it had efficient Inspectors, good journals and other means of guiding the schools, education could really advance better than under a system controlled and managed by the local authorities.

Dr. Butler (Irish Free State) expressed the opinion that the centralised system was necessary in Australia, because in a new country it was difficult to get people to give their time and money for education.

been transferred to special councils. He thought that there were obvious advantages in taking education out of the hands of ordinary local bodies charged with other functions of Government and handing it over to *ad hoc* authorities concerned only with education

2. What system should be adopted by Government in allocating grants to the local authorities for education?

Experience had shown that the local boards in India were not generally enthusiastic about raising an educational cess. The principal source of income was the grant from the Central Exchequer. How should this be determined? If it were determined accordingly to the revenue of each province the poor areas would suffer. Another possible basis was school attendance? But then it was very difficult to find out how far the attendance figures were genuine and reliable. Therefore, the best plan was to consider the needs of each area. In the Panjab a comprehensive survey of the educational needs of each area was made in 1918. Then a five-year programme was drawn up. Under this system, the Local authority worked according to a financial and educational programme approved by the Central authority, which contributed 10 p. c. of the required expenditure. This system had been found to possess considerable advantages.

3. What were the comparative merits of public and private management?

In India where there was private management, the teacher himself was generally the manager. The Board schools were generally more efficient than private schools.

Dr. Paranjpye observed that real educational progress could only proceed with advance in local self-government. He also pointed out that the Local Boards in India needed larger grants from the Central Government for educational purposes. On the question of the comparative efficiency of

duced. But wherever and however it was introduced, the contact with the vernaculars must be maintained. He thought that the vernacular might be used much more than in the past. Speaking of Africa, he said that English should be taught in schools in Africa not as a means for superseding and suppressing native life, but the means whereby native life could be enriched and express itself. The Colonial Office, he remarked, was anxious to produce a better kind of African and not an inferior imitation of a European. Those who were thus taught should remain in touch with their communities and should become the leaders of their people.

School Government: Central, Local, Voluntary.

Mr. J. A. Richey (Government of India) opened the discussion on "The respective functions, in educational administration, of (*a*) Central Government; (*b*) Local Government; (*c*) Voluntary effort". Mr. Richey laid down three important principles.

(1) Education should take precedence in Local government.

(2) The chief responsibility for primary education should devolve on the Central Government.

(3) Voluntary effort is necessary to supplement the effort made by the public authorities, but it cannot replace the action of public authorities.

Mr. Richey then went on to consider the practical problems in India.

(1) The first problem was: To what form of local authority should educational administration be entrusted?

In India the function was exercised by the ordinary local bodies. But recently in some parts of India, *e. g.* Bombay and Madras, the educational administration had

Mr. L. C. Hodgson, late Director of Education, Travancore, asked whether the demand for the use of vernaculars as the media of instruction was really insistent in India. The publication of Sadler's Report had no doubt been followed by great enthusiasm for teaching through the vernaculars, but the pupils continued to prefer the English medium. Secondly, he said that it was not possible to conduct University education in the various vernaculars. His third objection against the use of vernaculars as media of instruction in the Secondary and University stages of instruction was that the adoption of this scheme would lead to a deterioration in the standard of English, as boys would no longer be taught in an English atmosphere.

Mr. H. G. Kreft (South Africa) remarked that in spite of all the criticism that had been directed against the paper read by the present writer, the main argument put forward had not been seriously assailed. The establishment of vernacular universities was certainly an ultimate ideal worth striving for.

Referring to Dr. Paranjpye's speech, Mr. Syed Mohamed Husain (Hyderabad) explained the place occupied by Urdu in the Hyderabad State, while the present writer, in his reply, pointed out that it was precisely because the leaders of the movement for vernacularising education in India were anxious that Indians should advance on modern lines by making the liberal ideas and methods of the West their own, that they advocated the adoption of the vernaculars as the media of instruction.

At the conclusion of the discussion, the Chairman, the Rt. Hon. Mr. Ormsby-Gore said that all were agreed that in the early stages of education the medium of instruction should be the local vernacular. As education proceeded, English, which was a world language, should be introduced. The problem was how and where English should be intro-

each province, and on this ground, criticised the Osmania University. He also expressed the view that for the study of a subject there was nothing so soul-killing as a translation. He declared emphatically that if India was to advance on modern lines, English must continue to be the medium of instruction for higher education.

With regard to the method of teaching English, Dr. Paranjpye said that while Dr. West and Mr. Phillips had advocated the teaching of English by the eye and the ear respectively, he personally was of the opinion that both the organs must be used. He defended the Direct Method and finally stressed the need for teachers of English being properly trained in phonetics.

Mr. J. A. Richey (Government of India) observed that the multiplicity of vernaculars in each province in India made educational administration difficult. However, he felt confident that the vernaculars would be used more and more in the secondary schools, especially in view of the recommendations of the Calcutta University Commission. He then discussed the question of the stage at which the study of English should begin, and expressed the opinion that even as a second language, the teaching of English should not be commenced until a pupil had learnt to read and write in his mother-tongue.

Mr. H. E. Bowman (Palestine) said that so long as English was the medium of instruction in the secondary schools of Egypt, the boys reproduced word for word passages out of their books. Now the adoption of Arabic as the medium of instruction had undoubtedly led to better results. In Palestine also pupils who read the various non-language subjects in Arabic were able to grasp them better than pupils studying in schools where the medium of instruction was English. Mr. Bowman, however, thought that the time had not come for using the vernaculars as the media of instruction in the University stage.

hitherto been taught only as a language of Expression, and hardly any attempt had been made in the schools to develop the reading ability of the pupils. If the policy of filtration was to succeed, it was necessary that more attention should be paid to the passive side of the study of a foreign language, *i. e.* to the teaching of English as a language of Impression. It was much more important that the Indian student should be able to read English than that he should be able to speak it.

Dr. West next described the experiments he had made at Dacca. The main principles underlying his scheme for a concentrated and selective course for providing for the extension of the pupils' English vocabulary are as follows:—

1. A child learns to speak by speaking and to read by reading.

2. Suitable books must be produced to develop the power of reading.

The words in the book should be selected according to their commonness in the language. Four new words per page would be a useful process, each new word occurring again and again.

Mr. M. H. Phillips (Mauritius) described the difficulty of finding a satisfactory medium of instruction in communities heterogeneous in race. His own view was that English, taught as a second language by the direct or oral method, should become the language of instruction only at the post-primary and secondary stage after its use had been thoroughly acquired.

The discussion on the question of the use of vernaculars as media of instruction lasted for several hours. Dr. R. P. Pranjpye, Member of the Council of India, took a prominent part in this discussion. He drew attention to the practical difficulties arising from the multiplicity of vernaculars in

too only for those students who went up to higher institutions with the special object of receiving instruction in agriculture.

In summing up the discussion, the Duchess of Atholl observed that it seemed clear that there were two main problems, one economic and the other educational, both found in almost all parts of the Empire. It was essential to have good brains on the land and equally essential that the rural child should have every possible educational opportunity. The solution of both problems depended on the teacher.

The Use of Vernaculars in Education : The Teaching of English.

The full text of the paper read by the present writer on 'Vernaculars in Education' is published elsewhere in this issue of the *Hyderabad Teacher.* This paper was followed by one on "The teaching of English as the language of the Empire" by Dr. M. P. West, Principal, Dacca Teachers' Training College. He said that if we were to educate Indian boys and girls through the media of their vernaculars, we would open to them the door of a library with very few useful books on its shelves. The vernaculars were no doubt rich in emotional literature—poetry and religion—but they were deficient in information—science, technology, history etc. If the student was weak in English, he had no chance of access to the world's literature of information, because no translation bureau could possibly keep pace with the flood of publications on these subjects poured out every year in the English language. Thus Indian educationists were faced with this dilemma: Education through the media of the vernaculars meant lack of information, while the English system of education meant neglect of the emotional side.

Dr. West then observed that the original policy of the filtration of western ideas in vernaculars was sound, but it had failed because, owing to the official needs, English had

Mr. Tate (Victoria) read a very interesting paper on "Problems of the Rural School". He suggested that the courses of the small school in rural areas should be planned as generously as those of the city school. He also drew attention to another fact, which we in India often ignore, *viz.* that the rural teacher has opportunities denied to the town teacher for cultivating 'the seeing eye, the hearing ear and the understanding heart'. In Victoria, he said, many rural teachers realised this and made use of their opportunity, with remarkable results on the life—adult as well as child—of the whole district in which their schools were situated. I wish we could say the same of the rural teachers in India. But then our teachers are neither so well trained nor so well paid as teachers in Victoria, where, as Mr. Tate explained later on, great care is taken to train the rural teachers and to continue their training throughout their period of service by means of holiday courses and conferences.

Dr. Viljoen (South Africa) expressed the opinion that in a country like South Africa where agriculture is the greatest single national industry and the vast majority of the teachers must teach in rural schools, every teacher must be rural-minded, and every teacher trained should therefore be trained for a rural environment.

Speaking on "The problem of interesting town dwellers in rural pursuits," Lord Lovat said that education could do much to create a more intelligent appreciation of the attractions of country life, to stimulate co-operation and the co-operative spirit, to encourage industries and to inculcate thrift.

Dr. Munro (Nova Scotia) described the Danish system of rural schools. These schools, he said, followed the policy of teaching a few essential subjects and teaching these subjects thoroughly. An agricultural bias was not introduced until after the completion of the primary course; and then

ments by which a district might voluntarily adopt compulsion, and the efforts of the Government for improving the quality of teaching by diminishing the number of "single teacher" schools and untrained teachers.

Mr. S. Vakil (Bombay) gave the following reasons for the absence of the rural element in rural schools in India :—

(1) Tendency to urbanisation.

(2) The desire on the part of the rural population to receive the same kind of education as the urban population owing to the attractions of Government service.

(3) Unsuitability of the curriculum.

(4) Difficulty of securing teachers with a rural outlook.

(5) Scarcity of officers having sympathy with rural needs.

At a subsequent session, Mr. Vakil read a paper on "Courses of Study for Schools in Districts which are mainly Agricultural". He described the measures recently adopted in Bombay for introducing into 50 selected primary schools a definitely rural course for older boys. These schools had grown new crops, brought new land under cultivation and produced other beneficial effects on local agriculture. The teachers were trained primary teachers who had undergone a special course of training for an additional year. Each school had a farm of one to five acres, taken on loan from the land-owners of the district, who usually showed much interest in the work. Certificates were awarded to pupils successfully completing the course, these certificates having the same validity (*e. g.* for admission to the public service) as certificates awarded to pupils of the same age completing the ordinary school course.

Chairman, in summing up the discussion, pointed out that the problem of female education in England was different from that in India, where there was no surplus female population. In England, all girls could not be prepared merely for the home, and in many cases, it was necessary to train them for earning a livelihood in future. She agreed, however, that domestic training should form a part of the education of every girl

Rural Education.

The paper read by Mr. Syed Mohamed Husain, B. A., (Oxon:), on "The difficulty of bringing rural education into closer relation with rural life" appears in full elsewhere in the present issue of the *Hyderabad Teacher.*

Mr. H. E. Stapleton, Principal, Presidency College, Calcutta, expressed the view that the great need in India to-day was to encourage primary education rather than higher education. Mr. Staley, Inspector of Schools, Central Provinces, pointed out that the problem of rural education in India was different from that in countries like Australia, where literacy was almost universal. The chief aim of rural schools in India should be to spread literacy. It was enough to teach the boys the three R's and local geography. Mr. Tydeman (Panjab) described the measures which had been taken in the Panjab to cope with the problem of the lapse into illiteracy, which, he said, was very common in India, especially in rural areas. These measures were (*a*) oral propaganda, (*b*) schools for adults (*c*) village libraries and (*d*) the organisation of "rural" and "district Community Councils," which were formed on a voluntary basis, but received some aid from Government and employed various means of diffusing information and awakening interest. With regard to compulsory primary education, Mr. Tydeman remarked that the experiment had been more successful in the Panjab than elsewhere. He then described the arrange-

of the functions of the schools to find out the aptitude of each student, so that he might be educated accordingly. In this way, it would be possible to avoid the waste which was so common in India to-day.

Vocational Training for Girls.

Mr. F. Tate, Director of Education, Victoria, read an illuminating paper on the 'Training of girls as home makers'. He said that liberal education was not so much a question of subjects as of the way in which they were treated. Each subject should be taught in relation to practical life and students should be given an opportunity of doing practical work. For example, girls should be trained to do work which they would have to do in future as wives and mothers. The teacher, he remarked, was the heart and centre of the matter, and on the selection and training of the teacher depended the solution of the problem of devising an education which would be at once liberal and realistic in domestic, as in other subjects. Merely to introduce practical subjects into the curriculum would not necessarily result in introducing reality into education.

Miss Wark, Chief Woman Inspector, Board of Education, spoke on the "Training of Girls for trade and domestic employment". She described the lines on which the existing Trade schools in London were conducted. Girls entered these schools after the completion of the primary course. Great care was taken to carry on their general education and at the same time to treat the trade subjects in a truly educational manner. The schools not only trained pupils in the various trades, but helped them to find employment and continued to take interest in them after they had gone into workshops and studios.

Mr. Syed Mohamed Husain, Deputy Director of Education, Hyderabad Deccan, drew attention to the need for the differentiation of the curricula for boys and girls. The

Therefore, the alternative was to introduce vocational training in ordinary schools for boys of 13 or 14 years of age. This plan was being tried in the Panjab, where agriculture had been introduced in the Middle stage, the object being to give an opportunity to boys unable to go in for higher education to return to the land. An attempt had also been made to introduce a vocational element in the H. S. L. C. course by including commercial subjects in the curriculum, but this attempt had not been very successful owing to the strong desire of the pupils to go in for university education and liberal professions. In conclusion, Mr. Richey expressed the opinion that certain suitable areas should be selected for technical education, while elsewhere vocational education should be given in ordinary schools.

Mr. K. S. Vakil, Education Inspector, Northern Division, Bombay Presidency, described the conditions in the Bombay Presidency, where, he said, in view of the insistent demand for schools with a vocational bias, steps had already been taken and further steps were being taken to provide such schools. Mr. E. Tydeman, late Inspector of Training Institutions, Panjab, gave a brief account of the arrangements made in the Panjab for teachers' training in agriculture. Dr. Dunnicliff, Professor of Chemistry, Government College, Lahore, explained the importance of a knowledge of science for students desiring to receive industrial education and showed how necessary it was that the teaching of science in Indian schools should receive more attention than at present.

Mr. K. Mathan, Inspector General of Education, Mysore, read a paper on 'The relation of cultural and vocational aims in elementary and secondary education'. Referring to the antagonism between the cultural and vocational aims of education in India, he said that this antagonism had been produced in India by feudal and caste organisations. The two aims should really be complementary. It should be one

more practical element in the primary course in Canada. He said that this reform had made the children more interested, improved the attendance and led to the raising of the school-leaving age to 16. He also pointed out, with justice, that the school alone could not prepare for a trade. There must be co-operation between the school and the employer. A realisation of this fact, he said, had led the Education Authorities in Canada to set up schemes of apprentice training, which had proved highly successful.

Mr. Wicks, Chief Inspector of English Schools, Ceylon, drew attention to the need for each country working out its own educational system. In this connection, he showed how Ceylon had suffered from a wholesale importation of the English system of education, and explained the desirability of reorganising the educational system of Ceylon on a rural basis.

Vocational Education in India.

Mr. J. A. Richey, C. I. E., late Educational Commissioner in India, made a very interesting and instructive speech on 'Vocational Education in India', He said that the popular clamour for vocational education in India really constituted a demand for a wider field of employment. But for the success of any scheme of vocational education, two conditions must be satisfied :—(1) There must be an effective demand on the part of employers for the boys who were trained in each school ; and (2) boys must be willing to receive vocational education. These conditions were not generally fulfilled except in places like Cawnpore. Government service and the legal profession continued to be the greatest attractions.

Agricultural Middle schools had been opened in some parts of India in recent years, but they had not proved successful, because experience had shown that only dull and stupid boys who were unfit for higher education joined them.

mutual recognition of Teachers' Certificates'; and 'Co-operation between Education Departments' were referred to Committees, the Reports of which were subsequently adopted by the full Conference.

It is not possible for me to give, in the space of a short article, even a summary of the numerous papers read or the still more numerous speeches made at the Conference. I shall, therefore, confine myself to giving a brief account of the discussion of questions which I consider to be of interest to India.

Primary and Post-Primary education : Academic and Vocational Aims.

Almost all those who took part in the discussion on the questions included in Group A emphasised the need for bringing the 'primary' and 'post-primary' courses into closer harmony with the life and environment of the child outside the school and for providing alternative courses, after the primary stage, suited to children with a practical as well as literary or scientific bent of mind. Speaking on the question: 'How far should primary education be carried and when and how should bifurcation take place between vocational and academic instruction?' Dr. Viljoen, Director of Education, Cape Province, South Africa, laid down an important principle: On no account should primary education be treated on a utilitarian basis. It should confine itself to essentials and set aside all that is not indispensable. Bifurcation between academic and vocational education should not begin before the completion of the primary course. Dr. H. M. Richards, C. B., Senior Chief Inspector of Schools, Board of Education, expressed the opinion that the proper partition age would be between 11 and 12 years, and this opinion appeared to receive general acceptance. Dr. Merchant, Chief Director of Education, Province of Ontario, described the beneficial effects that had followed the introduction of a

speech which he made on the occasion, His Royal Highness remarked that the wide range of the Agenda 'reflected the extent and variety of the Empire'. Referring to the question of interchange of teachers, he emphasised the importance of this scheme in bringing the different parts of the Empire closer together and expressed the hope that further facilities would be provided for teachers to move about the Empire in the practice of their profession. In conclusion, he said, "The deliberations of so large a gathering of administrators will, I know, prove fruitful, but this Conference should derive no small part of its value from the personal contacts which it will enable you to establish. The exchange of ideas and experience with your colleagues in the educational service of other countries must effectively contribute to that closer co-operation in education which it should be one of our aims to secure."

As has already been mentioned in a previous issue of the *Hyderabad Teacher*, the subjects discussed at the Conference were grouped under five main headings, which were as follows:—

Group A. Education in relation to the pupils' after career, with special reference to problems of post-primary and vocational education.

Group B. Problems of special interest to tropical or sub-tropical countries where the population is of more than one race.

Group C. Rural Education.

Group D. New Ideas and Developments.

Group E. Problems of Administration.

Four subjects arising under Group E, *viz.* 'Temporary Interchange of Teachers'; 'Difficulties arising out of Teachers' Superannuation Schemes and Salary Scales'; 'The

The Imperial Education Conference, 1927.

BY

S. ALI AKBAR, M. A. (CANTAB).

Divisional Inspector of Schools, Hyderabad, Deccan.

THE third meeting of the Imperial Education Conference was held in London from the 20th June till the 8th July, 1927, and was attended by delegates from the Governments of 45 countries within the British Empire as well as representatives of the India Office, Air Ministry, Home Office, Ministry of Agriculture, Colonial Office and a few other Departments of the Home Government. At a preliminary meeting held on the 20th June, Lord Eustace Percy, President of the Board of Education, made an introductory speech, in which he drew attention to the fact that the focus of all the subjects included in the programme was to be found in the problem of post-primary education. Educational reformers in the past, he said, had tended to take, as examples of public education, achievements of the United States and Germany, but he hoped that the British Empire, having to focus and fuse an infinite variety of traditions and needs, might succeed in developing a balanced system of education superior to anything that had yet been developed elsewhere.

The Duchess of Atholl, D. B. E., M. P., Parliamentary Secretary of the Board of Education, was elected Chairman of the Conference, but on her suggestion, the Right Hon'ble W. Ormsby-Gore, M. P., Parliamentary Under-Secretary of State for the Colonies, was invited to preside over certain meetings at which questions relating to tropical and subtropical countries would be discussed.

The Conference was formally opened by His Royal Highness the Prince of Wales on the 21st June. In a brief

initiative with all the possibility and all the credit for failure or success. It is the most effective way of developing character and especially of turning a bad boy into a reliable one.

5. **Happiness.**—Promoted by good turns to others by cheery organised work for the community, by correspondence with fellow boys in other countries, and generally by the introduction of content, goodwill and love in his conduct of everyday affairs.

In organised work or games it should be made a point that every individual does his share in the cause of the whole.

In has been suggested that school might compete against school not merely in games but also in school work and that thereby keenness would be aroused among the scholars and the standard raised. Many teachers however see valid objections against the scheme.

In any case training in the above directions, if it is to be fully effective, should begin in the earliest stages of education. In the Wolf Cub branch the young boys are found capable of responsibility. The foundations can best be laid in the infant school.

Classification alone would not be fully effective without definite cultivation of the elements of character and tests specially devised for exposing them. Thus, for Honour, boys could be put on their honour and really trusted, not merely watched, in carrying out their responsibilities. Justice through team games and competitions. Sense of Humour is cultivable, not the inherent laughter at grotesque folly but the more refined humour with which the most serious situations can be balanced. (A schoolmaster whom I know uses "Three Men in a Boat" as his text book, and with success.) How to lose games with a smile instead of a snarl. Service can be practised and tested by voluntary work about the School premises in out of school hours and collective voluntary services for the community ; also through organised entertainments, games, etc.

2. **Accomplishments.**—Badges might be awarded for passing tests in school subjects, such as arithmetic, dictation, general knowledge, reading, languages, art, history, geography, music, etc. I suggest tests as distinct from examinations meaning thereby that the award would not be made on the number of marks gained but solely on the amount of effort on the part of the individual, by which means the most backward gets his chance with the most brilliant.

3. **Intelligence.**—Observation and Deduction, invaluable in all lines of life, are to some extent taught in the school curriculum in Nature Lore and Cause and Effect lessons ; but are more easily taught as a habit through tracking as described in "Training in Tracking" by Gilcraft (Published by C. Arthur Pearson).

4. **Leadership.**—The Patrol System is different from that of prefects, the perfect being more of a non-commissioned officer representing and backed by superior authority, whereas the patrol leader is held responsible by superior authority for all that goes on in his patrol, and to this end he is given

2. WOULD SCOUTING METHODS BE HELPFUL IN SCHOOLS?

The great Public Schools such as Eton, Rugby, Wellington, Charterhouse, Christs Hospital, etc., have lately taken up Scouting not because their boys need so much the training in character and intelligence but in order that they should eventually become Scoutmasters and pass on their Public School characteristics to their poorer brothers.

It gives them the ideal and practice of Service.

This step on the part of the Public Schools is being followed by a number of the leading Schools oversea.

The following suggestions have been made towards adapting the above ideals so as to be helpful to school teachers in their effort towards counteracting the tendency to selfishness incident to the award of individual prizes, scholarships, exhibitions, etc., and towards preparing the pupils for life and not merely for examinations.

1. **Character**—In developing character the teacher's difficulty lies in the large classes to be dealt with; in the Scouts we can fortunately keep our classes below the maximum of 32. None the less character is the most important subject of all in education and must therefore be tackled.

The following are the three of the more important elements of character suggested for consideration.

It has been suggested that the pupils might be classified as Excellent, Very Good, Good or Fair, in each of these.

HONOUR.	CHEERFULNESS.	SERVICE.
Sense of justice Straight dealing Incorruptibility Reliability	Sense of Humour which gives sense of proportion. Facing difficulties with a smile. Contentment with what you have got	Unselfishness Self sacrifice Helpfulness to others.

(These laws include honour, loyalty, helpfulness to others, friendship to all, courtesy, kindness to animals, obedience, cheerfulness, thrift, moral cleanliness.)

2. **Accomplishments.**—Self-education encouraged through the Badge system in some fifty useful attainments, among which the boy can make his choice.

The Badge system, where employed by an understanding Scoutmaster, can bring on the backward and give ambition and hope to the dull or poor boy.

3. **Intelligence.**—Through Tracking OBSERVATION and memorisation of detail is taught and becomes a habit; and the DEDUCTION of the meaning of the signs noticed develops reasoning, imagination and general intellgience.

4. **Leadership.**—Through the Patrol system where a boy is in responsible charge of six others. The sense of duty, initiative, tact, authority and human touch needed for leadership are developed. The Patrol at the same time learn the team spirit of Playing the Game for their side and not for self.

5. **Happiness.**—Through Nature study the boy is led to appreciate God and to recognise the beauties and wonders of nature, to understand sex problems, to realise the brotherhood of man and his place in the order of Nature, and thus to develop goodwill and love with a fuller enjoyment of life.

Character development is the important objective in education. The three R's alone can produce good crooks as well as good citizens.

Knowledge without the ballast of character is apt to be dangerous.

Character gives the poorer boy his chance; and if it includes Love it produces Christianity in practice and not merely in precept.

Educational Aspect of the Scout Training Methods.

Notes of a speech delivered by Sir R. Baden Powell on the 21st June, 1927, on the occasion of the visit of the delegates of the Imperial Education Conference to Scouts Training Centre, Gilwell Park, Essex.

1. WHAT WE DO IN THE SCOUT MOVEMENT.

We aim our programme as follows:

(*a*) We study what qualities will be needed in the citizens of the future.

(*b*) We study each individual boy, his inclinations and his failings.

(*c*) We then eliminate the bad and promote the needed qualities in the boy through the activities and attractions of Scouting.

OUR OBJECT is to fill in any chinks left in the school education in the direction of developing character, of preparing boys for making the best of life, and of expanding the habit of goodwill and helpfulness generally in place of the prevailing self-interest and antagonisms.

The term "Scouting" means generally teaching such attributes through the laughter and self-education involved in practising the camp life of backwoodsmen.

The following are among the subjects which we promote:

1. **Character.**—Through the Ideals of the Scout Law which mainly develop love through practice of service.

conveying all kinds of modern knowledge and how her success in this direction has made it possible for her to raise the cultural standard of her people in a short time to the level of that possessed by the most advanced countries of the west. By adopting the same means, India, too, can develop her national culture and thereby occupy that important place in the comity of nations for which the heart of each true son of India is to-day longing.

knowledge of English, the interests of sound education must not be sacrificed to the object of keeping the standard of English high.

The fourth objection which deserves consideration is that India is a country possessing not one but several vernaculars. The multiplicity of vernaculars is certainly a serious difficulty, but this difficulty can be surmounted by opening a university for each vernacular in the province where it is predominant. Sooner or later India will have to modify her political divisions on a linguistic basis. But if this is not done, there is no reason why the educational system should not follow that basis.

The last objection is that the adoption of vernaculars as the media of instruction will hamper unity in India. It must be remembered that English is not and can never become a common language for all the people in India. It has become the *lingua franca* of only the educated classes, who form a very small minority. And since under the system of education with the vernacular as the medium of instruction, the importance of English is emphasized by its being made compulsory, it will continue to be as effective a bond of unity as it has been in the past.

The great need in India to-day is that her system of education should be rationalized and nationalized, but neither rationalization nor nationalization of education is possible so long as a foreign language is the medium of instruction. It is only when the vernaculars are rescued from the neglect into which thay have fallen and are made the vehicle of knowledge that India can cultivate her national genius. Japan has set an example, which we will do well to follow. Nawab Masood Jung Bahadur—Mr. Ross Masood —gives in his book *Japan and her Educational System*, a very interesting account of how Japan has been able to make her cumbersome language an effective instrument for

literature to be up to date. Secondly, the professors and lecturers can acquaint the students with the latest developments in the subjects taught by them in the same way as a German professor explains to his students the latest discoveries made by scientists in England. Moreover, since English remains a compulsory subject under the scheme in question, students can freely consult such English books as have not been translated into Urdu, just as English students consult French and German books. Even if the number of vernacular books in any particular subject is small and the student is consequently obliged to resort to books in English on a large scale, he will have, unlike students of other universities, the option of answering his examination papers in his mother-tongue. This is no small advantage, for difficult as it is to assimilate ideas through a foreign language, it is even more difficult to express one's own ideas in such a language.

Thirdly, it is feared that if the vernaculars are made the media of instruction, the standard of attainment in English will be lowered. This fear is not unfounded. But if proper arrangements are made for the teaching of English, it is possible for the students of a university where the medium of instruction is the vernacular to attain as high a standard of English as students of those universities which use English as the means of instruction. The reason is that the former can devote to the study of English the time which they save by reading the other subjects in their mother-tongue. When the vernacular was substituted for English as the medium of instruction in the secondary schools of the United Provinces a few years ago, opponents of the change had prophesied a lowering of the standard of English. But the report on education in the United Provinces for the Quinquennium 1917-22, declares that "so far as can be made out, English in schools is somewhat better than it was at the beginning of the quinquennium," In any case, even if the adoption of the vernacular medium leads to a slight deterioration in the

suitable a medium for University education as Urdu, Marathi, Gujrati and Telugu.

Though the volume of opinion in favour of vernacularizing university education is rapidly growing, the movement has not yet attained the popularity which it deserves. It has still many critics, and the chief objections raised by them are as follow :

The first objection is that there is a paucity of good vernacular books on scientific and technical subjects. It is said, besides, that these subjects require a vocabulary which does not exist in our vernaculars. Those who raise this objection forget that in recent years there has been a great development and improvement of vernacular literature on the desired lines. Nor is there any scarcity of men capable of providing suitable vernacular substitutes for ordinary English text-books. It is the demand that regulates the supply. If proper encouragement is given and if a Bureau of Translation and Compilation is attached to each vernacular university which it is proposed to establish, within a short time the resources of the vernacular concerned can be developed so as to render it a suitable means of instruction. Anyway, our difficulties in this respect are not so great as those which Japan had to experience, for constructionally the Indian languages are far nearer the European languages than is the Japanese language. And when Japan has succeeded in making her language an effective medium for the communication of modern knowledge, there is no reason why we should not be able to adapt the Indian vernaculars to that purpose.

Secondly, it is said that even with the aid of the most efficient Translation Bureau, it will not be possible to keep pace with the rapid developments in arts, sciences, and technical subjects. It is not difficult to meet this argument. In the first place, it is quite possible for the vernacular

the university are not handicapped in any way when they join other universities in India and elsewhere for prosecuting further studies in arts and sciences or receiving technical and professional education. Indeed, owing to their superior mental training and better grasp of the subject, they often do better than the students of other Indian Universities in these higher branches of knowledge, as is evident from the distinctions gained by some of our students in the examinations held by such an important British Indian University as that of Dacca.

The inauguration of the Osmania University has been followed, as was expected, by an outburst of intellectual activity in the Dominions of H. E. H. the Nizam. This activity is not confined to the upper and middle classes, nor to only one sex, for owing to the development of Urdu literature and to the proficiency of the educated classes in that language, there is no longer any difficulty in bringing modern knowledge within the reach of the masses and the women-folk, who owing to the stress of the social and economic conditions obtaining in the country can never afford the time necessary for learning a language as foreign to them as the English language.

While the Osmania University has demonstrated the possibility of using Urdu as the vehicle for the conveyance of scientific ideas, Professor Karve's Indian University for Women at Poona has shown that Marathi can be adopted as the medium of instruction in all the stages of education. In the meantime, the Andhra University, recently established in the Madras Presidency, is taking steps to give the same importance to Telugu, while the Baroda Government is considering the question of employing Gujrati as the medium of instruction in the proposed Baroda University. It is to be hoped that Bengal will follow suit, for Bengali has reached a stage of development at which it can form as

A great deal of spade work to be done in order to make this scheme a success for in spite of the revival of Urdu literature, to which I have already alluded, the number of Urdu books in the various scientific and technical subjects suitable for university students had remained inadequate. Therefore, the first thing that was done was to set up a Translation Bureau, which within five years was able to prepare by translation and compilation nearly all the text-books required for university instruction. The devising of technical nomenclature was a difficult problem, to solve which committees consisting of representatives of modern and ancient learning were appointed. These committees have been able either to discover or coin Urdu equivalents of thousands of technical terms, though they have retained in their original form such Europeans terms as have become familiar in Urdu or as do not lend themselves to translation just as the Greek and Latin terms have been kept unchanged in English. As the result of the joint efforts of the above-mentioned Committees and the Translation Bureau, the Urdu language has been developed and improved to such an extent that it is now possible to use it efficiently as the vehicle of instruction in modern sciences. A very satisfactory feature of this attempt is to be seen in the fact that the terms coined by the Translation Bureau have been accepted by the Urdu speaking provinces of India and are being used copiously by writers of learned articles in Urdu periodicals.

This adoption of Urdu as the medium of instruction has greatly facilitated the process of thought and expression, and there is ample testimony to show that the grasp of the various subjects possessed by the students of the Osmania University is much superior to that possessed by the students of the other universities in India. At the same time, since English is a compulsory subject for all the examinations and since the university aims at maintaining as high a standard of English as the other Indian Universities, the graduates of

In the meantime, a move has already been made in favour of adopting the vernaculars as the media of instruction in universities. The leaders of this movement are not opposed to the study of English, but on the contrary, recognizing fully the immense benefits which the study of the English language has conferred on India by bringing her into close touch with the liberal ideas of the West and by fostering unity not only between Indians and Englishmen, but also between Indians and Indians, they emphasize the need for retaining the English language as a compulsory subject in colleges as well as secondary schools.

The principle that the vernaculars should be the media of instruction in schools as well as in the universities is conceded by nearly all educationists in India. If there is any opposition, it is made on the ground of practical difficulties. In this connection, the bold experiment undertaken by the Hyderabad State in the establishment of a university with Urdu as the medium of instruction has shown how these difficulties can be overcome. The Osmania University, as this university is called after its illustrious founder, His Exalted Highness Nawab Mir Osman Ali Khan Bahadur, Nizam of Hyderabad, was inaugurated in 1916. Its aims are clearly set forth in the Charter granted to it by its founder:—"The knowledge and culture of ancient and modern times may be blended so harmoniously as to remove the defects created by the present system of education and full advantage may be taken of all that is best in the ancient and modern systems of physical, intellectual and spiritual culture. In addition to its primary object to diffuse knowledge, it should aim at the moral training of the students and give an impetus to research in all scientific subjects. The fundamental principale in the working of the University should be that Urdu should form the modern of higher education but that a knowledge of English as a language should at the same time be deemed compulsory for all students."

thinking power, the cramping of all originality, the neglect of the vernaculars, and the wide gulf created in consequence between the educated classes and the masses all these defects are now being increasingly realized. There is therefore an insistent demand in India to-day for a radical change in the system of education. In fact, a change has already begun. The revival of vernacular literature has been one of the objects of the national movement which began in India early in the twentieth century after the partition of Bengal. During these years, the literatures of nearly all the important vernaculars, Urdu, Hindi, Bengali, Marathi, Gujrati. Tamil, Telugu and Kanarese have been considerably developed and enriched by means of translations and original compositions. There has also been a marked tendency in recent years to give to the vernaculars a more prominent place in the curricula of studies than they have occupied in the past. In regard to Primary education, this tendency is to be seen in the attempts that are being made in India to postpone the age at which the teaching of English should commence. It is generally agreed that a child should not be taught English even as a second language until he has made some progress in the Primary stages of instruction and has received a good grounding in his mother tongue. In consonance with this principle, English has been eliminated in the Punjab as a subject to be studied in the Primary stage, while in the Hyderabad State, which I have the honour to represent here, English is not begun till a boy reaches Standard III, *i. e.*, fourth year of the Primary stage. In the Secondary stage also, the vernacular is being gradually substituted for English as the medium of instruction—a process which has been greatly strengthened by the recommendation of the Calcutta University Commission, namely that up to the matriculation stage English should only be taught as a compulsory second-language and that its use as a medium of instruction in schools should be discontinued.

"They have felt that in matters pertaining to Art and Philosophy, that is to say, in matters that affect the human soul intimately, they have nothing to learn from the West, and that their social customs and national beliefs are as refined and as logical as those of Europe. The inner life of the nation, therefore, has continued its course, uninfluenced by that which has been imported from foreign countries."

On the other hand, in India, while the foreign culture with which our system of education is untimately associated has not, as in the nature of things it could not, become a part of our national life, we have neglected our own culture, in consequence of which, notwithstanding a century of English education and despite our vast economic and intellectual resources, we still continue to be a poor and backward poople, unable to occupy in the comity of nations a place worthy of our ancient traditions and culture.

When the protagonists of the present system of education—and there are many of them even amongst Indians—say that it has brought us into touch with Western ideas and Western Methods, they are apt to lose sight of the fact that it has produced only cheap imitations in India. When they claim for this system of education the merit of having opened out to us the treasures of Western knowledge, they ignore the important fact that we have not been able to assimilate this knowledge. If you want a nation to imbibe more liberal ideas and adopt more useful methods, you must train its mind effectively, but such mental training is not possible under a system of education which is under the sway of a foreign medium of instruction.

It is, however, gratifying to find that the many obvious defects of the present system of education *viz.* the undue and unjustifiable strain on the student's mind, the time which he has to devote to the study of the English language at the sacrifice of the subject-matter, the weakening of his

I have already described, when the Indian student goes out into the world of reality, he finds that it is quite different from the world which the books he has studied and the lectures he has attended have portrayed before him. It is obvious that a system of education, which is not based on national lines and takes no account of the environments, experiences, feelings, sentiments, and aspirations of those for whom it has been devised, can never be successful. The progress of a nation depends not so much on the efforts it makes to acquire a foreign culture, which can never become altogether its own, as on its capacity to develop its own culture and intrinsic genius and to adapt them to modern conditions of life. This is the lesson which the recent history of Japan teaches us. She has no doubt adopted foreign ideas and foreign methods, but in doing so, she has taken care to shape them in such a way as to suit her special requirements. In this connection, I should like to quote the following from a very interesting and instructive lecture on "Japan" recently delivered by Nawab Masood Jung Bahadur (Mr. Ross Masood), Director of Public Instruction, Hyderabad, Deccan, who has visited Japan twice and made a special study of her educational system :

"She (Japan) went to Europe and America as one goes to a shop, and brought back with her only that which she felt was needed by her. In other words, she 'skimmed the cream from the milk, irrespective of the breed to which the cow belonged.'

" The result of this eclecticism has been that the Japanese, instead of themselves becoming Westernized, have Japanized the most useful products of Western civilization. Unlike us in India, they have not concentrated their attention on any one country, but have subjected the whole of the Western world to a searching examination—almost microscopic in its character—in the attempt to make a minute study of it.

the intricacies of foreign grammar and idiom prevent them from paying undivided attention to a study of the subject. The result is that their minds are filled with words, and not with the ideas which those words are intended to convey. For example, when an Indian student is reading a history book in English, he finds it hard to concentrate on the subject, because there are many words and phrases with which he is not familiar and many sentences, the construction of which he cannot easily follow. This makes his task doubly difficult. But this is not all. Even when with the help of his dictionary or his teacher, he has managed to grasp the facts, he finds that he is not able to express them in his own words. All these difficulties lead him to memorize long passages out of the book; and needless to say, this practice of cramming produces a most detrimental effect on his intellectual powers. The English system of education has thus tended to weaken the power of thinking and to crush all initiative and originality amongst Indian students.

Another serious defect of this system of education is that it has entirely disregarded the national traditions, ideals, and aspirations of the people. The aim seems to have been to transplant English culture and English traditions in the soil of India. But owing to the uncongenial nature of the soil, these things have not been able to take a deep root there. The text-books on the various subjects prescribed by the Indian Universities are generally books written from the English point of view; that is to say, their background is English and they have no direct relation to Indian conditions of life and thought. They emphasize English traditions and English ideals, and the examples chosen are also English and not Indian. This kind of education kills the soul of the Indian student and places him in an artificial world. One of the most important aims of education is that it should prepare boys for the actual requirements of life. But owing to the circumstances which

neglected, and, owing to the comparatively unimportant place occupied by them in the scheme of studies, the universities produced few men competent to translate European books of learning into the vernaculars, while such Indians as could undertake the task often preferred to convey their ideas in English because of the dignity attached to compositions in that language. In these circumstances, those who did not know English had no opportunity of making themselves acquainted with modern thought. Hence, half a century after the Despatch of 1854, we find the Government of India complaining in their Resolution on the University Commission Report of 1904 that "in the pursuit of English education, the cultivation of the vernaculars is neglected, with the result that the hope expressed in the Despatch of 1854 that they would become the vehicle for diffusing Western knowledge is as far as ever from realization." Thus the consequence of making English the medium of instruction at the expense of the vernacular has been that the benefits of Western knowledge have been confined to an infinitesimal percentage of the population of India, for after all, out of a population of 319 millions, there are not more than 3 million men and 300,000 women who can read and write in English.

Let us now consider the effects of the "English education" on the intellectual development of the upper and middle classes, for whom it was originally devised. These classes are not lacking in intellectual powers, and yet, the number of Indians who have made any original contribution to the stock of knowledge in modern times is most inadequate when we take the enormous population of the country into consideration. The capacity for original thought among the graduates of the Indian Universities is generally poor, because their best energies have been spent on the mechanical attempt to acquire the power of expression in a foreign language. The efforts they have to make in trying to master

were not sufficiently developed for the purpose. But though English was adopted as the medium of instruction, the Government emphasized the need for developing the vernaculars and for teaching them efficiently in all schools. They even appear to have looked forward to the time when Western knowledge would be widely diffused through the vernacular, as the following passage in the annual report of the Public Instruction Committee for 1836 shows:—"We conceive the formation of a vernacular literature to be the ultimate object to which all our efforts must be directed." A few years later, in the famous Despatch to the Governor-General dated 1854, the Court of Directors declared the same principle, and expressed the hope that "the vernacular literatures of India will be gradually enriched by translations of European books or by the original compositions of men whose minds have been imbued with the spirit of European advancement, so that European knowledge may gradually be placed in this manner within the reach of all classes of the people."

But though Government had unambiguously declared more than once that their ultimate aim was to develop the vernaculars for the purpose of a wider diffusion of European knowledge among the people, they did not take any active steps to carry out this aim. Nor was their hope that the upper and middle classes would, after acquiring Western knowledge themselves, pass it on to the rest of the people fulfilled. The Government chose its Indian officers mainly from amongst those who were competent in English, and the attraction for Government service led students to devote most of their time and attention to a study of that language, so much so that proficiency in English came to be regarded as the be-all and end-all of modern Indian education. The universities did nothing to discourage this tendency. The secondary schools as well as the colleges laid special stress on the study of English. The vernaculars continued to be

Vernaculars in Education and their use as the Media of Instruction.

A paper read at the Imperial Educational Conference held in London in June, 1927.

BY

S. ALI AKBAR, M. A. (CANTAB),

Divisional Inspector of Schools, Hyderabad, Deccan.

JUST as classics and theology dominated the educational system in England, and indeed the whole of Europe, for centuries, oriental learning and religion continued to be the prominent features of the educational system of India until the second quarter of the nineteenth century. The instruction imparted to the Hindu boys consisted almost entirely of Hindu religion and Sanskrit, while the Mohammedan boys learned little beyond Islamic theology and Arabic. The vernaculars found hardly any place in the scheme of studies. The East India Company, at first, took no interest in the education of Indians, but when by the Act of 1813, the Directors were required to spend at least a lakh of rupees annually on education, they directed their efforts wholly towards the encouragement of oriental learning. In 1835 Macaulay's famous Minute brought about a change in this policy, as Government declared in that year that "the great object of the British Government ought to be the promotion of European literature and science amongst the natives of India and that all the funds appropriated for the purposes of education would be best employed on English education alone." With regard to the medium of instruction, all parties were agreed that the vernaculars

---

N. B.—Certain portions of this paper could not be read at the Conference owing to lack of time.

If we want to draw to the educational service men of better social position and qualifications, we must make the service attractive by offering better pay and future prospects. We must raise the salary of a rural teacher to such an extent as to enable us to engage the best products of the Universities and Training Colleges.

I do not wish to encroach any more upon your time. I am afraid, I have already taken too long over the subject. I finish by summing up that the two main difficulties in the way of bringing rural education into closer relation to rural life are the want of funds and the want of efficient teachers; when once these two difficulties are solved, then there will be no difficulty in introducing such rural education in rural areas as will suit the rural population and will be closely related to rural life.

teachers in India. Unless we produce capable teachers no reforms in rural education and rural curricula will ever be met with success. An Indian Primary teacher can perhaps successfully teach the 3 R's and make the pupil cram and pass examinations, but to carry on the education of the type proposed by me in the previous paragraphs is certainly beyond his powers.

It is, therefore, necessary that attempts should be made to provide rural schools with better teachers. To achieve this the following steps can be taken:—

Firstly.—Well-qualified and trained teachers should be appointed in the rural schools. At present any candidate with Elementary or Middle School Certificate is recognised to be competent and qualified to be a teacher in a Primary School.

The minimum literary qualification for a rural teacher should, for the present, be to speak in terms of examinations, Intermediate. This standard can be raised later on and even Graduates can be appointed in rural Primary Schools.

Secondly:—No teacher should be allowed to take up teaching unless he has undergone a course of training in a recognised Normal School. The nature of training should be such as to qualify him to teach in an efficient manner all the subjects included in the curriculum for rural schools.

Thirdly and lastly his pecuniary position should be improved. A Primary teacher in India is a very poorly paid person. In British India, a Primary teacher generally receives a petty salary of £ 1-10-0 a month, and in some cases even less. In the Hyderabad State things are a little better. A Primary teacher, who has passed the Midddle School Examination and has also undergone one year's training in a Normal School, is entitled to a salary of from £ 2 to £ 4 a month.

Although Provincial Governments in British India and the Indian States have now adopted a liberal policy as far as education is concerned and are spending much more than what they used to do some years back, still facts and figures show that it is not as much as it ought to have been and that the educational needs of the country demand much more.

In British India the direct and indirect expenditure on education in the year 1925 was roughly about fourteen million pounds, of which nine million pounds were spent on Primary and Secondary education. For a huge country like India with its enormous population of 320 millions this sum is not enough. In England last year expenditure on Primary and Secondary education was nearly 76 million pounds.

Japan, an oriental country, is not very much behind the occidental countries in spending money on education. Mr. Syed Ross Masood, the Director of Public Instruction, Hyderabad, writes in his book "Japan and its Educational System" that Japan has so highly been developed educationally that even in a village whose total population was only 42 souls an elementary school has been established.

As it is the paramount duty of every state to see to the proper education of its future citizens, I say the Provincial Government and the Indian States should see that every possible source is tapped to provide properly and liberally for education.

I think I have said enough about the financial difficulty and how to overcome it. Now I pass on to the question of teachers.

India has been very unfortunate as regards her teachers. There are thousands of men and women who are serving as teachers, but of these there are very few who are actually fit to be called teachers. There is a dearth of good and efficient

In a country like India, the poverty of which is proverbial, to depend upon private support and contributions will be madness. Of course India has its Zamindars, landlords, bankers and merchants, but their number when compared to the vast population is negligible. Here and there are to be found stray examples of rich donations from Indian philanthropists, but they too are so few and so small compared with the needs of the country that they might as well be ignored. The poverty of the masses of India is a recognised fact and it haunts us like a phantom in everything we undertake. Such being the case, we should, for the present, eliminate the idea of securing any support on even a moderate scale from private resources. We should only look to the state for help.

In every country universal education of the type described above should be supported by the State and should form the first item of State expenditure. The financial support for making efficient citizens and skilled workers should be given by every state ungrudgingly. No country will be justified in economising in matters concerning education.

It is a fact that no one can deny that during the last Great War different countries which took active part in the War, spent money like water. If countries are capable of spending so liberally in the work of human destruction, surely they ought to be expected to invest liberally in the work of human construction.

In British India and the Indian States education should form the first item of expenditure, and as much should be contributed from the State revenues as possibly could be spared. I think that both in British India and the Indian States there is a scope for retrenchment in other departments of public administration. If retrenchment is carried out, a good deal could be saved for education. I do not hesitate to propose even a national loan for the sake of education.

Third:—The teachers employed in the rural schools should be trained in large numbers. At present there is a paucity of trained teachers in India. Arrangements should be made in the normal schools to acquaint teachers with the elements of agriculture and horticulture. And the number of training schools should be increased.

These are the lines on which I propose the present rural education to be reformed and remodelled. An intensive work of this kind would, I am sure, popularise education among the rural population and will produce healthy, intelligent and sober-minded citizens.

I have first described the present rural education, then I have given my suggestions as to how it ought to be reformed. Now I deal with the difficulties which will have to be faced in introducing this reformed type of education in rural areas.

The two main difficulties that will have to be encountered will be the following:—

(*a*) Want of funds.
(*b*) Want of well-trained teachers.

If these two major difficulties are surmounted, then the other difficulties of minor nature will themselves disappear automatically. To improve the present system of rural education and to bring it into closer relation with the rural life no cheap remedy can be found. The proposals that I have made involve more and better training schools, school gardens with wells, well-trained teachers, decent buildings and better school appliances; and all these are things that require an increased outlay.

In my opinion there can be only two ways, by which such a big scheme of universal rural education can be provided for:

(*a*) State support.
(*b*) Private contributions.

fit in with agriculture. The result of all this is the general apathy of the people to send their childrden to schools and the general failure of education.

I have said enough about education, as it is now. I have also shown that education as it is given now in the rural areas, is not of the correct type. Having pointed out the defects as they exist in rural education, it is incumbent on me to suggest the remedies also, and to point out briefly what rural education ought to be.

I propose the following reforms :—

First :—The curriculum for rural schools should be revised and reformed. We must include in the curriculum all that is valuable in the pupils' own experience and in the experience of the community to which they belong. Unless this is done the pupils will not be able to fit themselves into their own environment and to improve that environment. The environment of a rural pupil, as mentioned already, is agricultural. So to make rural education congenial to rural environment an agricultural atmosphere should be created in the schools, so that the life of the school may be co-ordinated with the life of home. The curriculum should include besides the 3 R's Nature-study, Hand-work, elements of Agriculture, Hygiene and such physical exercises and games as are suitable to rural children.

Second :—Every school should have a decent, airy and well-lighted building. India is notorious for its bad, insanitary, dark and dingy school buildings. To every Primary rural school a small garden should be attached. It should be about an acre in size. The school gardens besides beautifying the surroundings of the school will introduce an agricultural atmosphere in it and will inculcate in the minds of the boys the value of labour and the importance of agriculture. Besides this, Agricultural Middle and High Schools should be opened in the district towns.

It is also said that education in India is nothing but a wholesale exploitation of the child by the parents, and the teachers. The parents want a wage earner, while the teachers use him as a cat's-paw to show their work, and to gain promotion.

Besides this the present educational system tends to externalise the pupils' outlook in life and leads them to false hopes, and thus gives them a bad start in life. It teaches them to look outside themselves for reward. At school they learn to value examinations and prizes more than real knowledge. They concern themselves with things which have the least to do with them and know nothing about their own bodies and minds. Their own physical welfare, and that of the community are questions beyond their pale. In their thirst for examination results they do not even take care of their own health. Then, again, the present system is undemocratic and largely devoid of respect for the personality of the child. Regardless of the natural instincts of the pupil, it attempts to force upon him from outside his life, knowledge in which there is no inherent interest to the pupil and which has no connection whatsoever with his life.

It is my conviction that so far the failure of rural education in India has been due to the fact that the educational system and practices of present day are not based upon sound principles of education. We have gone contrary to what are now almost universally regarded as sound principles, especially the psychological basis of education, and the influence and guidance of environment. A pupil, when he enters the four walls of the school finds himself in an atmosphere quite different to that of his home. In the class-room he enters into a new life of books, papers and sums etc., quite unconnected with his outdoor life at home in which the sowing, reaping of crops and care of animals are the chief occupations. The school times and seasons are not fixed to

Difficulties of bringing rural education to closer relation with rural life and the methods of surmounting these difficulties.

A paper read at the Imperial Education Conference held in London in June, 1927.

BY

SYED MOHAMED HUSAIN, B. A. (OXON),

Deputy-Director of Public Instruction, Hyderabad, Deccan.

THE subject which I open just now is a very important an extensive one. In India there are about 700,000 villages and nearly 90% of its total population lives in these villages. So rural education in India means the education of millions of people.

Before I enumerate the difficulties of bringing rural education into closer relation with rural life, I deem it necessary to state briefly what rural education in India is now, and what it ought to be.

I regret to say that rural education, as it is in India, is not the right type of education. All public men and educationists agree that the education now given in the rural areas is wholly literary, and not co-ordinated with the life of the people and especially with agriculture, the main interest of the rural population. The agriculturists object to the education of their sons on the ground that it disinclines them to their hereditary pursuits and makes them covet Government posts, such as Clerkships and Teacherships.

Just a word about the final stage—the award of the Group Certificate. On a certain form—A. 22—we have a statement of the whole record of the candidates in each subject—teachers' marks, written examination marks, and results and any notes supplied by the inspectors. These forms are scrutinised in the first place by selected officers who enter Pass or Fail, in red ink if they are certain, in pencil if there is any doubt. A second group of officers then go over all the candidates a second time. They may reverse red decisions—they seldom do, and they decide on the black pencil cases, their handwork being in *blue*. At the third stage every blue decision is checked by one officer, and his work is no sinecure—*experto crede*. If there is any case of special difficulty it is discussed with the junior officers and not infrequently referred to His Majesty's Chief Inspector along with the candidate's written books. Even after all the results are issued we are prepared to deal with appeals. They are not numerous and we do not encourage them!

The system is laborious—*tantae molis crat Romanam condere gentem*—but it has proved to be effective. It means the co-operation of examiner, teacher, inspector and office staff and we claim that it gets over most of the possibilities of unfairness that mere examination is apt to cause.

---

deaf and has lost marks in the diotation test in foreign languages, or he has lost his head—I am sorry to say,—it may only be a passing phase, your Grace, it is usually *her* head. All these possibilities have to be reckoned with. And how is it odne?

Every school, in sending up its lists, gives a mark to each candidate for each subject and also a summary mark of general proficiency. When the Inspector visits the school, he has with him the teacher's estimates and the marks made in the written examination. If the teacher's list is reasonable, *i. e.*, if his marks and order of merit correspond generally with those of the written examination, H. M. I. is at liberty to propose reversal of the written result in individual cases of discrepancy. Good pupils who have unaccountably failed may pass and *vice versa.* Every such proposal is submitted along with the written books to the Divisional Chief Inspector and by him to the Department, who review every proposal with great care. Most, but not all, are finally accepted. Even if a pass is not accorded in the individual subjects the facts are noted for consideration when the claims of the candidate for the Group Leaving Certificate on the whole range of his work are being assessed.

It will be seen that in this arrangement the examination test is supplemented by inspection, which reveals not only the general aim and method of the work but the ability and industry of the candidates and especially those about whom there is any doubt. The class exercises and examinations are carefully scrutinised and, if need be, a short supplementary written test is imposed. The teacher whose list proves that he knows his candidates well has sometimes a big say in their fate, not only in individual subjects but in the award of the Group Certificate, and the candidate learns to understand that his work throughout the session counts as well as his performance on the day of examination.

Let me illustrate my meaning by giving you some account of our Leaving Certificate Examination. In the first place we endeavour to eliminate the luck and caprice of a single test. I said that the questions must be good. But that is not all. The greatest possible care is necessary in the selection of Revisers, Chief Revisers and Examination Committees or Boards. The rôle of the Chief Reviser is of the greatest importance. He decides on the paper, often after a great deal of discussion. If he is not himself in touch with the schools he makes a point of consulting those who are.

When it comes to determining the relative severity of the different revisers and the pass-mark in each case, he has an extremely difficult and responsible task. He must know all his men's methods and standards. He has already endeavoured to keep them as near the accepted standard of the examination as possible—by means of instructions, specimen papers, etc. He may occasionally find a reviser who is so unsatisfactory that all his paper have to be re-read. Then, in deciding the pass-mark, he will consider what percentage of pass it will produce in a group of schools whose past history is known. If the mark he thinks of means a serious divergence from the percentage of passes in previous years, he must modify it accordingly. For over thousands of papers it is impossible that there should be wide variation from year to year.

When all these precautions are taken, the pass-mark may be considered to be properly established and general justice has been done. But justice has not been done to every individual. In a number—not a large number—of cases, exceptional circumstances have arisen. A good pupil has been ill at the examination or just before it: there has been trouble in the home-illness, anxiety, death: a candidate has a physical defect which interferes with rapid writing or is

Examinations which take due account of this distinction are not exposed to the criticism that they deaden and fetter the teaching. They leave the good teacher absolutely free. He will teach the subject so that the pupils learn it and can ignore what the examiners are likely to ask.

But there are subjects which do not lend themselves so well to written tests. It must be our business to ascertain what they are, to decide whether it is necessary to examine in them, and if it is, to find the best methods of doing so. It may prove to be the case that much of the very best in the work of our schools, many of the "impalpable essences" should not be examined at all. And we must always remember that we have not yet determined accurately the relation between success in school tests and usefulness in life, and have not always asked ourselves whether interest in a subject does not run a risk of being dulled and limited by the perpetual obsession of the questions that may be put on it. The *reductio ad absurdum of* the examination attitude of mind is represented by an Aberdeen incident. The murderer Lefroy had been condemned to death and a petition had been presented for a reprieve. When it was announced in the class-room of an Aberdeen crammer that the petition had failed and the convict was to die, the crammer remarked:—"There's naethin' for him noo, boys, but to wire into releegion". If it were all as straightforward as that, the adjustment of education to life and industry would be as simple as it would be uninteresting.

We must frankly admit that examinations may disturb a good curriculum, that they may encourage a wrong attitude to study and that they may not always be fair in their findings. But on the other hand they may and often do encourage the development of a sound study of the subjects with which they deal, and the dangers they involve can be avoided, to a large extent if not entirely, by good sense and by the constant realisation of these dangers.

was proposed to abandon it three years ago, the teachers implored the Department to keep it going, as a stimulus to work and a guide to promotion. I cannot believe, ladies and gentlemen, that either at the end of the Primary or half-way through the Secondary Course, teachers should have any need of outsiders to tell them whom to promote and whom to keep back, and surely the stimulus to work should come from the teacher and not from outside.

To digress for a moment, I should say that for the Intermediate Certificate we have substituted the Day School Certificate (Higher). The examination is taken only by those who leave after three years of a Post-Primary Course. Further, instead of an elaborate written examination in English, History, Geography, Mathematics and one or more foreign languages, and also oral and practical tests in Science, Art and similar subjects, we have one paper to test English and general intelligence. The rest is based on school record and inspection, and we are confident that a uniform and reasonably exacting standard is being maintained.

To revert to the general question of written examinations, subjects vary greatly in examinability, and the significance—the permanent significance—of the results obtained varies widely in different subjects and even in different parts of the same subject. The essential value of an examination is in proportion to the demands it makes on the power to apply an ordered body of knowledge to new situations. Its value is largely determined by the extent to which it gets away from more memory work, which can be crammed a day or two before the examination and forgotten a week or two after it.

The examinable subjects and parts of subjects that I have mentioned cannot possibly be carmined the night before —they must be learned over a long period and the method of attack must be *nulla dies sine linea.*

school. There is no doubt that the school record should have more weight attached to it—a point to which I will return later. A mere examination with no reference to the kind of course that has been followed may be most deceptive. The attainments it tests, too, are, in some subjects, evanescent—a good thing from some points of view, for the art of remembering is largely the art of forgetting and the best thing a young man can do with much of the undigested lumber he has to take into the examination room is to throw as much of it as possible at the examiner's head and forget the rest.

I proceed to a brief consideration of the character of examinations, which must depend on the various purposes they serve. Examinations may be used (i) to show the efficiency of a class or of a stage of advancement in a school, or (ii) to determine whether individuals should pass or fail, or (iii) to produce an order of merit. For all three purposes, even for the third, the tests are usually too difficult and the standard of performance demanded too low. We have heard of 33 per cent. as the pass-mark, we know of many cases where it is about 50. In the examinations I am most familiar with the constant endeavour for many years has been to simplify the papers, to make the marking severe and to look for a higher pass-mark. The border-line is always debatable and perplexing. If the questions are too hard, it becomes utterly bewildering and unsatisfactory, and you have to accept candidates whose scripts are a mass of errors.

It is sometimes held, even by teachers, that external examinations are necessary for the purposes of classification, for example, at the point where primary work ends and secondary begins. Let me say here quite dogmatically that the less we have of external examination at 11 or 12 or for some years thereafter, the better. For many years we had in Scotland the Intermediate Certificate Examination held about half-way through the Secondary Course. When it

stood higher than at the present day. If we hear any grumbles, they are made because the Inspectors, the teachers' friends, do not come often enough. "I like Mr. Scott," one very little girl said in an essay on the Inspector's visit—the day after, "he's such a kind man and he doesn't know the right answer from the wrong one"—which meant that there was none of the "Sit down, you blockhead!" attitude, the Inspector was trying to get the very best out of the children. "We don't think of them as Inspectors now" said an old teacher in the West Highlands, "they are just like Christian Gentlemen."

We may leave it at that. Inspection is firmly established. It is on examination that the guns of the critics are being trained.

One thing is certain. Whether examinations in general are good things or bad, there are far too many of them and there is far too little give and take among different examining bodies. The number of scripts written every year by the pupils in our schools for external bodies must be simply appalling.

Each examining body tends to be jealous of its own rights and is eager to demand that homage should be paid to its own particular educational fancy. The result is disastrous. There is a most serious overlapping of effort, and some of the examinations are unsatisfactory and quite out of touch with modern developments.

It would surely be possible to secure some simplification here. Professional bodies might well reconsider their demands and throw down the artificial barriers they have set up. National certificates they might accept *simpliciter* and without the vexatious conditions they so often impose. They might trust the schools more than they do, and show greater readiness to accept the guarantee that a boy or a girl has satisfactorily completed a sound course of study in a good

its place. At the present moment each is by itself misleading and unsatisfactory but in combination they are of very considerable value, both as a test of what has been achieved and as a guide to further progress. I know, too, that the best teachers welcome both inspection and examination, if they are well conducted. But that condition is essential. The Inspector's manner must be sympathetic and his digestion good. He must be really a master of his craft, free from pedantry, devoted to his work, brimful of common sense, not without humour, eager that the rising generation should be trained to think with care and express their thoughts clearly, and that their minds should be generously furnished with everything they are capable of absorbing and assimilating.

So with the examiner. He must know his subject intimately and must not have forgotten how he learned it. He must be a teacher and a wise man as well as a scholar, for if he is not, he will fail to know the limits of the pupils' powers, and he will be unable to differentiate between the more and the less important. Many of the questions I see in old papers—and for some of them I must admit my own share of responsibility—are enough to make angels weep or saints swear.

The inspector and the examiner must each recognise his limits. A capable inspector can size up a class very rapidly and very accurately: some of those we have known have an almost uncanny faculty of this kind. But it has its limits and without some paper work is very apt to run to seed. On the other hand the mere examiner who does not see the children at work is a miserable myope, divorced from reality and destined to fossilisation.

The prestige of the Inspectorate in these islands has always stood high. I am sure, from an intimate knowledge of Scotland and from all I hear of England, that it never

The Respective Functions of Examination and Inspection

A paper read at the Imperial Education Conference held in London in June, 1927.

BY

MR. W. W. McKECHNIE,

Deputy Secretary, Scottish Education Department.

INSPECTION, I take it, means the attempt to form an impression of a school by personal visit, study of such matters as classification, curriculum, time tables, and also investigation of the premises and discussion with Managers, teachers and head teachers. Examination, on the other hand, means definite questioning of the pupils, especially by means of written tests. It will be convenient for me to limit my consideration to *external* examination. Internal examination is another question with serious problems of its own.

When I was an Inspector I was never able to get away from the idea that *some* examination of a class was desirable. Now that I have ceased to be an Inspector and am intimately concerned with the control of the examining machine, I am convinced that some inspection is essential.

It seems to me to be certain that, at the stage of educational evolution we have reached, both processes are necessary parts of adequate supervision of our educational system. I am optimistic enough to believe that examination of schools externally and on the present lines will sooner or later prove to be unnecessary. Inspection will always have

this insription was put up on a well at Elgandal in 1693. Otherwise the inscription could not have been written by the Muhtasib or Ecclesiastical censor.

Of Khafi Khan, there is an inscription on a well at Narsapur dated 1727-28. Mr. Yazdani draws our attention to the spelling Khifa in the inscription. He is said to have concealed his history during Aurangzeb's reign and Khafi is derived from Khifa which means to conceal. In the reign of Farruk Siyar (1713-19). the first Nizam of Hyderabad appointed Khafi Khan a Diwan in his service and this inscription refers to this period. He died in 1731-32.
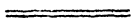
The inscription on the tomb of Abdullah Qutb Shah gives the date of his birth, November 21st, 1614, the date of his accession, February 1st, 1626, and the date of his death April 21st, 1672. There was some controversy about the date of his death. Prof: J. Sarkar placed it 3 years later, but Mr. Yazdani points out (E. I. M. 1915-16 page 40) that the question is finally settled and the date given in the inscription is correct.

For the period of Abul Hassan, there are the inscriptions on the 2 guns used by Aurangzeb during the second seige. One measures 14 ft. 10 inches in length, the diameter near the base being 2 ft. 4 inches, while at the end, the circumference is 9 ft. The second is 16 ft. 2 inches in length, the diameter near the base being 2 ft. 3½ inches, while at the end the circumference is 8 ft. 8 inches.

There are several inscriptions on the tomb of Miyan Mishk. He was a secretary of Abul Hassan, holding charge of the Royal key. He also held the high office of the Commander of the Carnatic troops. He obtained firmans from Abul Hassan in 1674 and 1677, informing the revenue officers that certain revenues should be allotted for the conduct of religious ceremonies at the mosque near his tomb. He died in April 1680. The firman is interesting as indicating the wages for the menial establishment of the mosque. The public crier was paid 10 huns per annum, the farrash 6 huns, the water carrier 6 huns, the deoti 7½ huns, the porter 12 huns, the 2 sweepers 6 huns, the clerk 8¼ huns, 2 shampooers 16 huns, the mali 12 huns, and the superintendent of the mosque 20 huns. (A hun is equivalent to 52 grains in weight of gold).

Two more inscriptions close this survey of the period 1913-14 to 1921-22. those of the two great historians of the time of Aurangzeb-Khafi Khan and Rai Brindaban. Brindaban's father was Diwan of Dara Shikoh. Brindaban held an important office in the Deccan at the time when

It was during the period of Abdullah Qutb Shah that the first seige of Golconda by the Mughals took place. A detailed account of the seige is given in an inscription on one of the bastions of the fort known as the Musa Burj. Musa Khan, "the wazir of the wazirs of the time, the confidence of the royal court, the trust of the state, the Khan, the exalted commander-in-chief," was asked to go to the spot to repel the enemy. A shot from the guns of the fort hit Miri Miran, the Mughal Commander and he died on the spot. Three days after his death, peace was concluded. Musa Khan was ordered to build a large bastion at the place which was completed in 1666. This event is described in 2 inscriptions, one in Persian and the other in Telugu. (E. I. M. 1913-14.)

Musa Khan held the office of Mahaldar (Lord Chamberlain) and is mentioned in the inscription in the Toli Musjid in the city. The mosque was completed in 1671. (E. I. M. 1917-18.)

Khairat Khan, one of the nobles of Abdullah Qutb Shah is mentioned in 2 inscriptions, dated 1640 and 1642. He built the Amber Khana or store house in the fort. He also constructed a well, a garden and some shops and is described as the "well-wisher of the state."

Neknam Khan is an accomplished general of Abdullah Qutb Shah, who was once deputed to help Bijapur against the Mughals in 1665. The inscription on the tomb gives the date of his death as 1673. It mentions the gift of the revenues of the village Angalawaram, in the division of Janwal (Hasanabad), for the proper maintenance of the tomb. The Despandes, Thalkarnis, Muqaddams, and Kulkarnis of the division were asked to observe the order. The date of the order is nearly 10 years, which is probably a mistake. If so this inscription should relate to the next reign. (E. I. M. 1915-16.)

The next monarch is Muhammad Quli Qutb Shah. He is described in an inscription in the Jami Masjid in the city of Hyderabad, as "the lord of the world, the king of kings in whose reign the virtuous received generous treatment" The mosque was completed under the superintendence of Amin-ul-mulk, who was an accomplished general and who held the distinguished office of Mir Jumla. He quelled several Hindu rebellions of the reign of Quli Qutb.

There are a few inscriptions in the pavilions of the Mai Sahiba's tank on the way from Khairatabad to Golconda, which illustrate the influence of the Tabataba Sayyids during the reign of Muhammad Quli and his successor. (E. I. M. 1917-18.)

The tomb of Quli Qutb Shah is a magnificent structure. The inscription notes the date of his death as January 11th, 1612. The title "His Exalted Majesty" is added before he name of the king. Mr. Yazdani points out that this title was adopted for Humayun and Akbar after their death in 1556 and 1605 respectively, and this imitation shows the ambition of the Qutb Shahi princes. (E. I. M. 1915-16.)

Of the next sovereign, Muhammad Qutb Shah, we have only the inscriptions in the tombs. The inscription on his tomb gives the date of his birth, April 1593, the date of his accession, January 11th, 1612 and the date of his death, February 1st, 1626. Not only does the title of "His Exalted Majesty" continue, but the title of "Her Exalted Highness" is found on the tomb of a princess of the royal family and the title "His Exalted Holiness" on that of the religious guide of the royal family. The title of Marju-Min-Nurillah (Expectant of the Light of God) is given to the Sultan in one of the inscriptions on the grave of his infant grand-son. The tomb of Hayat Baksh Begum, the consort of the Sultan, places her death in 1667. She took a prominent part in the administration, during the reign of her son Abdullah Qutb Shah. (E. I. M. 1915-16.)

Shah, the founder of the dynasty. He constructed a mosque in the fort in 1518. The suzerainty of the Bahamani king, Mahmud Shah, is still formally recognised. (E. I. M. 1913-14.)

Elgandal, 3 miles north of Karimnagar, has an inscription dated 1525 and mentions Abul Fateh entitled Mansur Khan as having constructed a mosque. (E. I. M. 1919-20.)

The inscription on the tomb of Sultan Quli gives September 2, 1543 as the date of his death. The epitaph on the tomb gives his pet name BARE MALIK or Great Prince. It calls him "the warrior for God's sake, the striver in God's path." This verifies the statements made in contemporary writings that he fought severely with the Hindus. The title martyr refers to his murder instigated by his third son Yar Quli. (E. I. M. 1915-16.)

There are no inscriptions of Jamshed Quli and Subhan Quli. There is an inscription of Ibrahim Qutb Shah dated 1559 on the Makki Darwajah in the fort. Ibrahim is referred to as "the greatest of sovereigns, the refuge of water and clay (sea and land), the opener of the gates of benevolence to all creatures ...." Mention is made of Mustafa Khan, one of the two great generals of Ibrahim. His name was Kamaluddin Hussain. He is described "as the pillar of the Empire, the prop of his kingdom, the collector of books and the disperser of armies." (E. I. M. 1913-14.)

There is an inscription at Gudur in the Nellore District, dated 1562, which mentions the second great general of Ibrahim, Rifat Khan Lori, also known as Malak Nayab. (E. I. M. 1921-22.)

The tomb Ibrahim Quli is larger in dimensions than those of his predecessors and was once beautifully decorated with tiles of different colours. The date of his death, as given in the inscription on the tomb, is June 5th, 1580.

governor of the province extending from Bijapur to Khujasta Banyad (Aurangabad). The name of this governor is associated with the construction of a new town called Ghasiuddinnagar. The Naib Faujdar, Sadr Shah Beg, Sidduji Deshmukh, Dhondaji Deshpandya, and Shimbhu Seth co-operated in the construction of this town. This record is in two languages, Persian and Mahrati. The Saka date is 1625 which is about 1703-04 A. D. Dhondaji seems to have been a very influential person. His full name is Dhondaji Kishan, as given in another inscription of 1690-91. He constructed a bastion known as Dhondapura bastion which is dated 1704 A. D.

There are 2 inscriptions of the reign of Muhammad Shah, dated 1725 and 1730. The second of these refers to the construction of the Ahmadnagar Darwaza by "the brave and exalted Rao Sultanjee Bunalkar, Jagirdar of the pargana of Bid."

Two inscriptions mention a Hindu lady from the Panjab and a man named Vittal as votaries of the Muhammadan saint Shah Kochak Wali. It may be noted that there are several Hindu votaries of Muhammadan saints even at the present day. Nagore in South India may be mentioned as a shrine that attracts persons of all communities.

There are 4 inscriptions of the Asaf Jahi period at Bid. One of them is dated 1773 A. D. and reads thus: "During the reign of Shah Alam and the governorship of Nizam-ud-daulah, Mir Nizam Ali Khan Bahadur, the building of this gateway was completed." The names of Nawab Sharfud-dowlah and Ali Muhammad Khan are mentioned as the governor of Bid and Bakshi or pay-master respectively. (E. I. M. 1921-22.)

We now come to the inscriptions of the Qutb Shahi Kings. The earliest inscription is that of Sultan Quli Qutb

Shah the first. This is in the mosque at Ashti in Bid District. (E. I. M. 1921-22.) The fort at Qandhar contains inscriptions of Murtuza Nizam Shah the first (1565-86). They record the construction of certain bastions and walls. Mention is also made of the employment of a Turkish gunner Aqa Rumi.

The fort of Antur in the Aurangabad district contains important inscriptions. Mr. Yazdani points out that Colonel Haig, in his Land-marks of the Deccan, has assigned to Murtuza Nizam Shah the second the period 1603-1630. As a matter of fact there were two kings during the period. There was bitter enmity between Malik Amber and Murtuza. Malik Amber deserted the cause of Murtuza and placed Boorhan Nizam Shah the third on the throne. The inscription refers to this ruler who was placed on the throne in 1610 and who was put to death in 1630 by Fath Khan, the son of Malik Amber. Hussain Nizam Shah, a son of Boorhan Nizam Shah, was placed on the throne and ruled till 1632.

One of the inscriptions in the fort describes Malik Amber as "the benefactor of mankind." Two miles south of Antur is an inscription dated 1592 referring to Boorhan Nizam Shah the second, who ruled from 1590-94. (E. I. M. 1919-20)

There are several inscriptions at Bid referring to the Mughal period. One is dated 1624 and mentions the name of Nawab Jansipur Khan as the governor of the Deccan. This is confirmed in the Badshahnamah. Another is dated 1636 and mentions SAF SHIKAN KHAN as the governor. An inscription dated 20th May 1661 refers to an eminent official Sardar Khan Faujdar "during the Caliphate of His Majesty Alamgir Shah (Ghazi)." Another of 1701 records the names of Bijapur, Haidarabad, Adoni, Narnala, Jinji, and Khelna as fortresses conquered by Aurangzeb and mentions the appointment of Ghaziuddin Khan Firoz Jung as

Tughlak was well established. The inscription states that Qandhar was held as a fief by Malik Saif-ud-daulah and it goes on to say "There is no part of the country which is not connected with the Royal court, either by payment of tribute or (annexed to the administrative) divisions or (bearing some other kind of) relation: or through Imperial fief holders or agents or other officials. He did not bring any country under his control, but he imposed the Jizya on the people .... Through his justice there is none in this world whose life has not been protected." On one of the bastions is an inscription of Aurangzeb's reign dated 1684 A. D. (E. I. M. 1919—20.)

There are no inscriptions published for the period between the reign of Muhammad Bin Tughlak and the establishment of the independent Musalman dynasties of the 16th century. Of these Bijapur played the most important part. The fortress of Naldrug in the Osmanabad district contains 2 inscriptions of the Adil Shahis. It was a bone of contention between Bijapur and Ahmadnagar and fell into the hands of the former between 1558-60. Ali Adil Shah made extensive additions to the fort. The marriage of Ibrahim Adil Shah with the sister of Muhammad Quli Qutb Shah took place at Naldrug in 1587. There is an inscription dated 1613 referring to the construction of a 'Bund' or dam across the river, "which has attained fame like Alexander's ramparts." (E. I M. 1917-18.)

Parenda was another Deccan fortress that was eagerly desired both by Bijapur and Ahmadnagar. There is an inscription dated 1548 which mentions the name of Khwaja Jehan as the governor appointed by Ibrahim Adil Shah of Bijapur. He surrendered the fort to Boorhan Nizam Shah of Ahmadnagar. (E. I. M. 1921-22.)

Of the Ahmadnagar dynasty the earliest inscription is dated 1521 A. D. and refers to the reign of Boorhan Nizam

Historical Research in H. E. H. the Nizam's Dominions

BY

S. HANUMANTHA RAO, M. A., L. T.,

Professor of History, Nizam College.

Moslem Epigraphy : a review of a decade's progress.

Continued from the previous issue.

N. B. E. I. M. refers to Epigraphica Indo-Moslemica.

THIS article summarises the work done by the Archaelogical Department in the field of Moslem Epigraphy. The inscriptions are referred to in the annual reports and are critically examined in the Epigraphica Indo-Moslemica. I have rearranged them in a chronological order to help the teacher who is interested in the subject.

The earliest inscription goes back to the period of Muhammad Bin Tughlak and has been discovered at Bodhan in the Nizamabad District. Bodhan was a town of great importance in the Hindu period and was one of the capitals of the Rashtrakuta kings. It contained several Hindu temples. The inscription of Muhammad Bin Tughlak is in the Dewal Musjid, which was built on the ruins of a temple. It refers to the construction of a watch tower. That the place was of some strategic importance is illustrated by later inscriptions at the same place. Aurangzeb constructed a small mosque on the site of another temple in 1655 A. D.

Qandhar is another place of strategic importance in the Nanded district where the authority of Muhammad Bin

ERRATA.

Page 64 from top 1st line "Archaelogical" read "Archaeological".
,, 73 ,, bottom 3rd ,, "enongh" read "enough".
,, 77 ,, ,, ,, ,, "carmmed" read "crammed".
,, 80 ,, top 5th ,, "odne" read "done".
,, 81 ,, bottom ,, ,, "crat" read "erat".
,, 82 ,, top 2nd ,, "important an extensive". read "important and an extensive".
,, 95 ,, ,, 15th ,, "poople" read "people".
,, 97 ,, bottom 4th ,, "modern" read "medium".
,, 98 ,, top 1st ,, "work to be done" read "work had to be done".
,, 102 ,, bottom 7th ,, "thay" read "they".
,, 107 ,, ,, 4th ,, "perfect" read "prefect".
,, 137 ,, top 2nd ,, "effiminates" read "effeminates".
,, 138 ,, bottom 12th ,, "prefect" read "perfect".
,, ,, ,, ,, 6th ,, "pratical" read "practical".
,, 147 ,, top 16th ,, "educatiou" read "education".
,, 156 ,, bottom 15th ,, "schoool" read "school".
,, 157 ,, ,, 3rd ,, "Grden" read "Garden".
,, 158 ,, top 5th ,, "of marred" read "or marred".
,, ,, ,, ,, 18th ,, "vist" read "visit".

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

Hyderabad Teacher

ADVERTISEMENT RATES.

Space	Whole year	6 months	Per issue
	Rs. A. P.	Rs. A. P.	Rs. A. P.
Full page	10 0 0	5 8 0	3 0 0
Half page	5 0 0	2 12 0	1 8 0
Quarter page ...	2 8 0	1 6 0	0 12 0
Per line	0 10 0	0 8 0	0 6 0

SUBSCRIPTION RATES.

O. S. Rs. 3 including postage for the Nizam's Dominions annually.

B. G. Rs. 3 do do British India annually.

O. S. 12 As. excluding postage for the Nizam's Dominions per single copy.

B. G. 12 As. do do British India do

Regtd. Asafia No. 47.

Vol. II.] September, 1927 A. D. / Aban, 1336 Fasli. [No. 2.

Under the Patronage of

Nawab Masood Jung Bahadur, B.A. (Oxon.),
Director of Public Instruction.

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of The Teachers' Association
Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff:

S. ALI AKBAR, M. A, (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1927.

جلد ۲ — رجسٹر شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴ — نمبر ۳
اسفندار سنہ ۱۳۳۷ ف

زیر سرپرستی عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

حلقۂ ادارت

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹیب)
جنرل اڈیٹر

سید فخر الحسن ملّا بی۔ اے۔ بی ٹی (علیگ)
اڈیٹر

عبد النور صدیقی۔ بی۔ اے۔ بی ٹی (علیگ)
جائنٹ اڈیٹر

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساسِ معلمی کو بیدار کرنا۔
(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجرباتِ معلمی کو شائع کرنا
(۳) فنِ معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔
(۴) انجمنِ اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔
(۵) انجمنِ اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا

اُصول

(ا) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا
(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔
۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۳ روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ انگریزی)
۲۔ ۱۲ر علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (لر)
(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکیگا۔
(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم و تعلم سے متعلق ہوں اور جن میں ملک کے مفادِ تعلیمی کے لحاظ سے ندرت و جدت ہو۔
(ہ) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔
(س) جملہ مضامین مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے

فہرست مضامین

جلد ۲ بابتہ ماہ اسفندار ۱۳۳۷ف م جنوری ۱۹۲۸ء نمبر (۳)

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اُصول

(ا) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور سہ ماہی یہ صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

۱۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۳ روپیہ مع محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

۲۔ 〃 〃 ۱۲ر علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (〃)

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکیگا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم و تعلم سے متعلق ہوں اور جن میں ملک کے مفاد تعلیمی کے لحاظ سے ندرت و جدت ہو۔

(ہ) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

(و) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہئے۔

فہرست مضامین

جلد ۲ بابتہ ماہ اسفندار ۱۳۳۷ف م جنوری ۱۹۲۸ء نمبر (۳)

ہندوستان کو اپریٹو انشورنس کمپنی لمیٹڈ

(صدر دفتر کلکتہ)

خالص ہندوستان بیمہ کمپنی

سرمایہ زائد از ۸۰،۰۰،۰۰۰ روپیہ جائداد کاروبار۔ بابتہ سنہ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء

زائد از ۶۰،۰۰،۰۰۰ روپیہ۔

[آخری منافع پنجسالہ (بابتہ سنہ ۱۹۲۲ء) ۷۵ روپیہ ہزار آئندہ منافع (بابتہ سنہ ۱۹۲۷ء) اس میں ایک معتد بہ رقم کی توقع کیجاتی ہے۔]

توسیع مالیات بابتہ ادائی قسط بیمہ، قرض، قیمت بازگشت اقساط اور تجدید پالیسی منقضی شدہ وغیرہ کے متعلق فیاضانہ شرائط شرح قسط بیمہ (با منافع) کافی کم رکھا گیا ہے۔ اور شرح بلا منافع سب سے کم ہے۔ لہذا "ہندوستان" میں ہی اپنی زندگی کا بیمہ کرو۔ اگر اپنی ذات اور خاندان کی کفالت سے مطمئن رہئے۔ سب ایجنسی کے لئے درخواست مطلوب ہیں۔ ماہانہ تنخواہ (۵۰ سے ۱۰۰ تک) بہترین شرائط گارنٹی شدہ کاروبار کے لئے۔

تفصیلی معلومات کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر دریافت فرمائیے۔

ایس جی نائیڈو۔ نارائن آشرم۔ (ترپ بازار حیدرآباد دکن)

نرخ اشتہارات حیدرآباد یچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	صہ/	ســے
نصف "	صہ	عاں ۱۲/	عہ/
ربع "	عاں ۸/	عہ/	۱۲/
فی سطر "	۱۰/	۸/	۶/

۱

مسئلۂ بے علمی

یہ مضمون حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس کے گزشتہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا

آپ حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ ہندوستان میں صرف (۱۲) یا (۱۳) فیصدی مرد اور (۲) فیصدی عورتیں خواندہ ہیں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں تو خواندہ اشخاص کی تعداد اس سے بھی گری ہوئی ہے یعنی مردوں میں (۷) فیصدی اور عورتوں میں بہ مشکل ایک فیصدی ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ کے اعتبار سے خواندہ سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی مادری زبان میں اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو معمولی خط لکھ سکے اور اس کا جواب پڑھ سکے۔ معزز صدر خطبۂ صدارت میں نہایت فصاحت اور بلاغت سے ہم کو اس امر کی جانب توجہ دلا چکے ہیں کہ تا وقتیکہ تعلیم عام نہ ہو جائے ہمارا ملک کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی اکثر خرابیوں یعنی توہمات اور تعصبات کمسنی کی شادی عورتوں کے حقوق کی پامالی مہمل رسوم افلاس فضول خرچی قرضداری۔ اصول حفظان صحت کی عدم پابندی ان سب اور دیگر خرابیوں کی جڑ جہالت ہے۔ اور جب تک کہ جہالت باقی ہے نہ تو معاشی اور معاشرتی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ پبلک اسپرٹ پیدا ہو سکتی ہے اس جہالت کو دور کرنے کے لئے برٹش انڈیا و نیز اکثر دیسی ریاستوں میں جا بجا پرائمری مدارس عرصہ سے قائم ہیں لیکن ان مدارس پر جس قدر روپیہ صرف ہوا ہے اور جیسی توجہ مبذول کیگئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے مطابق خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ معزز صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ ظاہر فرما چکے ہیں کہ ممالک محروسہ میں باوجود مجموعی آبادی میں بیشی ہونے اور باوجود مدارس اور طلبہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہونیکے

خواندہ ذکور کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے میری ناقص رائے میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جو مدارس تحتانیہ میں تعلیم پاکر نکلتے ہیں چند سال کے بعد زمانہ طالب علمی میں جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے۔ اس کو بھول جاتے ہیں خصوصاً دیہات میں یہ مرض بہت عام ہے۔ شہروں میں بھی لوگوں کو پڑھنے لکھنے کے مواقع حاصل ہیں۔ ہندوستان کے اکثر شہروں اور خصوصاً بڑے شہروں میں کچھ نہ کچھ علمی چہل پہل ضرور نظر آتی ہے۔ اور عمدہ مدارس اور کالجوں کے علاوہ کتب خانے بھی موجود ہیں لیکن دیہاتی زندگی کی نوعیت عموماً ایسی ہوتی ہے کہ تحتانیہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد لکھنے پڑھنے اور علمی مشاغل کے جاری رکھنے کے لئے نہ تو کوئی ایسی ترغیب تحریص ہوتی ہے اور نہ موقع ہی ملتا ہے۔ ایسے دیہات کی تعداد جہاں کوئی کتب خانہ قائم ہو۔ بہت ہی کم ہے اور علاوہ اس کے وہاں اخبارات بھی کم جایا کرتے ہیں ایسی حالت میں یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ کہ شہروں میں خواندہ مردوں کی تعداد تگنی اور خواندہ عورتوں کی تعداد چھ گنی دیہات کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی ہے۔

باوجود ابتدائی تعلیم پر اسقدر روپیہ صرف ہونیکے خواندہ اشخاص کی تعداد کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو طلبہ ابتدائی مدارس میں شریک ہوتے ہیں وہ اتنی مدت تک تعلیم نہیں پاتے کہ ان کو لکھنا پڑھنا اچھی طرح آجائے بحیثیت ایک معائنہ کنندہ عہدہ دار کے میرا یہ تجربہ ہے اور یقیناً دیگر معائنہ کنندہ عہدہ داروں کا بھی یہی تجربہ ہوگا کہ بہ نسبت دیگر جماعتوں کے جماعت صغیر کی تعداد ہمیشہ غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ان طلبہ میں سے جو جماعت صغیر میں داخل ہوتے ہیں تقریباً (۴۰) فیصدی ایسے ہوتے ہیں جو اس جماعت سے

آگے نہیں بڑھتے اور صرف (۳۵) فیصدی ایسے ہوتے ہیں جو حقیقت میں تحتانیہ کا نصاب ختم کر پاتے ہیں۔ تحتانیہ مدارس کے طلبہ میں دیر رسی اور غیر حاضری خصوصاً دیہات میں عام ہے۔ اس کی وجہ ایک حد تک یہ بھی ہے کہ ہمارا ملک آئے دن طاعون۔ وبا۔ ملیریا۔ اور دوسری بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن اکثر قصور والدین کا ہوا کرتا ہے۔ ایسے والدین کثرت سے ملیں گے جو اپنے بچوں کو محض اس وجہ سے مدرسہ بھیجتے ہیں کہ ان کو گھر پر شرارت کرنے سے باز رکھا جائے۔ جب بچے اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ گھر کا سودا سلف لانے گائے بھینس چرانے یا کھیت کے کام میں والدین کی امداد کر سکیں تو انہیں مدرسہ سے علحٰدہ کر لیا جاتا ہے۔ جو والدین مدرسہ سے اپنے بچوں کو نکال بھی نہیں لیتے تو وہ ان کی تعلیم میں مطلق دلچسپی نہیں لیتے۔ چنانچہ جب گھر میں بلکہ بعض وقت تو اڑوس پڑوس میں بھی کوئی کام کاج یا شادی بیاہ ہو تو بچہ کو کئی دن تک مدرسہ نہیں بھیجا جاتا۔

ایک تو مدت تعلیم ہی قلیل ہے اور دوسرے طلبا دیر رسی اور غیر حاضری کے عادی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے جو مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں اپنی تعلیم سے کوئی دیرپا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے ہوتے ہیں جو لکھنا پڑھنا سیکھتے ہی نہیں اور جو سیکھ بھی جاتے ہیں تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مدرسہ چھوڑنے کے ایک یا دو سال کے بعد سب کچھ بھول کر چوپٹ کر دیتے ہیں۔

پس ایسی حالت میں خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے حسب ذیل دو اصول کے تحت تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) اولاً تو ہم کو اس امر کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ جو طلبہ ابتدائی مدارس میں

داخل ہوتے ہیں وہ لکھنے پڑھنے میں پختہ ہو جائیں۔

(۲) ثانیاً اس امر کی ضرورت ہے کہ جن اشخاص نے ابتدائی تعلیم حاصل کرکے مدرسہ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے لکھنے پڑھنے اور علمی مشاغل جاری رکھنے کے لیے اسباب مہیا کئے جائیں اور کافی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔

(ا) وہ تدابیر جن کے اختیار کرنے سے ابتدائی تعلیم میں پختگی پیدا ہو سکے

(الف) جیسا کہ معزز صدر نے اپنے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا ہے سب سے زیادہ اہم اور موثر طریقہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم جبری کیجائے۔ ہندوستان میں اس تحریک میں پیش قدمی کرنے کا سہرا بڑودہ اور میسور کی ریاستوں کے سر ہے مانٹگو چیمسفورڈ کی اصلاحات کے بعد برٹش انڈیا کے اکثر صوبہ جات میں جبری تعلیم کا قانون منظور ہو چکا ہے۔ اور بعض مقامات پر اس قانون کا نفاذ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث جبری تعلیم کو ہنوز ویسی ترقی نہیں ہوئی جسکی وہ مستحق ہے۔

جبری تعلیم کی خاص اہمیت کے مدنظر اس امر کی ضرورت ہے کہ اسکو رائج کرنے میں جو موانعات پیش آئیں ان کے دور کرنے کے لیے ممکنہ کوشش کی جائے۔

ہماری ریاست میں تقریباً (۷) سال سے پرائمری تعلیم مفت دیجارہی ہے اور اُمید ہے کہ عنقریب جبری تعلیم کا بھی آغاز ہو جائیگا۔ میرے خیال میں بلدہ حیدرآباد میں ذکور کی حد تک ہمارے قابل صدر کے منصوبے کی تکمیل ہونے میں زیادہ دشواری نہیں ہے۔ کیونکہ ڈیڑھ سال قبل منجانب سررشتۂ تعلیمات قابل تعلیم ذکور اطفال کے اعداد لیے گئے تھے جس سے ظاہر ہوا کہ حدود صفائی میں ایسے بچوں کی تعداد جو (۶) اور (۱۲) سال کے درمیان ہیں (۔۔۔۔۔۴) ہے جن میں سے (۲۸۴۵۸) زیر تعلیم ہیں گویا تقریباً (۴۳) فیصدی

طلبہ حقیقت میں تعلیم پا رہے ہیں جس کے لحاظ سے لازمی تعلیم کا اثر صرف (۵۷) فیصدی لڑکوں پر پڑے گا منجانب سررشتہ تعلیمات دارالملک حیدرآباد میں جبری تعلیم کو رواج دینے کے لئے اسکیم بھی تیار کیجا چکی ہے لیکن اس کام کا بیڑہ سررشتہ اسی وقت اُٹھا سکتا ہے جبکہ پبلک اس کی اعانت کرے اور میونسپلٹی بھی دلچسپی لے۔

(ب) مگر ابتدائی تعلیم کی ترقی کے لئے محض جبری تعلیم کا طریقہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ مدارس تحتانیہ کی تعلیمی اور انتظامی حالت کی اصلاح بھی ضروری ہے خصوصاً دیہات میں عمدہ اور صحیح اُصول کی تعلیم کا مقتضا یہ ہے کہ پرائمری مدارس کی عمارتیں اچھی ہوں انکا اسٹاف موزوں ہو اور تعلیمی سامان کافی ہو۔ اس کے علاوہ اساتذہ کا ٹرینڈ یا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے گذشتہ چند سال کے عرصہ میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے مدارس تحتانیہ میں ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد میں معقول اضافہ ہوا ہے۔ اور بتدریج تعلیم میں عمدگی پیدا ہوتی جارہی ہے۔

(ج) اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ والدین مدرسہ کے کام میں دلچسپی لیں اور اساتذہ کا ہاتھ بٹائیں۔ دیہات میں صدر مدرس کو چاہیئے کہ وہ کاشتکاروں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر کے ان کو تعلیم کے فوائد سمجھائے۔ اور ان کے بچوں کی دیر حاضری اور غیر حاضری سے جو نقصان پہنچتا ہے بخوبی ذہن نشین کرائے لیکن تاوقتیکہ دیگر سررشتہ جات اور خصوصاً سررشتہ مال کے مقامی عہدہ دار جن کے رعایا عموماً زیر اثر ہوا کرتی ہے اس طرف توجہ نہ کریں نہ تو اساتذہ اور نہ عہدہ داران تعلیمات کی کوشش بارآور ہوسکتی ہیں انجمن ہائے اتحاد باہمی کو بھی چاہیئے کہ پنجاب اور برطانی ہند کے دیگر علاقوں کی انجمنوں کی طرح عوام کو تعلیم کی جانب توجہ دلائیں۔ اور کم از کم اس امر کی کوشش کریں کہ انجمنوں کے اراکین اور اُن کی اولاد تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے۔

(د) دیہات میں ابتدائی تعلیم کو رواج دینے اور مقبول بنانے کی ایک اور تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ نصاب میں زراعتی ضروریات کا لحاظ کیا جائے اسی اُصول کے مدنظر برٹش انڈیا کے بعض دیہاتی مدارس تحتانیہ میں زراعت کی عملی تعلیم دینے کی کوشش کیگئی لیکن یہ تجربہ کچھ کامیاب ثابت نہیں ہوا. حال میں جو لندن میں شہنشاہی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور جس میں شریک ہونے کی عزت سرکار عالی نے مجھے بخشی تھی اس میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہوئی کہ تعلیم پیشہ کا آغاز کس سن میں ہونا چاہیئے اور بالآخر سب نے اس اصول کو تسلیم کیا کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں کسی پیشہ کی تعلیم دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے بلکہ جب طالب علم ابتدائی تعلیم کی منزل طے کرکے اور اپنی مادری زبان میں پڑھنے اور لکھنے میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کرکے گیارہ یا بارہ سال کی عمر کو پہونچے اس وقت اس کے رحجان اور حالات کے لحاظ سے یہ طے کرنا چاہیئے کہ آیا اس کو اعلیٰ ادبی تعلیم دیجائے یا کسی پیشہ کی تعلیم دیجائے. لیکن باغبانی کو دیہات کے ابتدائی مدارس کے نصاب میں شریک کرنا اس اُصول کے منافی نہ ہوگا اگر مدرسہ کے باغ اور نصاب کے دیگر مضامین کی تعلیم میں مناسبت پیدا کی جائے اور باغ میں بچوں سے جو کچھ کام لیا جائے اس کے ذریعہ ان میں زرعی ماحول سے دلچسپی پیدا کی جائے تو اس طریقہ سے بہت کچھ فواید حاصل ہو سکتے ہیں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے اکثر مدارس تحتانیہ کے لئے کرایہ کے مکان لئے گئے ہیں جن میں باغبانی کی تعلیم کے لئے کافی زمین موجود نہیں ہوتی ہے لہذا اس امر کی ضرورت ہے کہ سرکاری عمارتیں تعمیر کیجائیں۔ اور باغبانی کے لئے بھی کافی زمین مہیا کیجائے نیچر اسٹڈی (مطالعہ قدرت) کو پرائمری مدارس اور خصوصاً دیہات کے پرائمری نصاب میں نمایاں جگہ دینا بھی نہایت مفید ہوگا۔ برٹش انڈیا کے بعض علاقوں میں اس مضمون کیجانب خاص توجہ

کیجاتی ہے۔ ہمارے مدارس میں مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن باغبانی اور
نیچر اسٹڈی ہردو کی تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ درکار ہیں جو واقف کار ہونیکے
علاوہ طلبہ میں اس کام کا شوق اور دلچسپی پیدا کرسکیں۔

(ھ) جب تک کہ کاشتکار خود جہالت کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہوں ان
سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لیں گے۔ پس
اس امر کی ضرورت ہے کہ ناخواندہ والدین کو بھی تعلیم دیجائے اور ان کے لئے
علحدہ مدرسے یا جماعتیں کھولی جائیں اور جب والدین پڑھنے کی طرف متوجہ ہونگے
تو علاوہ خود ان کی اخلاقی معاشی اور معاشرتی حالت کی اصلاح کے وہ اپنے
بچوں کی تعلیم کی ضرورت کو بھی پوری طور سے محسوس کرنے لگیں گے۔ نیز
شبینہ مدارس کے افتتاح کرنے سے خواندہ اشخاص کی تعداد میں نہایت سرعت
کے ساتھ اضافہ ہوگا۔ شبینہ مدارس کے قیام کی ضرورت کی جانب قابل صدر اپنے
خطبۂ صدارت میں ہم کو توجہ دلا چکے ہیں اور اس بحث پر میں بھی گذشتہ کانفرنس
کے موقع پر اپنے ناچیز خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار کرچکا ہوں اب ان کے
اعادہ کی ضرورت نہیں لیکن اس قدر میں ضرور عرض کرونگا کہ ہمارے تعلیمی فرائض محض
آیندہ شہریوں (سٹی زنس) تک محدود نہیں ہوسکتے بلکہ موجودہ شہریوں
(سٹی زنس) سے بھی وابستہ ہیں حیدرآباد میں اس وقت پختہ عمر اشخاص کے لئے
چار پانچ مدارس قائم ہیں لیکن ان مدارس میں طلبہ کی تعداد جیسی چاہیئے ویسی نہیں
ہے اور اس تحریک کی کامیابی کے لئے پبلک کی امداد کی سخت ضرورت ہے
اگر پبلک اس کام میں دلچسپی لے ہر گاؤں میں اور حیدرآباد کے ہر محلہ میں
ایک شبینہ مدرسہ آسانی سے قائم کیا جاسکتا ہے کیونکہ شبینہ مدارس کے لئے علحدہ عمارتوں
ورفرنیچر کی ضرورت ہے اور نہ پورے وقت کے مدرسین کی بلکہ بچوں کے لئے

جو مدارس قائم ہیں ان مدارس کی عمارتوں ہی میں شبینہ مدارس قائم کیے جا سکتے ہیں اور ان ہی کے اثاثات سے قلیل الاونس پر کام لیا جا سکتا ہے۔

(و) جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں غیر حاضری کی ایک بڑی وجہ علالت ہے لہذا اگر امراض کے دفع کرنے کی تدابیر عمل میں لائی جائیں اور اصول حفظان صحت کی پابندی کیجائے تو اس کا مدرسہ کی حاضری پر اچھا اثر پڑے گا۔ اور اساتذہ کی کوششوں کا بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔

(ز) دیہات میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ فصل کے زمانہ میں مدرسہ کی حاضری خراب رہا کرتی ہے۔ پس یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کے مدارس کو جو موسمی تعطیلات دیجاتی ہیں وہ فصل کے لحاظ سے دیجایا کریں۔

(۲) ان اشخاص کے لئے جنھوں نے محض ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ ترک کیا ہے پڑھنے لکھنے کی سہولتیں بہم پہنچانا۔

(الف) ان تدابیر میں سے ایک کا تو میں ذکر کر چکا ہوں یعنی شبینہ مدارس ظاہر ہے کہ پختہ عمر اور کاروباری اشخاص کی تعلیم کا اگر انتظام کیا جائے تو جن اشخاص کی تعلیم لڑکپن میں ناقص یا نامکمل رہی ہو ان کو پڑھنے لکھنے میں مہارت حاصل کرنے کا موقع ملیگا اور جو کچھ انہوں نے ابتدائی مدرسہ میں سیکھا ہے اس کو بھول جانے کا خطرہ باقی نہیں رہیگا۔

(ب) کتب خانہ کے افتتاح سے بھی بہت کچھ فائدہ پہونچیگا۔ بحالت موجودہ ہر گاؤں میں کتب خانہ کا قیام دشوار ہے لیکن ہر تعلقہ میں ایک سفری کتب خانہ قائم کیا جائے تو سب دیہات کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ ریاست بڑودہ میں سفری کتب خانہ کے قیام سے نہایت عمدہ نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ریاست مذکور میں (۷۰۰) سے زیادہ دیہاتی کتب خانے موجود ہیں اور سالانہ

ایک لاکھ سے زیادہ افراد ان سے استفادہ کرتے ہیں پنجاب میں بھی (۱۵۰۰) مدارس وسطانیہ میں کتب خانہ قائم کئے گئے ہیں جن سے نہ صرف طلبا بلکہ پبلک بھی استفادہ کر سکتی ہے ہماری ریاست میں سابقہ صوبجات کے مستقر پر ایک ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ ان کتب خانوں کی ترقی اور دیگر کتب خانہ جات کا قیام لوکلفنڈ کی کمیٹیوں اور پبلک کی دلچسپی پر منحصر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جہاں کہیں لائبریری قائم کی جائے۔ اس کی کامیابی کے لئے انتظام اور نگرانی کا عمدہ ہونا ضروری ہے انتخاب کتب میں احتیاط ضروری ہے اور کاشتکاروں کی ضروریات کے لحاظ سے انتخاب عمل میں لانا چاہئے۔ زبان سلیس ہو۔ اور مضامین دیہات کے باشندوں کے لئے دلچسپ اور سبق آموز ہوں ہر کتب خانہ کیساتھ ایک مطالعہ گھر (ریڈنگ روم) بھی ہونا چاہئے۔ جہاں لوگ اخبار اور رسالوں کا مطالعہ کر سکیں ہندوستان میں دیسی زبانوں میں اخبارات کی کمی نہیں ہے اور رسالوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے لیکن ان اخباروں میں دیہات کے باشندوں کی دلچسپی کے مضامین شاذ و نادر پائے جاتے ہیں جب زراعت پیشہ کے طبقہ میں اخبار بینی کا شوق عام ہو جائے گا تو یقین ہے کہ موجودہ اخباروں میں ان کی دلچسپی کا لحاظ کیا جائے گا بلکہ یہ توقع کرنا بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت ایسے اخبارات بھی نکل آئیں گے جن میں دیہات کی خبریں درج ہوا کریں گی اور ایسے رسالے بھی شایع ہونے لگیں گے جن کے ذریعہ مختلف زرعی مضامین کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جائیں گے۔ خواندہ اشخاص کی تعداد میں اضافہ کے لئے میں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کے مکمل جامع یا مبسوط ہونے کا مجھے دعوے نہیں ہے بلکہ میں نے صرف ان ہی تجاویز کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق میرے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے ہے۔ غالباً مختلف خطوں میں مقامی حالات کے لحاظ سے مختلف تدابیر کی ضرورت ہوگی لیکن تین تجاویز ایسی ہیں جن پر ہر جگہ عمل کیا جا سکتا ہے۔ یعنے جبری تعلیم۔ پختہ عمر۔ اور کاروباری اشخاص کے لئے مدارس کا افتتاح اور کتب خانوں کا قیام

(سید علی اکبر)

آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز اسوسی ایشن کی تیسری سالانہ کانفرنس

ذیل کا مضمون احمد حسین خاں صاحب بی اے پرنسپال مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم حیدرآباد دکن نے رسالہ ہذا کے حصہ انگریزی کے لئے لکھا تھا۔ کانفرنس مذکورالصدر کی تقاریر و تحریکیں طول طویل ہیں لیکن خاں صاحب کی نکتہ سنج و باریک بین نظر نے پوری روئیداد کا عرق نچوڑ لیا ہے۔ غیر انگریزی دانوں پر بڑا ظلم ہوتا اگر وہ اس لطف و استفادے سے محروم رہتے جو اس حقیقت نما اور ناقدانہ تلخیص سے حاصل ہوگا ہم اپنے لایق دوست اللہ بخش صاحب بی اے کے بیحد مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے صدر محترم کے قیمتی خیالات کا ترجمہ کرکے عین وقت پر بھیجدیا۔

اڈیٹر

آل انڈیا فیڈریشن اف ٹیچرز اسوسی ایشن کی سالانہ کانفرنس بمقام البرٹ ہال واقع کلکتہ بتاریخ ۲۹ و ۳۰ ہر ڈسمبر ۱۹۲۶ء بصدارت ڈاکٹر سی۔ وی رامن ایف آر ایس پروفیسر طبعیات کلکتہ یونیورسٹی منعقد کی گئی تقریباً پانسو نمایندے موجود تھے گو ان میں زیادہ تر تعداد صوبہ بنگال کی تھی لیکن دیگر صوبہ جات اور دیسی ریاستوں کے نمایندوں کی بھی خاصی تعداد شریک تھی۔

جی سی بوس پرنسپل بنگاباسی کالج نے بحیثیت صدر نشین مجلس استقبالیہ اپنا سپاسنامہ پڑھکر سنایا جس میں انہوں نے بیان کیا کہ مغربی طرز تعلیم سے ہندوستانیوں کی قومیت بدل گئی ہے اور ان کے اخلاق و روحانیت کو نقصان پہونچا ہے۔ یہ طرز تعلیم محض بی اے اور ایم اے کثیر تعداد میں ڈھال دیتا ہے مگر ایسے افراد نہیں پیدا کرتا جو حقیقی معنوں میں عالم محقق اور موجد کہلانے کے قابل ہوں۔ ہندوستان میں کہیں کہیں حقیقی قابلیت رکھنے والے لوگ ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ انہوں نے اسی ناقص طریقہ تعلیم کی فضا میں تربیت پائی ہے جو کمسن طبائع پر ایک بار گراں ثابت ہوکر ان کی فطری نشو و نما کو اندر ہی اندر فنا کردیتا ہے۔ مدارس ثانویہ کی

عمارتیں اور ان کا انتظام اچھا نہیں ہے وہ ایسی درسگاہیں ہیں جہاں لڑکوں کو تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کی مطلق اجازت نہیں اور اُن پر اصول و ضوابط کی پابندی کے متعلق حد سے زیادہ نگرانی کی جاتی ہے اور محض یہ مقصد پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ لڑکوں کو کامیابیٔ امتحان کے سہل الاصول طریقے بتلا دئے جائیں اس کے بعد مسٹر بوس نے ہندوستان کی تعلیمی حالت کا افسوسناک خاکہ کھینچ کر دکھلایا اور ترقیٔ تعلیم کے متعلق چند تجاویز پیش کرنے کے بعد اپنی تقریر ختم کر دی۔

صاحب موصوف نے جو تجویزیں پیش کیں وہ حسب ذیل ہیں۔

ماہرین تعلیم کو درس گاہوں پر پورا پورا اختیار دے دیا جائے تاکہ وہ خاطر خواہ انتظامات کر سکیں مدارس اور کالجوں میں ریاضت جسمانی کی تعلیم رائج کی جائے۔ ہندوستان کے جملہ فنون، علم موسیقی اور ملکی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے سوسائٹی کی خدمت اور فلاح و بہبود کی غرض سے ایسی مجلسیں قائم کی جائیں جو اساتذہ کے زیر نگرانی ہوں اور تمام درسگاہوں میں سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر آزادانہ بحث مباحثہ کی اجازت دی جائے۔ اس موخرالذکر مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے موثر پیرائے میں کہا کہ جو مدرس لڑکوں کے دل میں کسی کی جانب سے نفرت کا بیج بوئے وہ یقیناً اپنے فریضہ کے خلاف کرتا ہے لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ جھوٹا وہ بزدل اور ڈرپوک مدرس ہے جو غلط بیانی سے کام لیتا، تاریخی واقعات میں تحریف کرتا اور محض اپنے ذاتی مفاد کی غرض سے ایسی وطن پرستی کا سبق دیتا ہے جو حقیر اور ادنیٰ جذبات پر مبنی ہوتی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر رامن نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا انہوں نے اپنے ذاتی حالات سے خطبہ کی ابتدا کی اور کہا کہ جب وہ ممالک متحدۂ امریکہ کے ایک ساحلی مقام "پیاساڈینا" میں "کیالی فورنیا کے مدرسۂ صنعت و حرفت" کی سیر اور معائنہ کی غرض سے قیام پذیر تھے تو ان کو ریاست کالی فورنیا کی ایک کانفرنس میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا

جو طبقۂ فوقانیہ کے اساتذہ سے متعلق تھی۔ ریاست کے کل اساتذہ جمع تھے کیونکہ قانون ریاست کی رو سے ہر ایک مدرس پر اس کانفرنس میں جو پبلک کے صرفہ سے منعقد کیجاتی ہے اور ایک ہفتہ تک جاری رہتی ہے سال میں ایک مرتبہ شریک ہونا لازمی ہے صاحب موصوف نے ہندوستان کے مدرسین کے لئے بھی اسی قسم کے مواقع بہم پہونچائے جانے کی استدعا کی تاکہ اُن کو سال بھر میں ایک دفعہ یکجا جمع ہونے تبادلۂ خیالات کرنے اور اپنی معلومات کو وسعت دینے کا موقع حاصل ہو سکے۔ اسی سلسلہ میں بیان کیا کہ یہ ایک عام دستور ہوگیا ہے کہ سررشتۂ تعلیم کا ذکر بھی انہیں محکمہ جات میں کیا جاتا ہے جن پر قومیت کی تعمیر کا دارومدار رکھا گیا ہو لیکن مدبرین و کارفرمایان ملک اس قسم کی رائے ظاہر کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ قومیت کی تعمیر کا کام کبھی انجام کو نہیں پہونچ سکتا جب کہ تعلیم دینے والے ایسے فاقہ کش افراد ہوں جو نئی نئی معلومات کے کل موقعوں سے محروم رکھے گئے ہوں اور جن کے حق میں تعلیم کا کام ایک شقت سنگین کی حیثیت رکھتا ہو۔

تعلیم کا کام بجائے بدترین مشقت کے ایک شریف ترین پیشہ اسی وقت بن سکتا ہے جب کہ استاد اپنی خدمت و ذکاوت سے تعلیمی مباحث میں چار چاند لگا دے اور نئی نئی معلومات کے حصول میں خوشی اور دلچسپی کا اظہار کرکے دوسروں کے دلوں میں بھی اکتساب علم کے شوق اور ولولے کی آگ مشتعل کردے۔ جب تک کسی شخص کے دل میں حقیقی جوش موجزن نہ ہو دوسرے کے دل میں جوش پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اس امر کو بھی صاحب موصوف نے اپنے ایام طالب علمی کے حالات سے ثابت کر دکھلایا خصوصاً اُن اوقات سے جو تاریخ وجغرافیہ کی جماعتوں میں صرف ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد کہا کہ وہ اساتذہ جنہوں نے اپنے اضلاع سے قدم باہر نہ رکھا ہو جن کی نظر سے شاید کوئی بڑی ندی یا پہاڑ نہ گذرا ہو اور جنہوں نے شاید ہی کسی ایسے مقام کی سیر کی ہو جو اسلاف کی یادگار و سے مالا مال ہے بھلا وہ کسی چیز کا کیا احساس کر سکتے ہیں اور جن مباحث کی تعلیم دیتے ہیں ان کے متعلق دوسروں کے

دلوں میں کیا خاک شوق اور ولولہ پیدا کر سکتے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ گو ہندوستان نیچرل سائنس کے طالب علموں کی تحقیقات کے لئے فردوس بریں کے مماثل ہے تاہم علم نباتات، حیوانات اور معدنیات کی طرف سے بالکلیہ غفلت برتی جاتی ہے صاحب موصوف کی رائے میں اس جمود کے ذمہ دار وہ نصاب ہیں جو ان علوم کی تعلیم کے لئے مرتب کئے گئے ہیں اس کے بعد انہوں نے اپنے متعلقہ مباحث مثلاً ریاضیات، طبعیات اور کیمیا پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ گو ان مباحث میں کثیر التعداد گریجویٹ تعلیم پا کر نکلتے ہیں تاہم ان میں تحقیق و تجسس کا مادہ مفقود ہوتا ہے۔

انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرکے ترغیب و تحریص دلائی کہ وہ اپنے اپنے پیشے کو سچائی اور ایمانداری سے انجام دیں اور خاموش و مسلسل کوشش سے قومیت کی تعمیر کو پورا کرنے میں عجلت سے کام لیں۔ اس ترغیب و تحریص کی بحث کسی قدر طولانی تھی اور گو پیرایہ مستحسن تھا لیکن ماہرین سیاست اور کانگریس کے متعلق بلاضرورت ایسے طعن آمیز الفاظ استعمال کئے گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ صدر نشین کی نگاہوں میں ان کے کام کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ اس کانفرنس میں جو قرارداد منظور کی گئیں ان میں سے بعض اہم قرارداد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) تحریک کی جاتی ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی سینیٹ کے دستور العمل میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ اس کے انتخاب شدہ نمایندوں میں مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی تعداد کا عنصر غالب رہے۔

(۲) تحریک کی جاتی ہے کہ اس ملک کے ثانویہ اور اعلیٰ طبقہ جات کی تعلیم اور امتحانات کا ذریعہ مختلف صوبہ جات کی زبانیں قرار دی جائیں اور نیز یہ کانفرنس گورنمنٹ اور یونیورسٹیوں کو اس امر پر شد و مد سے توجہ دلاتی ہے کہ وہ سائنس اور ادب کی مسلمہ کتابوں کا غیر زبانوں سے ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کرنے کے

ادارات قائم کرنے کا انتظام کریں۔

(۳) تحریک کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے تمام کالجوں اور مدارس میں ریاضت جسمانی کی تعلیم جبری قرار دی جائے اور گورنمنٹ کو شد و مد سے توجہ دلائی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے فوجی تعلیم و تربیت کا کافی طور پر انتظام کیا جائے۔

اس تحریک کے متعلق ایک پرجوش بحث چھڑ گئی اور جب نمایندوں میں سے ایک بھاری بھرکم صاحب نے جو سرحدی لباس پہنے ہوئے تھے اس تحریک کے آخری حصے کو اس بنا پر مسترد کرنے کی تجویز پیش کی کہ وہ ایک صلح پسند شخص ہیں اور ہر قسم کی فوجی تعلیم سے تعرض رکھتے ہیں تو صورت حال کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو گیا لیکن کانفرنس نے اس تحریک کو منظور نہیں کیا اور یہ ترمیم بھی عدم تائید کی وجہ سے نظر انداز کر دی گئی۔

(۴) تحریک کی جاتی ہے کہ مدارس میں حفظان صحت کے لکچروں کا انتظام کیا جائے اور گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ وہ مدرسے کے بچوں کی رہائش اور علاج معالجہ کی غرض سے خاص خاص مرکزوں پر دواخانے قائم کرے۔

(۵) تحریک کی جاتی ہے کہ گورنمنٹ سے اس امر کی استدعا کی جائے کہ وہ اساتذہ کو سیر و سیاحت کے وظائف عطا کرنے کی منظوری صادر فرمائے

(۶) تحریک کی جاتی ہے کہ سینما کی تحقیقاتی کمیٹی میں تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کی عدم نمائندگی پر کانفرنس کی جانب سے صدائے احتجاج بلند کی جائے۔

(۷) یہ کانفرنس عمومی حیثیت سے مجلس الاقوام کی کمیٹی کی ان تمام مساعی جمیلہ کو نظر استحسان سے دیکھتی ہے جو مابین الاقوام علمی اتحاد (انٹا کچول کوآپریشن) کی نسبت کام میں لائی گئی ہیں۔

کانفرنس کے دیگر امور میں دو لکچر یعنے ایک تو مسٹر نیوگی کا لکچر ہندوستان میں تعلیم کے بحث پر جو میجک لیانٹرن کی تصاویر کے ساتھ ساتھ دیا گیا اور دوسرا وہ لکچر جو پروفیسر شسے شاوری نے "۱۹۲۷ء کے دوران میں ہندوستان کی تعلیمی ترقی" پر دیا قابل ذکر ہیں۔ پہلے لکچر میں ہندوستان کے اس طرز تعلیم کی خرابیوں کا طول وطویل ذکر کیا گیا حکومت برطانیہ کا قائم کردہ ہے۔ جس کسی نے اعتراضات کی اس لمبی چوڑی داستان کو سُنا اس سننے ضرور یہ محسوس کیا ہوگا کہ مسٹر نیوگی کے لکچر میں بہ نسبت تعلیم کے سیاست کا رنگ زیادہ جھلک رہا تھا لکچرار نے حاضرین کو اس امر کی بھی ترغیب دلائی کہ وہ اس سودہ قانون کی مخالفت کریں جو بنگال کونسل میں ابتدائی جبری تعلیم کے متعلق پیش کیا گیا ہے لیکن مسٹر شسے شاوری کا لکچر اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس میں سال زیر بحث کی اُس تعلیمی ترقی پر جو ملک کے مختلف حصوں اور دیسی ریاستوں میں رونما ہوئی ہے سنجیدہ اور اطمینان بخش بحث کی گئی۔ صاحب موصوف نے سر جارج اینڈرسن کی ان تعلیمی خدمات کا جو انہوں نے پنجاب میں انجام دی ہیں اعتراف کرتے ہوے اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ وہ اپنی خدمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور توقع ظاہر کی کہ صاحب ممدوح کے جانشین ان کے اچھے کام کو جاری رکھنے میں کوشاں رہیں گے۔ اس کے بعد صاحب موصوف نے آگرہ یونیورسٹی کے قیام کے متعلق خوشنودی کا اظہار کیا اور مجملاً علیگڈھ بنارس اور کلکتہ یونیورسٹیوں کی دوبارہ تنظیم و توسیع کا حوالہ دیا بنگال کے متعلق تقریر کرتے ہوے انہوں نے پیش رد مقرر کرکے اس خیال سے ناپسندیدگی ظاہر کی جو ابتدائی جبری تعلیم کے متعلق ظاہر کیا گیا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ذکر کرتے ہوے کہا کہ وہ ہمیشہ ان لوگوں کے ہم خیال رہے جو ملکی زبانوں کو کالجوں کی تعلیم کا ذریعہ قرار دئے جانے کی معقولیت میں شک کیا کرتے تھے لیکن حال ہی میں جب وہ حیدرآباد گئے تھے تو عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا بھی معائنہ کیا تھا اور ایک فلسفہ کے پروفیسر کو مابعد الطبعیات مسئلہ پر اردو میں لکچر دیتے ہوئے دیکھا تھا اس وقت سے ان کے

خیالات کی کایا پلٹ ہوگئی اور وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ کالج کی تعلیم میں ملکی زبانوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگے
اسی سلسلہ میں انہوں نے اس تحریک کا بھی حوالہ دیا جو اسی خصوص میں اندھرا اور بڑودہ یونیورسٹیوں میں جاری ہے
اثنائے تقریر میں ریاست ٹراونکور کی اس زبردست ترقی کا ذکر کرتے ہوئے جو تعلیم نسواں کے بارے میں ظہور پذیر
ہوئی ہے بیان کیا کہ ریاست مذکور کو تعلیم یافتہ خواتین کی کثیر تعداد کو خدمات دینے میں بڑی بڑی دقتوں کا سامنا
ہو رہا ہے اپنے تبصرہ کو ختم کرنے سے پہلے انہوں نے انٹر یونیورسٹی بورڈ کی تعریف کی اور مسٹر ایس آر داس کی اس
تجویز سے جو انہوں نے ہندوستان میں ایک پبلک اسکول قائم کرنے کے متعلق پیش کی تھی اس بنا پر ناپسندیدگی کا
اظہار کیا کہ اگر اس قسم کا مدرسہ قائم ہو جائے تو اس سے محض ایک نیا فرقہ ظہور میں آئے گا اور اپنے سے کم تر لوگوں کو
حقارت کی نظر سے دیکھنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ اسی کانفرنس کے زیر سرپرستی ایک تعلیمی نمائش کا بھی
انتظام کیا گیا تھا یہ نہایت ہی مختصر پیمانے پر قائم کی گئی تھی اس میں جغرافیائی تختوں نقشوں اور لانگ مین اور سکیلین
کمپنیوں کی دیگر مطبوعات کے علاوہ کلکتہ کے کارخانوں جات اور کپتان ٹیپو کے مدرسہ صنعت و حرفت کی مصنوعات بھی منگوا کر رکھی گئی تھیں
گو کانفرنس کی کارروائی پر عمومی حیثیت سے نظر ڈالنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کامیاب ہی جس کیلئے
منتظمین شکریہ کے مستحق ہیں لیکن چند امور میں فروگزاشت بھی ہوگئی تھی اگر نمائش اعلیٰ پیمانے پر اور ایک علیحدہ
عمارت میں قائم کی جاتی تو بہتر ہوتا نیز اگر کانفرنس کی مدت قیام صرف دو دن تک ہی محدود نہ کی جاتی تو
عملی تعلیم کی قدر و قیمت کے مباحث پر گفتگو کرنے کے لئے کافی وقت دیا جاسکتا تھا اگر یہ ممکن نہ تھا تو پھر دو ایام
میں بجائے ایک دفعہ کے روزانہ دو دفعہ صبح اور شام اجلاس منعقد کئے جاتے۔ اگرچہ کانفرنس ایسے زمانے میں
منعقد کی گئی جبکہ مدارس اور کالج بند تھے تاہم نمائندوں کے لئے چند ایسے مقامات کی سیر کا انتظام کیا جاتا جو تعلیمی
لحاظ سے دلچسپ ہیں آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ گو کانفرنس کی کارروائی اور تجاویز پیش کردہ پر تبصرہ کرتے ہوئے
کہیں کہیں ہم نے تنقیدی نظر ڈالی ہے لیکن بحیثیت مجموعی فیڈریشن کے امور سے کامل دلچسپی رکھتے ہیں۔
یہ امید کی جاتی ہے کہ منتظمین سال آئندہ کی کانفرنس کو جو بمقام پونہ ایشیاٹک ٹیچرز کی کانفرنس کے ساتھ
ہونے والی ہے کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے۔

(اللہ بخش)

جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ میسور میں

سر جگدیش چندر بوس کا خطبۂ صدارت

بنگال کے مایۂ افتخار ماہر سائنس سر جگدیش چندر بوس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ آپکی تحقیقات وانکشافات نے دنیا سے سائنس میں ہلچل ڈالدی ہے۔ اسپنسر اس بزرگ نے حکم لگا دیا تھا کہ عرق شجری کی روانی پر زہر کا اثر نہیں پڑتا۔ آپنے نہ صرف اس نظریہ کو جھٹلا دیا ہے، بلکہ لگاتار جد وجہد سے ثابت کر دیا ہے کہ پودے ہا کل گونگے اور غیر حسی مخلوق نہیں ہیں۔ انکا نظام حیات بھی حیوانی حیات کے اصول کا تابع ہے اور جانداروں کیطرح اشجار بھی، خواہ وہ کتنے ہی بے حس کیوں نہ نظر آئیں، بیرونی ہیجان سے متاثر ہوتے اور تکلیف میں پژمردگی اور راحت میں شگفتگی کا اظہار کرتے ہیں۔ آپنے یہ بھی ثابت کر کے دکھا دیا کہ حیات کی نشو ونما کیلئے مصائب کے تھپیڑے از حد ضروری ہیں۔ بعض نہایت نازک آلات کی ایجاد کا سہرا بھی آپ ہی کے سر بندھا ہے۔ آپکا برقی پروب قلب شجر کی حرکت سناتا ہے اور "مقناطیسی نامیہ نویس" نے بے زبان اشجار کو گویا کر دیا ہے اور وہ اپنی داستان بے بسی ہمکو سنانے لگے ہیں۔

کلکتہ کا مشہور ومعروف "بوس انسٹی ٹیوٹ" آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے جہاں (۱۶) سائنس دان شب وروز مسائل سائنس کی تحقیق وتفتیش میں مصروف ہیں۔

آپکی تقاریر سبق آموز اور ولولہ انگیز ہوتی ہیں۔ حال ہی میں آپنے جو عالمانہ صدارتی خطبہ جامعۂ میسور کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا اس میں گو فنی رنگ غالب ہے لیکن سلاست زبان اور حقیقت بیان کا التزام ہے۔ تعلیم وتمدن، سائنس وفلسفہ کے فروغ میں مشرق ومغرب نے جو حصہ لیا ہے اس پر آپنے نہایت بے تعصبی اور آزاد خیالی سے روشنی ڈالی ہے اور دونوں کے باہمی احسان وامتنان کا ذکر کر کے آپنے یورپ کے اس دعوی کی تردید کر دی کہ "دنیا اپنی ترقی کے لئے کسی ایک قوم کی رہین احسان ہے۔"

ایڈیٹر

جس وقت مجھے آپ کا عزت افزا نامہ کرم وصول ہوا تو مجھے ہندوستان کی ذہنی زندگی کے اتحاد اور ازمنۂ ماضیہ سے اسکی وابستگی کا از سر نو احساس ہوا۔ جلسۂ تقسیم اسناد کا صدارتی خطبہ پڑھنے کے لئے مجھے دعوت دینے کا خیال غالباً اس لئے پیدا ہوا کہ ایک تہائی صدی سے زیادہ عرصہ سے مادر وطن کی ذہنی

روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے جو کاوشین میں کر رہا ہوں اسکی قدر اور ہمدردی آپ لوگوں کے دلوں میں ہے۔ عرصہ ہوا کہ میں نے کار معلمی اختیار کیا بطور پیشہ نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ برتریں طرز زندگی ہے۔ میرے نزدیک سب سے اعلیٰ مقصد حیات یہ تھا کہ میں خام جذبات اور حوصلوں والے نوجوانوں کی رہنمائی اور حیات صحیحہ کی تحصیل میں انکی دستگیری کے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں۔ میرے سامنے اس وقت وہ نونہالان قوم بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جو زندگی کی بڑی مہم پر روانہ ہونے والے ہیں۔ کیا ہو گا تمہار النصب العین جو زمانہ ناامیدی میں تمہاری رفاقت اور ہمت افزائی کریگا؟ پیشتر کبھی ایسا پر آشوب زمانہ نہیں آیا جب قوم کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے نوجوانوں کی شہزوری اور تخیلات کی اسقدر ضرورت ہوئی ہو۔ اس لئے مجھے صرف تمہاری قوت سے سروکار ہے کمزوری سے نہیں۔ میں تمہارے سامنے وہ چیز پیش نہ کروں گا جو سہل ہے بلکہ تم کو مشکل پسندی کے لئے ہر طرح مجبور کرونگا۔ تم حق کے متلاشی ہو۔ حق جوئی کے لئے تمہیں جو ریاضتیں کرنی پڑیں گی وہ بتاؤنگا۔ اس بارہ میں تم کو ترکۂ اسلاف سے مدد ملیگی لیکن تم کو پرانی لکیر کا فقیر نہیں بلکہ بزرگوں کی عقل و دانش کا حقیقی وارث بننا چاہیئے۔

اوائل عمر میں مجھے گوناگوں سحر ساز ترغیبوں نے بوکھلا دیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان فقط اپنے رشیوں اور صوفیوں کے مابعد الطبیعیاتی نظریوں کی وجہ سے [illegible] ہے اور یہ کہ ملک کی عظمت و برتری قصہ ماضی ہے اور پھر قائم نہیں ہو سکتی۔

تم مجھ سے غالباً پوچھو کہ مجھے بہتر تعلیم کس نے دی اور کس نے ناقابل عبور دشواریوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھا؟ میرا جواب ہے کہ خود میرا کام

میرا استاد تھا، پیہم مصائب کے تھپیڑے خاطر خواہ محرک بنگئے اور ماضی کا سبق میرے لئے مستقل الہام ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ جو چیز ہماری تہذیب کا جزو لاینفک نہیں ہے وہ صحیح قومی تجدید حیات کے لئے کافی قوت ہم میں کبھی پیدا نہیں کر سکتی

درخت کو ایک راج سے تشبیہ دیجا سکتی ہے جو بے شمار جاندار افراد پر مشتمل ہے۔ اسکی مختلف ٹولیاں قومی مفاد کے لئے مختلف فرائض کی انجام دہی میں باہم و گر مصروف رہتی ہیں۔ ایسے نظام میں چھوٹے سے چھوٹا رخنہ بھی راج کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ درخت قائم رہتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں مستحکم ہیں زمین اسکی خوراک بہم پہنچاتی ہے اور خطروں کا مقابلہ کرنیکی قوت بخشتی ہے۔ باہر کے جھونکے کبھی اس پر غالب نہ ہو سکے البتہ اسکی خلقی تاب مقاومت کو بیدار کر دیا۔ شجر نے تغیر کا جواب تغیر سے دیا۔ انحطاط پذیر اور ناتواں حصہ برگ خشک بن کر جھڑ گیا اور نئے موسم نے تبدیل ہیئت کی قوتیں ابھار دیں۔ اسکی یاد ماضی بھی زبردست قوتوں کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ بیج کے اندر جرم حیات کے ہر ذرہ پر سر بفلک برگد کا نقش ثبت ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو پودے کو برداشت کی قوت دیتی ہے؟ اس طاقت کا منبع شجر کا جسم بہوم تغیر آگاہی، فوری تبدیل ہیئت اور ماضی کی موروثی یاد ہے۔ غرضکہ حیات کی شگفتگی وطن اور ماحول کا بیش بہا عطیہ ہے۔ اگر کوئی تیرہ بخت ان سے جدا کر دیا جائے اور اسکی تربیت بدیسی تخیل اور بدیسی طریقوں کی فضا میں ہو تو نتیجہ معلوم۔ موت اس کے درپے اور تباہی اس کا انجام۔

ہر بڑا کام جسے ثبات ہوگا اس کی بنیاد کا ان تمام قوتوں کی بیداری پر رکھنا ضروری ہے جو ہندوستان نے وراثت اور تربیت کے ذریعہ محفوظ رکھی ہیں۔ انکی بیداری ایک زبردست طاقت کی بند کشائی ہوگی اور عظیم الشان ہندی نشاۃ الثانیہ

پر اس کا نقش کا بجز ہوگا۔ تحریک کا اندر سے پیدا ہونا ناگزیر ہے اور اس کے آثار بڑھتے ہوئے قومی شعور میں نظر آتے ہیں۔

حیات قومی میں بلند ترین آثار ذہنی تفوق اور حدود علم کو وسعت دیکر دنیا کو بہرہ ور کرنے کی قوت ہیں جب کسی قوم میں یہ قوت معدوم ہو جاتی ہے جب وہ صرف لیتی ہے اور دینے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تب اسکی حیات صحیحہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ دست نگری کی ذلیل زندگی بسر کرنے لگتی ہے بڑی سے بڑی یونیورسٹی کی وقعت کسی مصنوعی ذریعہ سے قائم نہیں ہوتی اور نہ کوئی منشور اسکی توثیق کر سکتا ہے۔ دنیا کی نظروں میں اس کا وقار صرف اس کے طلبہ کے اجتہاد کی حقیقی قدر و قیمت سے ہو سکتا ہے۔ ہماری قومی یونیورسٹی کا سب سے پہلا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا وقار قائم ہو اور اقوام کی سبھا میں ہندوستان اپنی مناسب جگہ حاصل کرلے۔

معترضین کو انکار ہے کہ ہندوستان میں توسیع علم اور ہندوستانیوں میں اشاعت تعلیم کی صلاحیت ہے۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہاں حقیقی جمہوری اسپرٹ نہیں ہے، نیز یہ کہ مختلف فرقوں میں نہ تو حقیقی اتحاد و اتفاق ممکن ہے اور نہ ماضی و حال میں تسلسل ہے، یہ کہ یہاں متعصبانہ مذہبی اسپرٹ ہے جو ہدایت عقل کی جگہ تعمیل ارشاد پر مصر ہے، یہ کہ ہندوستانی بوجہ تفکری میلان طبع کے علوم صحیحہ کی توسیع کے ناقابل ہیں اور سائنس کے تجرباتی طریقے چونکہ مغربی ہیں اس لئے قومی کلچر کے لئے ناموزوں ہیں۔ یہ دعوے جاہلانہ اور بے بنیاد ہیں۔

قدیم ہند کے سوا مجھے کوئی دوسرا ملک نظر نہیں آتا جہاں شاہزادے اور عوام کے لڑکے مہارشیوں کی نگرانی میں سادگی اور مساوات کی زندگی بسر کرتے رہے ہوں۔ ہماری بڑی رزمیہ نظم میں ایک عظیم الشان جنگل کا ذکر ہے جو تقریباً تین ہزار

سال قبل راجہ کسٹنا پور کے دربار میں ترتیب دیا گیا تھا۔ ایک رتھ بان کے لڑکے کرن نے راجکمار ارجن کو للکارا۔ ارجن نے اس پیام جنگ کے جواب میں اہانتہً کہا ،، ایک شہزادہ ایسوں سے تیغ آزمائی نہیں کر سکتا جو خاندانی شرافت سے عاری ہیں ،، کرن نے بگڑ کر جواب دیا ،، میں اپنا آپ مورث ہوں اور میری جوانمردی میری دستاویز شرافت ہے ،، یہ ہے حقیقی جمہوری اسپرٹ جو زمانہ قدیم ہی سے ملک میں پھیلی ہوئی ہے ۔

اشاعت تعلیم میں جغرافیائی حدود کبھی مانع نہیں ہوئے۔ زمانہ ماضی میں ہندوستان کے مختلف فرقے ذہنی رشتۂ اتحاد میں منسلک تھے۔ ذہنی فتوحات کی مہم میں شنکراچاریہ کا جنوب سے گوشہ شمال تک ہر جگہ پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ بنگالہ کے ودیارتھی پریم و بھگتی کے ترنگ میں، چند تاڑ کے پتوں پر لکھے ہوئے نوشتوں کا انمول خزانہ لئے ہوئے ہمالیہ کو عبور کرتے اور ہندی علوم تبت چین اور مشرق بعید میں پھیلاتے تھے۔ ذہنی تحریکات کسی ایک صوبہ کی چار دیواری میں کبھی بند نہیں کیونکہ علم کی شمع ہر ملک میں اسکی یونیورسٹی روشن کئے رہتی تھی ، اور بڑے بڑے گروؤں کی شہرت طالبعلموں کو ہند کے دور و دراز حصوں سے کھینچ لاتی تھی۔ سلف کی روایات تلف نہیں ہوئیں کیونکہ اب بھی ہادیاں طریقت مختلف صوبوں سے نکلکر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے اور اتحاد و اخوت کی زنجیریں مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں نے تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا ہے ان کو احساس ہوگا کہ ہند کی تہذیب میں گھل مل جانے کی وہ زبردست قوت ہے جسکی وجہ سے لاتعداد نسلیں اور قومیں اس براعظم کو اپنا وطن سمجھنے لگیں۔ اور انہیں سب کی متفقہ کوششوں سے ہند عظمیٰ کی عمارت بلند ہوگئی

یہ بالکل سچ ہے کہ تبلیغ حق کی راہ میں بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ لوگ نئے واقعات اور نظریوں کو قبول کرنے میں تعصب و ہٹ دھرمی روا رکھیں۔ لیکن مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ یہ تنگ نظری مشرق کی نسبت مغرب میں زیادہ نمایاں ہے۔ یہ مشہور واقعہ

ہیں کہ گلیلیو (Galileo) سے سابقہ اقوال کی تردید بجبر کرائی گئی اور برونو (Bruno) کو جلا کر خاک کر دیا گیا۔ نارواداری کی اسپرٹ اب بھی موجود ہے چنانچہ حال ہی میں نظریۂ ڈاروں کے متعلق خوب تلخ گفتاریاں ہوئیں اور متمدن امریکہ کی ایک ریاست میں تعلیم ارتقاء تعزیری جرم قرار دیگئی۔ سائنس دانوں میں بھی ایک منکر فرقہ ہے اور یہ واقعہ قابل لحاظ ہے کہ کسی محقق کی زندگی میں اس کے انکشافات کی قدردانی شاذ ہی ہوتی ہے۔

لیکن ہم کو جھوٹی شیخی نہ بگھارنا چاہیئے کہ ہمارے آبا و اجداد ہمہ دان تھے اور نہ یہ کہ مزید ترقی ممکن ہی نہ تھی۔ جو کچھ انہیں حاصل ہوا وہ اسطرح حاصل ہوا تھا کہ انہوں نے لگاتار محنت و عرقریزی سے علم کی عمارت درجہ بدرجہ بلند کی۔ اتنا حاصل کرنے کے بعد بھی ان بزرگواروں نے فرمادیا کہ اگر وید حق پر نہ ہو تو اس کو خیرباد کہد و حق آزادی کا جو زرین تحفہ ہم کو وراثتًا ملا ہے اس سے کمتر چیز کو وقعت دینا سچی حب الوطنی نہیں ہے۔

تمام دعووں سے زیادہ عامیانہ اور غیر صحیح یہ دعویٰ ہے کہ دنیا اپنی ترقی علم کے لئے کسی خاص قوم کی رہین احسان ہے۔ دنیا میں تمام قومیں ایک دوسرے کی محتاج ہیں اور ہر زمانہ میں تفکر کی پے در پے روبنی آدم کی مشترکہ وراثت کو فروغ دیتی رہیں۔ یہ باہمی محتاجگی ہی تھی جس نے اس دیوہیکل پنجر کا شیرازہ بندھا رکھا اور تہذیب و تمدن کے تسلسل و دوام کو مصئون کر دیا۔

× × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × ×

میں نے درختوں میں اعصابی نظام دریافت کیا ہے جس کے قبول عمل کی کیفیت دیکھکر توقع ہے کہ خود ہماری نخاعی حیات کے مماثل حوادث کی بہتر تفہیم

ہو سکیگی۔ جو پودا شیشہ میں بند، ماحول کے تحریک زا حربوں سے محفوظ ہے وہ بظاہر تو شگفتہ نظر آتا ہے لیکن دراصل وہ کمزور اور کھردرا ہوتا ہے کیونکہ اسکی اعلیٰ اعصابی قوتیں نشو و نما نہیں پاتیں۔ لیکن جب یہی پودا باد و باران کے بے رحم تھپیڑوں کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے اسوقت اس کا اعصابی نظام تکمیل کو پہونچ جاتا ہے انسانی زندگی میں بھی مخملی گدے نہیں بلکہ مصائب کے تھپیڑے حقیقی کمال پر فائز کرتے ہیں۔

\+ + + + + + + + + + + + + + +

\+ + + + + + + + + + + + + + +

اب تک جو طریقۂ تعلیم مروج رہا ہے وہ دقیانوسی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی اصلاح کیجائے اور قومی استعداد اور ولولوں کو اُبھارنے کے لئے اسے آلہ کار بنایا جائے۔ جس غیر ملکی طریقۂ تعلیم سے سوائے ابدی غلامی کے اور کوئی توقعات وابستہ نہ ہوں وہ ہم قاتل ہے۔ یورپ میں ہندی طلبار کی جو حیثیت ہے وہ از حد ذلت آفرین اور کئی وجوہ سے پرخطر ہے۔ ہم آخر کیوں نہ بڑے بڑے علمی مرکز کی بنا ڈالیں؟ یہی خیال تھا جس نے دس سال قبل مجھے قیام انسٹی ٹیوٹ کیلئے اُبھارا مجھے اُمید ہے کہ اس تعلیم گاہ میں میں اُن روایات کو دوبارہ زندہ کرسکونگا جن کی کشش سے (۲۵) صدی قبل اکناف دنیا کے طلبہ نلندہ اور ٹکسیلہ کے قدیم دارالعلوم میں جمع ہوتے تھے۔ روز افزوں بیکاری اور معاشی کشمکش نے دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی اضطراب و بےچینی کی لہر دوڑا دی ہے۔

تہی مائگی قوموں کو ناامیدی کا شکار بناتی اور تہذیب و ترقی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ ہمارا وطن اپنی دولت اور صنعتی ترقیوں کے

امکان کے باوجود اس ناگفتہ بہ حالت میں ہے بے بنیاد غلط بیانیوں نے کہ ہندوستان موجدین اور محققین پیدا کرنے کے ناقابل ہے، تمام اجتہادی قوتوں کو ماؤف کر دیا ہے۔ ان دروغ بافیوں کی اب پوری تردید ہو گئی ہے۔

اثنائے سفر یورپ میں، میں نے ناروے اور سویڈن کے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں افلاس و نکبت کے کوئی آثار نہ دیکھے حالانکہ ان دونوں ملکوں میں دولت کے قدرتی ذرائع وافر نہیں ہیں۔ بایں ہمہ ان کا اپنا طریقۂ تعلیم ہے اور جدید طرز کی یونیورسٹی ہے۔ یہ سب سائنس کا کرشمہ ہے، سائنس کی مدد سے ملک کے تمام ممکنہ ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ کیا یہ سبق ہمارے لئے شمع ہدایت نہیں ہے؟ نوجوانوں کی کثیر تعداد موجود ہے، انکو ایسی تعلیم گاہوں میں تعلیم دیجا سکتی ہے جو بہترین اصول پر چلائی جائیں اور جن کا معیار دنیا کی یونیورسٹیوں کا مقابلہ کرے۔ ہماری کوشش یہ بھی ہونا چاہیئے کہ ہم اعلیٰ تعلیم کے لئے ممالک خارجہ کے دست نگر نہ رہیں۔

ایک عجیب ناتوانی اور مجہولیت حیات قومی پر چھا گئی ہے اور اگر اس خرابی کو دور کرنے کے لئے فوری تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو بربادی یقینی ہے۔ فطرت ناتوانوں اور اپاہجوں پر رحم نہیں کرتی۔ گردش دہر کی حقیقت یہ ہے کہ کاہل قوت لایموت پیدا کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس سے اندفاع مرض اور کام کرنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات انسانی، فاقہ کشی اور موت کا پلہ جھک جاتا ہے۔ اہل مغرب کا زاویہ نگاہ جداگانہ ہے ان لوگوں نے قومی مصائب کی شر باریوں میں بھی اپنی اسپرٹ اور مستعدی برقرار رکھی اور اب محنت و جفاکشی سے قومی خوشحالی کی بنا استوار کر رہے ہیں۔ کیا میں کہوں کہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ حکومت اشاعت تعلیم اور فلاح عامہ کی ترقی میں ان تھک دلچسپی لیتی ہے؟

مثال کے طور پر میں اپنے تجربہ میں آیا ہوا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ میرے کئی شاگرد سائنس کی تعلیم کے لئے خاص طور پر موزوں تھے لیکن چونکہ ان کیلئے تمام معاشی راہیں بند تھیں اس لئے چار و ناچار پیشہ قانون اختیار کرنا پڑا سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے قصداً آنکھیں بند کر لی ہیں، ہر شخص کو احساس ہو سکتا ہے کہ جس ملک میں ذہن کے پھیلاؤ کے لئے صرف عدالت کی کٹھن اور غیر یقینی شاہراہ ہے اس کی تباہی دور نہیں ہے۔

اس تصویر کا دوسرا رخ میں نے جاپان میں دیکھا۔ وہاں کی حکومت اپنے ہونہار طلبہ کی رفتار ترقی کا بغور مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ اور ان کو عروج ملک کیلئے بیش بہا اثاثہ سمجھتی ہے۔ پایۂ تخت میں ان سے ذاتی واقفیت پیدا کیجاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں قونصلوں کی معرفت انکی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے دو سال کے عرصہ میں ممتاز خصوصیوں سے فیض پا کر وہ اپنے اپنے فن میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ واپسی پر ان کو کوچہ گردی کی مصیبت نہیں پیش آتی۔ حکومت پہلے ہی سے بندوبست کرتی ہے کہ انکی قابلیت اور تعلیم ملک کی خدمت میں پوری پوری صرف ہو۔

بنی آدم کے فائدہ کے لئے علم کی توسیع و تصرف یونیورسٹی کا اہم فریضہ ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم مختلف نسلوں اور قوموں کے تفکرات اور تخیلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ انسان کی عارضی گمراہی سے بد دل ہونے کے بجائے ہمیں اسکی اُولوالعزمیوں سے سبق لینا چاہیئے۔ الگ تھلگ رہنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا صرف عملی جد و جہد سے ہم قوم کی خاطر خواہ خدمت کر سکتے ہیں۔

جن لڑکوں اور لڑکیوں سے میں آج روشناس ہوا ہوں ان کو میرا پیام کیا ہے؟ میں تم سے اصرار کرتا ہوں کہ تم ایسے زمانہ میں پیدا ہونے کی عزت جلیلہ کو محسوس کرو جبکہ تمہارے وطن کو تمہاری از حد ضرورت ہے۔ جو تہذیب ہم نے

ترکہ میں باقی ہے وہ صدیوں سے قائم ہے۔ تم اپنی ناتوانی اور مجہولیت سے یقیناً اسے برباد نہ ہونے دوگے۔ تم اس آواز کو لبیک کہوگے جو قرنوں پہلے سے گونج رہی ہے اس آواز کو جو ہر مرد و عورت کو مجبور کرتی ہے کہ انسانی مصائب کو ہلکا کرنے کے لئے لازوال جد وجہد کی زندگی اختیار کرے۔ جب تک کہ دوسروں کو سکھ نہ ہو ہم میں سے کسی کو آرام میسر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں تم کو فلسفہ قوت کی تلقین کرتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ لامتناہی تغیرات کی کشاکش میں ثابت قدم رہنے کی قوت اس زبردست تہذیب کی خمیر میں ہے جس کے سامنے مصر، اشور اور بابل کے ذہنی کارنامے ماند پڑ گئے اور جو ماضی کی طرح آج مستقبل پر بھی فاتحانہ اطمینان سے نظریں جمائے ہوئے ہے۔

(سید مظہر الحسن)

جامعۂ اندھرا کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد

اندھرا یونیورسٹی کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد بصدارت ہز اکسلنسی لارڈ گوشن گورنر مدراس بجواڑہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں پروفیسر رادھا کرشنن ایم اے نے جو پر مغز فاضلانہ تقریر فرمائی اس کا اقتباس ہدیہ ناظرین ہے۔

اڈیٹر

لفظ یونیورسٹی کا مفہوم یہ لفظ ہندوستان میں نووارد ہے۔ لیکن مدتوں سے اس کے مفہوم سے ہم آشنا ہیں شمالی مغربی ہند میں گندھارا (قندھار) کی دارالسلطنت ٹکشاسلا کو (جو علم القواعد کے ماہر پننی کا وطن تھا) آج سے چوبیس صدی پہلے سارے ہندوستان کے تشنگان علم کھنچکر جاتے تھے۔ نلندا و کرامسیلا ہاراینگو تا بنارس اور نودویا تعلیم و تربیت کے

مرکز تھے، جہاں نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرقی ایشیا کے دور دراز حصوں کے طلبہ بھی جمع رہتے تھے "یونیورسٹی" یعنی متعلمین اور معلمین کی جماعت ایک طرح کی اجتماعی زندگی بسر کرتی تھی۔ ملک کے دماغ "ضمیر" اور خیالات کو بلند کرنا ان کا فریضہ تھا۔ انکی بدولت گویا ایک جامعی دنیا پیدا ہو گئی تھی۔ مسائل تعلیم و تربیت میں ہم خیالی اور بنیادی مقاصد خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ دور حاضرہ کی بدلی ہوئی فضا میں جامعات ہی کو دنیائے خیالات و تخیلات میں خضر راہ بنا چاہیئے۔ ہندوستان میں آجکل مذاہب اور فرقوں کی جو خانہ جنگیاں ہو رہی ہیں ان کے مدنظر جامعی اسپرٹ کی ہم کو کبھی اسقدر ضرورت نہ تھی جتنی کہ اب ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ پرانی وضع کے شاستری و پنڈت مولوی و مولانا مبلغ و پادری موجودہ حالت میں مدد نہیں کر سکتے ان کے خیال میں "مذہب" علماء و واعظین ہی کے لئے ہے، عوام کو خود غور و نظر کا حق نہیں، عوام کا فریضہ ہے کہ ان کے حقوق کا احترام کرتے رہیں اور ان کے احکام کی تعمیل کریں اور ان کے ہم رنگ ہو جائیں۔ مگر ایسی ہمرنگی تہرمانوں کا خواب رہی ہے، خواہ وہ مذہبی قہرمان ہوں یا سیاسی لیکن جامعہ کا نصب العین اس کے برخلاف ذہن کی حرّیت اور خیالات کی آزادی کو وسعت دینا ہے۔ اس کو حفاظت حق یا ہمرنگی کی پکار سے کوئی واسطہ نہیں۔ جامعہ کا فرض ہے کہ مذہبی جنون اور فرقہ واری تعصب کو دور کرے اور زمانہ کے مذاق اور روش کو نئے قالب میں ڈھالے۔

نوع انسان کی دوامی کشمکش انسان کی اجتماعی زندگی دو متضاد جذبات کی کشاکش کا نام ہے۔ ایک جذبہ تحفظ یا قدامت پسندی ہے جس کی تحریک سے انسان اپنے اعتقادات کی عنق سے نگہداشت کرتا اور اسکی پناہ میں متحصن ہو جاتا ہے۔ دوسرا شگفتگی حیات کا جذبہ ہے۔ جو حد بندیوں کو توڑنے کی مسلسل کوشش کرتا ہے۔ حیات قومی کا یہ مد و جذر یکے بعد دیگرے ظہور

میں آتا ہے۔ زمانہ موجودہ وہ وقت ہے جبکہ گلوگرفتگی ہر جگہ محسوس ہو رہی ہے اور پرانی جکڑبندیوں سے آزاد ہونے اور زاویۂ نگاہ وسیع کرنے کی ضرورت عام ہو رہی ہے۔

ہندوستانی احیاءِ علوم کی تحریک میں اگر جامعہ اندھرہ کو حصہ لینا ہے تو اوس کو چاہیئے کہ طلبہ کے دلوں میں ہماری تہذیب کے سرچشموں اس کے فنون وتفکر، زبان و ادب، فلسفہ و مذہب سے ذوق پیدا کرے۔ جن لوگوں نے قدیم کتابوں کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ ان میں عجیب قسم کی برتری اور نئی معنی خیزیوں کی صلاحیت ہے۔ اور آجکل کی زندگی کے پہلوؤں کو جانچنے کے لئے وہ سچی کسوٹی ہیں۔

مگر ہندوستانی علم و ادب سے ذوق پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم حالات ماضیہ کی طرف رجعت قہقری کریں۔ البتہ صحیح اصول پر ماضی کا مطالعہ کیا جائے تو ہم کو موجودہ زمانہ میں ترقی کرنے میں آسانی پیدا ہو جائیگی۔

ملکی اعتقادات و ادارات | ملک کے عقائد و ادارات کا موشگاف اور ناقدانہ مطالعہ ترقی کا زبردست وسیلہ ہے۔ تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں نہ صرف ہماری ظاہری شکل وصورت نظر آتی ہے۔ بلکہ ہماری باطنی حقیقت بھی اصلی رنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری طاقت اور ہماری کمزوری کن چیزوں میں ہے۔ اور ہمارے امراض کیا ہیں اور ہم آج کیوں نیم مردہ ہیں؟ اگر ہمیں تاب و توانائی دوبارہ حاصل کرنا ہے تو ہمیں اپنی قومی خامیوں کی اصلاح کرنا چاہیئے۔ ہم کو تحقیق کرنا چاہیئے کہ کون سے ادارے قدیم الایام اور ترک کرنے کے لائق ہیں۔

قدامت پسندوں کو ایسی اصلاحیں ناگوار گزرینگی۔ مگر پرانے سانچے خواہ

کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں اگر زنگ آلود و ناکارہ ہو گئے ہیں تو انہیں توڑ دینا ہی بہتر ہے۔ ضرر رساں بدعتوں کو باقی رکھنا بھی قدامت پسندی نہیں بلکہ جھوٹی جذبہ پرستی ہے۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو۔ مگر ہم کو راہ حق سے منہ نہ موڑنا چاہئے تغیر کے نام سے کان پر ہاتھ دھرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ خود ہمارا فلسفہ سکھاتا ہے کہ دوام فقط ذات ابدی کو حاصل ہے اور لا انتہا تغیر لازمۂ حیات ہے۔ انتہا پسند ماضی کو خیرباد کہنے کے لئے آمادہ تو ہیں مگر اس لئے کہ انکی نظر میں یادِ سلف مایۂ افتخار نہیں بلکہ باعث ننگ و عار ہے۔ وہ بھولے ہوئے ہیں کہ دوسروں کی تہذیب زیادہ سے زیادہ ہماری رہنمائی کر سکتی ہے مگر اسباب عمل کا مہیا کرنا صرف ہماری تہذیب کا کام ہے۔ پانچ ہزار برس قبل سے آج تک ہندوستانی تہذیب کی لچک اور نئی ضرورتوں کی سربراہی کی قابلیت اسکی مستقل خصوصیت رہی ہے اگر ہم اس اسپرٹ کو قائم رکھیں تو ہم روز افزوں اعتماد و قوت سے مستقبل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

انگریزی زبان، سائنس اور زرعی و اقتصادی سرگرمیوں کی اہمیت

اگرچہ تلنگی پر بڑی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔ اور ممکن ہوا تو اسکو ذریعۂ تحصیل علوم طلیسانی درجوں تک بنا دیا جائے گا۔ مگر یہ یاد رہے کہ انگریزی زبان نہ صرف بین الاقوامی تجارت و تفکر کی زبان ہے۔ بلکہ ہندی قومیت کی استواری کے بڑے عناصر میں سے ایک ہے۔ اگر انگریزی کے نصاب کا کافی اعلیٰ معیار نہ ہوگا تو پھر طلبا کو نوکری ملنی دشوار ہو جائیگی۔

یہ عہد سخت جد و جہد اور تخلیقی سرگرمی کا عہد ہے۔ جہاں روحانی ترقی کیلئے ادبیات کی ضرورت ہے وہاں نوع انسان کے بیرونی نظام کی تعمیر کے لئے نظری و عملی سائنسوں کی بھی سخت احتیاج ہے اور مجھے توقع ہے کہ تعلیمی کونسل

کم از کم میٹرک میں سائنس کی لازمی تعلیم کا انتظام کرے گی یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ ہماری ذہنیت ابعد الطبیعاتی ہے اور ہم تحصیل سائنس سے ذوق نہیں رکھتے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں ہم نے نجوم و معماری۔ حساب، طب، کیمیا و صیقل سازی کو ترقی دی۔ آخر آخر میں مدرسیت کے حیات کش اثرات نے سائنس کی سرگرمیاں موقوف کر دیں لیکن آثار بتاتے ہیں کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ اسکولوں کا کام ظاہر کرتا ہے کہ اگر ہمیں موقع ملے تو ہم تحقیق و تفتیش کے اہل ہیں۔

قومی فارغ البالی کا اوسط بہت گرا ہوا ہے۔ متوسط طبقہ کی بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے صنعتی حلقے جہاں نئی پود بسم اللہ کرتی ہے، اور تجارتی سرگرمیاں جن میں دوسرے ملکوں کے تعلیم یافتہ نوجوان مصروف کار ہوتے ہیں، ہندوستان میں عنقا ہیں۔ پانچ سے بیس سال کی عمر تک مادر وطن کے جگر گوشے مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں اور زائد محنت اور رقم صرف کرنے کے بعد انہیں راہ بستہ پیشوں اور بے کاری سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ زمین اور اس کے خزانے وافر ہیں اور دولت پیدا کر سکنے کے قابل ابنائے وطن کی کثیر تعداد موجود ہے لیکن بے کار پڑی ہے۔ یہ دعویٰ مہمل ہے کہ ہندوستانی صنعتی پیشے اختیار کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ہندوستانی ذہنیت میں کوئی نقص نہیں معلوم ہوتا صنعتی انقلاب کے پہلے ہندوستان و یورپ میں حالات یکساں تھے۔ ہمارے زرعی طریقے اقتصادی ادارے صنعتی ترقیاں اور کاشتکاروں اور زمینداروں کے باہمی تعلقات ایک ہی اصول کے تابع تھے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ہماری زرعی اور صنعتی حالت جو قرون وسطیٰ میں تھی وہی اب ہے۔ بعض پیشوں کو باعزت اور بعض کو

ذلیل سمجھنے کا سبب یہ ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم میں ادبیات کا حصہ زیادہ ہے۔ حالانکہ ہاتھ میں قلم لینا اور حساب کتاب کرنا کارخانہ یا کھیت میں کام کرنے سے زیادہ باوقعت نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ تم میں سے ہر ایک اس دن کا خواب دیکھ رہا ہے جبکہ ہندوستان کو خود اختیاری حکومت حاصل ہوگی مگر مجھے شک ہے کہ تم اس خواہش کی تکمیل کے شرائط سے واقف ہو۔ ہمارے سرگروہ سمجھتے ہیں کہ طرز حکومت کی تبدیلی سے ساری خرابیاں دور ہو جائینگی لیکن سوراج فقط طرز حکومت یا مرکز اقتدار کی تبدیلی کا نام نہیں ہے بلکہ عامۃ الناس کی عادات ذہنیہ کی تبدیل ہیئت کا مراوف ہے۔ طرز حکومت پر نکتہ چینی کو بیجا اہمیت حاصل ہے مگر اس کے سدھارنے کے لئے جن اخلاقی قوتوں کی ضرورت ہے ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بدقسمتی سے جو حضرات سیاسیات میں نئے انداز کار کے سرگرم حامی ہیں وہ معاشرتی روش حیات و عادات میں پرانی وضع کے پابند ہیں لیکن یاد رہے کہ کسی قسم کا سیاسی یا صنعتی فروغ اوس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اجتماعی حیات و اخوت کو ترقی نہ دیں۔

(حافظ علی صدیقی)

انجمن اساتذہ بلدہ

جلسۂ خیر مقدم

مولوی سید محمد حسین صاحب بی۔ اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات اور
مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔ اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ و میر مجلس

انجمن اساتذہ بلدہ کے استقبال و خیر مقدم کے لئے انجمن اساتذہ کا جلسہ بتاریخ ۲۰ وی ۱۳۳۶ف م ۲۵ ہر نومبر ۱۹۲۶ء سیتھو ڈسٹ ہائی اسکول کے اسمبلی ہال میں منعقد ہوا۔ مسٹر مار ماڈیوک ہتمام مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادر گھاٹ کے صدر اور اس انجمن کے نائب صدر نے جو اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے، اس اجلاس کی غرض و غایت بیان فرمائی اور دوران تقریر میں انجمن اساتذہ کی جانب سے ان ہر دو صاحبین کے مفید و کامیاب سفر انگلستان و یورپ کی واپسی پر مبارکباد دیتے ہوے امید ظاہر کی کہ محکمہ تعلیمات کو ان دونوں عہدہ داروں کے بیرونی تجربات سے فائدہ حاصل ہوگا۔ مولوی حسام الدین صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ نے اردو میں تقریر کی اور بتلایا کہ رسالہ "حیدرآباد ٹیچر" میں شہنشاہی کانفرنس کی روئداد اور وہ تقاریر جو مولوی سید محمد حسین صاحب اور مولوی سید علی اکبر صاحب نے اس کانفرنس میں کیں چھپ چکی ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں نے کس عمدگی سے ریاست حیدرآباد کی نیابت کی۔

مولوی سید محمد حسین صاحب کی تقریر شہنشاہی تعلیمی کانفرنس

مولوی سید محمد حسین صاحب نے اراکین انجمن اساتذہ کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے صاحب موصوف اور مولوی سید علی اکبر صاحب کی ان خدمات کا جو انھوں نے شہنشاہی تعلیمی کانفرنس میں انجام دیں بہ نظر استحسان دیکھا اور فرمایا کہ اس قدر دانی نے ان کی ہمتوں کو بڑھا دیا ہے۔

صاحب محترم نے امید دلائی کہ آپ ڈنمارک کے طرز تعلیم پر کسی اور موقع پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت تو آپ کو شہنشاہی تعلیمی کانفرنس کے اہم واقعات کا اجمالی ذکر کرنا ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اجلاس کانفرنس میں برطانیہ عظمیٰ کے مختلف حصوں سے مختلف اقوام اور مختلف تمدنوں کے نمایندے موجود تھے لیکن حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ سبھوں کے تعلیمی مسائل اور تعلیمی دقتوں کا سوال بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ ثانیاً یہ کہ برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں کے نمایندوں سے تبادلۂ خیالات کرنے سے ہندوستان کے نمایندوں کو ان تجاویز کا علم ہوا جن کو وہ ممالک اپنے اپنے نظام تعلیم کو موجودہ اقتصادی اور اجتماعی حالات کے مطابق کرنے کے لئے اختیار کر رہے ہیں تیسرے یہ کہ ہمیں موقع ملا کہ ہم اپنی ریاست کی تعلیمی حالت پر بخوبی روشنی ڈالیں اور اس نمایاں تعلیمی ترقی کا ذکر کریں جو اس عہد عثمانی کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ضمناً ہمیں اسبات کا بھی موقع ملا کہ ان تمام غلط فہمیوں کو جو دیگر ناظرین کے دلوں میں جامعہ عثمانیہ کی نسبت پیدا ہوگئی ہیں صاف کردیں۔ حیدرآباد کے ماسوا اور پانچ ریاستوں میسور ٹراونکور کوچین پٹیالہ اور جیپور کے نمایندے بھی موجود تھے آخر میں صاحب موصوف نے کارپردازان کانفرنس کی کریمانہ مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا و نیز ڈچز آف ایتھال صدر اجلاس کانفرنس نے جس تدبیر اور قابلیت سے اپنی خدمات انجام دیں اس کی تعریف و ستایش کی۔ آپ نے اس موقع پر سرکار عالی کا بھی اس لئے شکریہ ادا کیا کہ انہیں اور مولوی سید علی اکبر صاحب کو اس کانفرنس کی شرکت کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔

مولوی سید علی اکبر صاحب کی تقریر تعلیم کے موجودہ رجحانات اس کے بعد مولوی سید علی اکبر صاحب نے جلسہ سے مخاطبت کی اور مولوی سید محمد حسین صاحب نے جو شکریہ ادا کیا تھا اس کی تائید کی اور شہنشاہی تعلیمی کانفرنس کی مشورتی انجمن کا بھی

رجحان معلوم کیا جاتا ہے

قبل مدرسہ یا کنڈرگارٹن کی تعلیم | جس طرح کہ چند سال پہلے جرمنی میں قبل مدرسہ یا کنڈرگارٹن یعنے چھ سال سے کم عمر کے بچوں کی تعلیم ہر دلعزیز ہو چلی تھی اس طرح سے آج کل انگلستان میں بھی اس طرز تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ جرمنی میں سب سے مشہور مدرسہ کنڈرگارٹن پسٹولوزی فروبل ہاوس ہے اس مدرسہ سے متعلق ایک مدرسہ تعلیم المعلمات بھی ہے۔ اور بچوں کی نگرانی کنڈرگارٹن کی معلمات کے علاوہ اس تعلیم المعلمات کی طالبات بھی کیا کرتی ہیں بچوں کی صحت کی جانب خاص توجہ کی جاتی ہے۔ انہیں روزانہ نہلایا جاتا ہے اور ہر پندرھویں روز ان کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے۔ معائنہ مدرسہ کے اثنا میں میں نے صدر معلمہ سے پوچھا کہ آلات تعلیم جو بچے استعمال کرتے ہیں کہاں تیار ہوتے ہیں مجھ کو صدر معلمہ کا یہ جواب سن کر کہ ہم خود تیار کرتے ہیں سخت حیرت ہوئی میں نے مس میاک میلین نرسری اسکول کا بھی معائنہ کیا جو لندن کے ایسٹ اینڈ میں ایسے بچوں کے لئے قائم کیا گیا ہے جن کی مائیں دن میں مزدوری کے لئے چلی جاتی ہیں۔ مدرسہ مذکور ماؤں کے ساتھ قریبی اتحاد عمل پر چل رہا ہے۔ مائیں صبح میں اپنے کاروبار پر جاتے وقت بچوں کو مدرسہ میں چھوڑ جاتی اور شام میں گھر واپس ہوتے ہوئے لے جاتی ہیں۔ بچے روزانہ صبح میں نہلائے جاتے ہیں اور دن میں انہیں تین مرتبہ کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ان کھانوں کے وقت بچے ہی باری باری سے دسترخوان کا اہتمام کیا کرتے ہیں مدرسہ کے باغچہ میں اس مدرسہ کا کام حتی الوسع کھلی ہوا میں ہوتا ہے۔ اسی نرسری اسکول کے پہلو میں نرسری اسکول کی معلمات کے لئے ایک تربیتی مرکز بھی قائم ہے۔ اور طالبات زیر تعلیم بچوں کے کام کھیل اور کھانوں کی نگرانی میں نرسری اسکول کے عملہ کا ہاتھ بٹاتی ہیں مدرسہ سے ملحق ایک چھوٹا سا دواخانہ ہے اور ہر پندرھویں روز سارے بچوں کا طبی معائنہ بھی کیا جاتا ہے۔

معائنہ مدارس | انگلستان میں معائنہ مدارس کا طریقہ اس طریقہ سے بالکل جدا ہے جس کے ہم ہندوستان میں عادی ہوگئے ہیں۔ انگلستان میں انسپکٹر کو وہ معلم جن کے کاموں کا وہ معائنہ کرتا ہے ایک دوست رہبر اور مستشار تصور کرتے ہیں ہندوستان میں ایسے طریقوں کا اختیار کرنا کسی قدر مشکل ہے کیونکہ یہاں کے حالات مختلف ہیں۔

رودادِ رسالۂ آشا خہائے انجمن اساتذہ بلدیہ

شاخ رزیڈنسی مڈل اسکول شاخ رزیڈنسی مڈل اسکول میں کل چھ جلسے ہوئے تعلیمی سیر و سیاحت کے متعلق باتفاق آرا قرار پایا کہ پرائمری مدارس کی تعلیم جغرافیہ کے لئے اطراف و اکناف کی سیر و سیاحت بے حد ضروری ہے۔ طریقۂ سوالات پر برہان الدین صاحب نے نہایت پُراثر و مفید خیالات کا اظہار کیا، اور نمونہ کا سبق دے کر سوالات کی اہمیت ثابت کردی "کتب خانہ مدرسہ" کے عنوان پر چندر دوار کر صاحب صدر مدرس و معتمد مقامی کی تقریر نہایت دلکش و حق نما تھی۔ بلاک بورڈ کے استعمال پر نارنگی کا سبق بہت کامیاب رہا۔ کنڈر گارٹن کا دن غیر معمولی طور پر سنسنی خیز تھا۔ خیالات کی وگرد اور تقاریر کی جھنکار سے مدرسہ کا ہال گونج رہا تھا۔ احمد الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کاچی گوڑہ نے اپنی نہایت سلجھی ہوئی تقریر میں تمام اعتراضات اور جھگڑوں کا تصفیہ چکا دیا اور اساتذہ کو مشورہ دیا کہ کنڈر گارٹن کے نام یا ظاہری ٹیم ٹام کی پروا نہ کریں بلکہ فروبل کے اصول اور نفس کنڈرگارٹن کو مد نظر رکھکر معمولی مٹی، کاغذ اور لکڑی کی اشیاء سے کام لیں۔ نمونہ کے اسباق کی تیاری میں برہان الدین صاحب مددگار۔ مدرسہ بازار رزیڈنسی کی دلچسپی

طبی معائنہ مدارس یورپ میں جسمانی تعلیم کے ساتھ ساتھ تحتانیہ مدارس کے معائنہ طبی کا بھی خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ انگلستان اور جرمنی میں علاوہ مدارس تحتانیہ کے مدارس ثانویہ میں بھی معائنہ طبی کا انتظام ہے۔ اور ایسے طلبار جن میں جسمانی یا دماغی کمزوریاں پائی جاتی ہیں ان کی تعلیم کے لئے خاص خاص مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ ہر دو ممالک میں معائنہ طبی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبار کے والدین مدرسہ کے طبیب کے ساتھ قریبی اتحاد عمل رکھتے ہیں۔

والدین طلبار کا اتحاد عمل طلبار کے والدین مدارس کے کام میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ برلن کے ایک تحتانیہ مدرسہ کے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات میں مجھے شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ میں نے دیکھا کہ کثیر التعداد طلبہ کے والدین اس جلسہ میں موجود تھے۔ اور یہ منظر نہایت ہی دلچسپ تھا کہ ہر وہ طالب علم جو انعام حاصل کرتا پہلے اپنے والدین کے آگے جاتا تھا کہ وہ اس کا بوسہ لیں اور دعا دیں۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اساتذہ ہر طالب علم کے والدین سے بخوبی واقف ہیں جرمنی میں طلبار کے والدین کی انجمنیں قائم ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اساتذہ اور اولیار طلبار کے مابین تعلقات بڑھائے جائیں۔ بعض بعض اوقات اساتذہ اور والدین اس غرض سے مجتمع ہوتے ہیں کہ تعلیمی مسئلوں پر بحث اور مدارس کی ضروریات پر غور وخوض کیا جائے۔

مدارس میں لاسلکی اور سینما کا استعمال انگلستان اور جرمنی کے مدارس میں سینما کا استعمال نہایت ہی شدومد کے ساتھ ہر دلعزیزی اختیار کر رہا ہے۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ جرمنی انگلستان کے مقابلہ میں تعلیمی فلس کی پیداوار میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے لیکن تعلیمی ذریعہ کی حیثیت سے لاسلکی کی ترقی میں انگریز جرمنوں سے بہت آگے ہیں۔ انگلستان میں لاسلکی کا استعمال بالخصوص غیر زبانوں اور موسیقی کی تعلیم کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن ہمیشہ لاسلکی اسباق دینے کے لئے

ماہرین فن تعین کرتا ہے۔ مثلاً فرانسیسی کی تدریس میں ہمیشہ ایک مسلمہ قابلیت کا فرانسیسی
مقرر کیا جاتا ہے۔ لاسلکی اسباق کا ماہانہ نظام العمل قبل از قبل شائع کر دیا جاتا ہے۔
اور جن مدارس میں لاسلکی سماع ہوتے ہیں وہ اسی کے مطابق اپنے نظام الاوقات
ترتیب دیتے ہیں لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ سینما اور لاسلکی کے ذریعہ اساتذہ کے
تدریس کی تفہیم کی جاتی ہے، اور یہ اس کے بدل استعمال نہیں کئے جاتے ہیں۔

مجلس بین الاقوام کے اصول کی تعلیم | میں نے اپنے اس دوران قیام انگلستان میں یہ
دیکھا کہ وہاں اس امر پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا کہ آیا اصول مجلس اقوام نصاب
مدارس میں شریک کئے جائیں کہ نہیں۔ انجمن ہائے اساتذہ اور ارباب بست و کشاد
عموماً اس بات کی تائید میں تھے کہ یہ اصول طلبا، مدارس کے لئے ضروری قرار دئے
جائیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ محض ان اصول کو داخل نصاب کر دینا شہریوں کی ایک
ایسی جماعت پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہے جو آیندہ صلح و امن قائم رکھ سکے۔ یہ
ایک ضروری امر ہے کہ اس مضمون کی تعلیم صرف انہی اساتذہ سے دلوائی جائے
جو حقیقت میں اصول کے سچے پیرو ہیں۔

مذہبی تعلیم | انگلستان۔ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں ماہرین تعلیم اس بات کے
عام طور پر مخالف ہیں کہ مدارس میں مذہبی تعلیم دی جائے۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ
مذہبی تعلیم اس آزادی کی ہم آہنگ نہیں ہے۔ جو تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے
اور ان کے خیال کے مطابق یہ بہتر ہے کہ بچوں کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ بڑے ہو کر
خود مذہب کے مسئلہ پر غور کریں۔

مابعد ابتدائی تعلیم | ایک اور میلان یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد مختلف نصاب
مختلف صلاحیتوں والے طلبار کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں ابتدائی تعلیم کے اختتام
پر معمولی امتحانات کے علاوہ تعلیمی آزمائشوں کے ذریعہ سے آیندہ تعلیم کے لئے طلبا کا

اس مہمان نوازی کے لئے جو اثنار قیام انگلستان میں کی گئی تھی شکریہ ادا کیا اس کے بعد آپ نے تعلیم کے ان جدید رجحانات کا ذکر کیا جو حالیہ سفر یورپ کے دوران میں آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ اولاً آپ نے اصول فعلیت پر بحث کی اور فرمایا کہ فعلیت سے یہ مطلب ہے کہ طلبار کو اپنے حواس اور اعضار و جوارح سے کام لینے کے لئے بیشتر مواقع دے جائیں۔ اس اصول کے مدنظر مدرسہ کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے وہ محض معلومات کا ذخیرہ طلبار کے دماغوں میں اکٹھا کردے بلکہ ذاتی عمل اور ذاتی اظہار کی قوت کے ذریعہ ان کی باطنی صلاحیتوں کو ترقی دے واضعین اصول مذکور کا یہ خیال ہے کہ بچے کو اپنی ذاتی تجربوں سے معلومات حاصل کرنا چاہیئے نہ کہ محض دوسروں کے کہنے سے۔ اور اس کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کو کیا کرنا ہے یعنے اس کا مقصود کیا ہے اس کے بعد وہ اُن کو حاصل کرنے کیلئے وسائل و ذرائع منتخب کرے۔ اور اپنی ہی کوششوں کے وسیلے سے غلطیوں میں سے گزر کر حقیقت تک پہنچنے کا راستہ دریافت کرلے۔ آلات تعلیمی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ منشار یہ ہے کہ کم سے کم آلات ہی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مہارت۔ صلاحیتیں اور کام میں مسرت اور خوشی کی بڑی سے بڑی مقدار حاصل ہو۔ مجھے کسی ایسے مدرسہ کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا جس میں بالکلیہ ان اصول کے تحت تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن میں نے برلن کے چند تحتانیہ مدرسوں کے کارخانوں میں "اصول فعلیت" کی عمل پیرائی کا مشاہدہ ضرور کیا ہے۔ ان مدارس میں دستکاری کی تعلیم کو اسی قدر اہمیت حاصل ہے جس قدر کہ نصاب تعلیم کے دیگر مضامین کو اور دستکاری صرف اسی لئے نہیں سکھلائی جاتی کہ بچوں میں ہنر اور لطافت طبع پیدا ہو بلکہ اس لئے بھی کہ دوسرے مضامین مثلاً جغرافیہ طبعیات وغیرہ میں اس سے مدد لی جائے۔ مدارس باغبانی بھی اسی اصول پر قائم کئے گئے ہیں، کیونکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ تعلیم مطالعہ فطرت مدرسہ کے کمروں میں نہیں دیجا سکتی اور اسی وقت بارآور

ہوسکتی ہے جبکہ عملی طور پر باغ میں دی جائے۔

جسمانی تعلیم | دوسرا میلان جسمانی تعلیم کی قدردانی ہے۔ میدانی کھیلوں نے انگریزی مدارس میں جو اہمیت پیدا کرلی ہے اس کو دنیا جانتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ انگلستان میں لڑکیوں کی جسمانی تربیت کا اتنا ہی مکمل انتظام ہے جتنا کہ لڑکوں کا۔ اسی سلسلہ میں نسوانی برگمن آسٹربرگ فزیکل ٹریننگ کالج کا ذکر جو ڈارٹفورڈ واقع کینٹ میں ہے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ صدر کلیہ مذکور نے شہنشاہی تعلیمی کانفرنس کے نمایندوں سے اس کے معائنہ کی درخواست کی تھی یہ کلیہ ان لڑکیوں کے لئے ایک اقامتی درس گاہ کا کام دیتا ہے جو نسوانی مدارس میں جسمانی تعلیم کی معلمات بننا چاہتی ہیں۔ اس میں بڑے بڑے میدان اور تین جمنازیم ہیں علاوہ جسمانی تعلیم یعنے ورزش، کھیل، رقص و پیراکی کے لڑکیوں کو اصول و عمل تعلیم عضلیات، تشریح الابدان حفظان صحت، طبی ورزش۔ اور مالش و علاجی ورزش کی نظری و عملی تعلیم دی جاتی ہے نصاب تعلیم تین سال کا ہے۔ لڑکیوں کو کلیہ میں جن جسمانی ورزشوں کی تعلیم دی جاتی ہے اُس کا انھوں نے ہمارے آگے مظاہرہ کیا۔ ان میں سے بعض تو ان ورزشوں سے زیادہ محنت طلب تھے جو ہندوستان کے مدارس ذکور کی اعلیٰ جماعتوں کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ طالبات کی صحت قابل رشک تھی۔ اقامتی طریقہ اور اس عام توجہ کا نتیجہ جو اس درسگاہ میں ذہنی نشو و نما اور تعمیر کردار پر صرف کی جاتی ہے یہ ہے کہ ان کے معلومات نہایت وسیع ہیں اور ان کے اخلاق دلنواز ہیں۔

جرمنی کے ہر مدرسہ کے لئے ایک مکمل جمنازیم اور ایک تربیت یافتہ (ٹرینڈ) معلم ورزش جسمانی مہیا کیا گیا ہے۔ جنگ کے بعد سے لازمی فوجی تعلیم موقوف ہوجانے کے باعث جرمنی میں جسمانی ورزشوں پیراکی نفسی ورزشوں، میدانی کھیلوں اور تعلیمی سیر و سیاحت کو مزید اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

اور کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔

شاخ اسلامیہ ہائی اسکول سکندر آباد تعلیمی سیر و سیاحت، فن سوالات اور کتب خانہ مدرسہ کے عنوانات پر پُر جوش مباحثے ہوئے۔ تعلیمی سیر و سیاحت کے متعلق۔ بی ایس آر صاحب نے فرمایا کہ تعلیم جدید اسی وقت مفید و موثر ہو سکتی ہے جبکہ مدرسین کتابوں کی چار دیواری میں نہ بند رہیں، بلکہ باہر نکل کر مظاہر قدرت کی مدد سے علوم نصابی کی تعلیم دیں قیام انجمن اتحاد باہمی کے مسئلہ پر خوب بحثیں ہوئیں اور مالی امداد کی توقع نے زندگی و زندہ دلی پیدا کر دی تھی۔

شاخ وسطانیہ شاہ گنج سال زیر رپورٹ میں نو جلسے ہوئے اور ہر جلسہ میں اساتذہ مرکز نے کافی دلچسپی لی۔ ہر عنوان پر قیمتی آرا کا اظہار کیا گیا۔ تختہ سیاہ، سوالات پر نمونہ کے سبق دئیے گئے دستکاری کے بارہ میں عام خواہش تھی کہ اسے شریک نصاب کیا جائے۔

شاخ نامپلی ہائی اسکول پہلے جلسہ میں مہدی حسن صاحب زبیری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ مددگار ٹریننگ کالج بلدہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ تعلیمی سیر و سیاحت سے جماعتی تعلیم حقیقی اور دلکش ہو جاتی ہے۔ طریقہ سوالات کے عنوان پر مصطفےٰ حسین صاحب مددگار مدرسہ نے نہایت عمدگی سے نمونہ کا سبق دیا۔ راما نوجاچاری صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی نے فرمایا کہ سوالات سے نہ صرف طلباء کے حافظہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ بلکہ بچوں میں عادتِ فکر اور جماعت میں ڈسپلن پیدا ہوتا ہے۔ تختہ سیاہ کے فوائد بھی نمونہ کے سبق کے ذریعہ واضح کئے گئے۔ انجمن اتحاد باہمی کا قیام ہر تحتانیہ وسطانیہ فوقانیہ مدارس میں ضروری خیال کیا گیا۔ محمد میر صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادر گھاٹ نے گنڈر گارٹن پر نہایت دلچسپ و مفید لکچر دیا چاری صاحب صدر مدرس مدرسہ کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے ہر جلسہ کامیاب ہوا۔ اور مدرسین جلسوں سے عمدہ خیالات اور مفید معلومات کا ذخیرہ لے کر واپس گئے۔

شاخ محبوب کالج سکندرآباد۔ دوران سنہ ۱۳۳۶ف میں انجمن اساتذہ کے ۹ جلسے ہوئے جن میں اراکین نے بے حد مسرت اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے رہے آر۔ وی کرشنا سامی صاحب نے کتب خانوں کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ کتب خانے وسعت معلومات کا باعث ہیں۔ اور اگر ان کا وجود نہ ہوتا تو اس قدر سرعت کے ساتھ جو علمی ترقیاں اب تک ہوئی ہیں وہ ہرگز نہ ہوتیں۔ پرشوتم صاحب نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں کنڈرگارٹن کی ابتدائی مشکلات اور فروبل کی جدوجہد کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "ذاتی سعی بستان الاطفال کا اصلی راز ہے"۔

شاخ بلارم۔ اس شاخ کے جلسے اے۔ وی۔ ہائی اسکول کے ہال میں منعقد ہوئے گو اصولاً جلسوں کی صدارت لوکل سکرٹری کے حصہ میں آئی ہے؛ لیکن اے شیوا شنکرن صاحب معتمد مقامی اس عزت میں دوسرے صدر مدرسین و اساتذہ کو شریک کرتے رہے۔ باہر کے لوگوں کو جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ عمل سے جلسوں میں بڑی سرگرمی پیدا ہو جاتی تھی بار بار کی ملاقاتوں سے اساتذہ اور بیرونی اصحاب کے مابین نہایت خوشگوار اور نتیجہ خیز مراسم و ارتباط قائم ہو گیا ہے۔

شاخ آصفیہ ہائی اسکول شاخ آصفیہ ہائی اسکول میں (۶) جلسے ہوئے جلسوں میں اساتذہ نے بڑی دلچسپی و جوش کا ثبوت دیا۔ اور ہر عنوان پر قابلیت کے ساتھ تفصیلی بحثیں ہوئیں فدا حسین صاحب بی۔ اے۔ صدر مدرس عبدالحمید خاں۔ بی۔ اے۔ سکنڈ ماسٹر علی احمد خاں۔ بی۔ اے قادر حسین خاں اور منیر الدین صاحب نے جلسوں کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔

شاخ وسطانیہ گولکنڈہ سنہ ۱۳۳۶ف صرف چار جلسے ہوئے کتب خانہ کے عنوان پر سرگرم مباحثہ ہوا مقررین نے زور دیا کہ طلبا کو کتب خانہ میں بیٹھنے کے لئے مجبور نہ کرنا چاہئے بلکہ اس میں ایسی کشش و دلآویزی پیدا کرنا چاہئے کہ وہ خود ہی کتب خانہ میں گھسے رہیں۔ تعلیم تو جماعت میں کافی ہو جاتی ہے اس لئے بچوں کو کتب خانہ میں من مانے

طور پر پڑھنے دیا جائے تاکہ تخیل و کردار کی تعمیر ممکن ہوسکے۔
شاخ وسطانیہ چنچل گوڑہ کل (۸) جلسے ہوئے اور ارکین ہر جلسے میں انہماک و سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے رہے فصیح الدین صاحب صدر مدرس تحتانیہ رین بازار نے نہایت شرح و بسط سے طریقۂ سوالات پر تقریر فرمائی اور مختلف مضامین نصاب کی تعلیم میں سوالات کی جگہ غایات اور حد بندی بتائی۔ بہادر حسین صاحب صدر مدرس تحتانیہ الاوہ یتیماں نے ایک عام شکایت کی ترجمانی کی اور کہا کہ مدارس تحتانیہ میں جو کتب خانہ ہے وہ اس نام کا مستحق نہیں ہے لیکن سب سے زیادہ مفید و سودمند وہ نمونہ کا سبق تھا جو عظیم الدین صاحب نے تختہ سیاہ کے استعمال پر دیا۔ انجمن اتحاد باہمی کے سلسلہ میں یہاں بھی سود کا مسئلہ "بستر خار" بنا رہا۔ دستکاری کے متعلق بیان کیا گیا کہ نفسیاتی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ انگلیوں کے اعصاب اور نخاعی مرکزوں میں قریبی تعلق ہے۔ اور ہاتھ سے کام کرنے سے ذہن پر گہرا نقش جمتا ہے اس سلسلہ میں پرکاش راؤ صاحب اور لئیق احمد صاحب نے بچوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے خوشنما کاغذی پھول وغیرہ دکھائے۔
شاخ وسطانیہ گوشہ محل شرکا کی حاضری تشفی بخش تھی اور مقررین کی کمی نہ تھی اس لئے تمام جلسے دلچسپ و کامیاب رہے۔ طریقہ سوالات اور تختہ سیاہ کے عنوان پر زوردار تقریریں ہوئیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تعلیم کے ان دو اہم ذرائع کو جن سے مدرسین کو روزمرہ کام پڑتا ہے نمونہ کے اسباق سے واضح نہیں کیا گیا۔
شاخ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ شاخ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ میں (۸) جلسے ہوئے۔ تعلیمی تفریح پر تبادلۂ خیالات نتیجہ خیز ثابت ہوا اور مرکزی مدرسہ کے ایک مدرس صاحب اس نئے ذریعۂ تعلیم کا تجربہ کرنے کے لئے لڑکوں کو گولکنڈہ لے گئے پرچوں کی جانچ کی نسبت متفقہ خیال یہ تھا کہ غلطیوں کی اصلاح نہ کی جائے۔ بلکہ صرف خط کشیدہ کر دیا جائے اور طلبا سے ان پر غور و فکر کرنے اور خود تصحیح کرنے کے لئے کہا جائے ضروری ہیں دو اہم تحریکیں۔

پیش ہوئیں قیام انجمن اسپورٹس برلئے اساتذہ بلدہ و انتخاب مدرسین برائے نگرانکاری امتحانات سرکار عالی۔ تختہ سیاہ کے متعلق کہا گیا کہ دوران سبق میں اس کا استعمال ہو اور اس کو صاف رکھا جائے اور اس پر خوشخط لکھا جائے۔

دستکاری پر بحث کرتے ہوئے مقررین نے اظہار افسوس کیا کہ آج کل سب لوگ ملازمت پر تلے ہیں، اور دستکاری کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا حالانکہ قدیم ہندوستان میں مرد اور عورتیں کم از کم ایک ہنر جانتی تھیں۔

شاخ وسطانیہ متعدپورہ تعلیمی تفریح پر اس شاخ میں بھی بہت زور ڈالا گیا۔ اجتماعی سوالات کا بڑا فائدہ یہ بتایا گیا کہ طلباء کی توجہ قائم رہتی ہے۔ کاپیوں کی جانچ کے لئے خیال ظاہر کیا گیا کہ صرف جواب کی غلطی نہ دیکھی جائے۔ بلکہ عمل کا بھی لحاظ کیا جائے۔ قیام انجمن اتحاد کے سلسلہ میں سود کا سوال پیدا ہو گیا۔ لیکن عام رائے یہ تھی کہ جب دوسرے کاروبار میں روپیہ کے ذریعہ روپیہ حاصل کیا جاتا ہے تو قوم و ملک کو فائدہ پہونچانے والا نفع بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیئے لیکن کنڈرگارٹن کی متفقہ طور پر مخالفت کی گئی اور خوف ظاہر کیا گیا کہ ہندوستان میں اس طریقہ تعلیم کی بارآوری محال ہے کیونکہ چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے عورتیں زیادہ موزوں ہیں۔ اور ہندوستان میں معلمات کی قلت ہے۔

شاخ وسطانیہ دارالشفاء تعلیمی تفریح کے متعلق مشتاق احمد صاحب نے فرمایا کہ اس کی کامیابی بڑی حد تک اولیاء طلباء کی مالی اتحاد عمل پر منحصر ہے طریقہ سوالات پر عباس علی صاحب نے نمونہ کا سبق دیا جو بہت دلچسپ اور فائدہ بخش تھا۔

شاخ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ تعلیم ڈرائنگ کے عنوان پر عبدالرزاق صاحب ڈرائنگ ماسٹر نے تقریر کی اور کہا کہ ملک کی ترقی کے لئے صنعت و حرفت کی ضرورت ہے اور صنعت و حرفت کی کامیابی ڈرائنگ پر موقوف ہے حسام الدین صاحب فاضل نے احادیث کا حوالہ دیکر ثابت کیا کہ نقشہ کشی جائز ہے تعلیمی تفریحوں کی ضرورت بالاتفاق محسوس کی گئی طریقہ

شذرات

ریاست باڑیہ میں وائسرائے کی تقریر ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں اتنے طول طویل عرصہ تک خالصۃً ادبی و نظری تعلیم کا دور دورہ قضا و قدر کی ستم ظریفی تھی۔ نصاب تعلیم اور قوم کی ضروریات زندگی میں جو بیّن تفاوت تھا اور ایک حد تک باقی ہے وہ ترقی تعلیم کی رفتار میں سنگ راہ ثابت ہوا ہے۔ برسوں کی چیخ پکار اور ڈیڑھ صدی کی ناکامیوں کے بعد آخر کار حکومت نے زرعی اور پیشہ وری تعلیم کی اہمیت محسوس کی اور اب ہندوستان میں جا بجا فنی مدارس کھولے جا رہے ہیں اور نصاب میں زرعی و پیشہ وری تعلیم کو جگہ دیجانے لگی ہے۔ دیسی ریاستیں بھی اس قومی تحریک سے بے خبر نہیں ہیں ریاست باڑیہ ان ریاستوں میں سے ہے جو اپنی رعایا کے جان و مال کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی و روحانی نشو و نما کو اپنی پالیسی کا نصب العین سمجھتی ہیں۔ سر رنجیت سنگھ ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقعہ پر ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر نے ریاست کی روز افزوں تعلیمی ترقی پر مہاراجہ بہادر کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا "ابتدائی تعلیم کو زرعی رنگ دینے کی جو قابل قدر اسکیم آپ نے تجویز کی ہے وہ ایسی پالیسی کی بنا رہے جس کی نیک پاشیاں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ تعلیم کا اصلی مقصد انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ مجھے یقین ہے کہ جس قسم کی فنی تعلیم کی ابتدا آپ نے کی ہے وہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ تعلیم یافتہ کسان کا تصور قرون وسطی کی قدیم فرقہ بندیوں سے جداگانہ ہے جن میں اونچی ذات والے زمیندار اور نیچی ذات والے کسان کی تفریق تھی۔ بہ نسبت اُن گوناگوں امتیازات کے جو انسان اور انسان کے مابین آج کل نظر آتے ہیں۔

یہ تصور جدید جمہوریت کے اصول کے زیادہ مطابق ہے۔

میرا خیال ہے کہ متوسط طبقہ کی بیکاری کے خاص اسباب میں سے ایک سبب جو موجودہ ہندوستانی زندگی کا روح فرسا رُخ ہے، یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے وطن کو واپس جانے اور اپنے معلومات سے کام لینے میں پہلو تہی کرتے ہیں۔"

جامعۂ بنارس کا دسواں جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ بنارس کے دسویں جلسۂ تقسیم اسناد میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندی میں خطبہ پڑھا اور جامعہ میں دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی امید ظاہر کی۔

عجیب و غریب کتا کولمبیہ میں ایک اعجوبۂ زمانہ کتا ہے۔ اس کا نام فیلو ہے اور جرمن گلہ بان نسل کا طاقتور جانور ہے۔ یہ عجیب و غریب کتا تین سو الفاظ سمجھتا ہے اور بارہا آزمایشوں میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کے مالک مسٹر جیکب ہربرٹ نے اس کو چار سال میں تعلیم دی ہے۔ اس کی عمر ۹ سال کی ہے حالانکہ اس کی سمجھ آٹھ سال کے بچے کے برابر ہے۔

فیلو ہر حکم کی پوری پوری تعمیل کرتا ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ حکم بالمواجہ یا ایک ہی لہجہ میں یا اشاروں کی مدد سے دیا جائے۔ مسٹر ہربرٹ نے مختلف لہجوں میں اور دروازہ پیچھے کھڑے ہو کر آواز دی لیکن فیلو اچھی طرح سمجھ گیا اور حرف بحرف تعمیل کی۔

معدہ کی چوری "ڈی کوئنسی" کی بلاغت نے "قتل" کو فنون لطیفہ میں شامل کرا دیا لیکن "چوری" کا فن کس مپرسی کا شکار بنا رہا اور سوائے ظفر عمر صاحب کے "چوروں کے کلب" کے دوسرے مہذب و علمی حلقوں میں مقبول نہ ہوا۔ سائنس کی ہمہ گیر سرپرستی نے دوسرے علوم و فنون کیساتھ اسے بھی اُچھالا۔ حال میں فرانس کے ایک ڈاکٹر نے مریض کا معدہ چرالیا۔

کسی کے وہم وگماں میں بھی نہ آتا ہوگا کہ معدہ کی چوری ممکن ہے لیکن طرفہ تر واقعہ تو یہ ہے کہ مریض اب تک زندہ ہے۔ ڈاکٹر رن نے مریض کی بالائی انتڑیوں کو نلوں سے جوڑ دیا ہے اور کہتے ہیں کہ مریض کو جان کا خطرہ نہیں ہے

سینما کمیٹی کچھ عرصہ سے تعلیمی حلقوں میں سینما کو بیحد اہمیت دی جا رہی ہے امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس لنڈن میں اس کے تعلیمی فوائد پر مضامین پڑھے گئے مسٹر ایسکوتھ نے امپیریل انسٹیٹیوٹ کی صدارتی تقریر میں سینما کی تعلیمی اہمیت پر بہت زور دیا۔ حیدرآباد میں انجمن اتحاد باہمی نے تعلیمی فلمز کی تیاری اور نمائش کے بارہ میں ایک قیمتی تجویز پیش کی ہے اور مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے نے یوروپ سے واپسی پر اپنی تقریروں سے سینما کو تعلیم کا خبر ولا ینفک ثابت کر دیا ہے اب حکومت ہند نے ایک سینما کمیٹی مقرر کی ہے جو ہندوستان کے صوبوں میں دورہ کر کے تحقیق کر رہی ہے کہ ہندوستانی مدارس کے لئے کس قسم کے فلمز مفید ہوں گے اور کس حد تک۔

قلب شجر اب ہر شخص جانتا ہے کہ جسم حیوانی کی طرح جسم شجر میں بھی اعصابی ریشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اور جانداروں کی طرح پودوں میں بھی احساس ہے لیکن عرق شجری کا دوران بہت دنوں تک عقدہ لاینحل بنا رہا۔ آخر کار یہ گتھی بھی سلجھ گئی۔ بوس انسٹی ٹیوٹ کے جلسہ میں سر جے۔ سی بوس نے یہ دکھا دیا کہ عرق شجری اور خون حیوانی کا دوران ایک ہی اصول کا تابع ہے اور جس طرح دل کی حرکت سے خون سارے جسم میں دوڑتا ہے اسی طرح پودے میں بھی عرق شجری قلب کے سکڑنے اور پھیلنے سے شاخوں۔ ڈالیوں اور پتوں تک پہونچتا ہے۔ فرق صرف صوری ہے۔ حیوانی دل چھوٹا اور گٹھیلا ہوتا ہے اور اس کی ساخت پیچیدہ ہوتی ہے لیکن پودے کا دل لمبوترا اور تنہ کے اندرونی حصہ میں دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ حیوانی و شجری

دلوں کے انداز عمل میں بیحد مماثلت ہے۔ اس مماثلت سے بڑی طبی توقعات وابستہ ہیں کیونکہ بہت سے تجربات، جو ترقی طب کے لئے ضروری ہیں، انسانوں پر نہیں کئے جا سکتے مگر بندروں پر بآسانی ممکن ہیں۔

بتاریخ ۹ و ۱۰ اردی بہشت ۱۳۳۷ف مدرسہ وسطانیہ قصبہ سداسیو پیٹھ کا جلسہ سالانہ بصدارت جناب مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی اے۔ ایل ٹی مہتمم تعلیمات ضلع میدک منعقد ہوا۔ ساہوکاران اور معززین مقامی سے مدرسہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔

جلسہ کا آغاز قرأت اور شلوک سے ہوا اس کے بعد صدر مدرس اور بعض اساتذہ و طلبا نے تعلیمی مضامین پر اردو تلنگی اور انگریزی میں تقاریر کیں۔

ساہوکاران اور ڈاکٹر پی گنیش صاحب میڈیکل افیسر کی جانب سے فٹ بال ڈریس جو تقریباً ۵۰ روپیہ کی لاگت سے تیار کرایا گیا تھا پیش کیا گیا اس کے علاوہ حسب ذیل حضرات نے مستحقین کے لئے انعامات عطا کئے۔

مولوی شیخ ابوالحسن صاحب بی اے ایل ٹی (۶۰) جلد کتب درسی متفرق
" محمد عبدالمتین صاحب ٹی ڈی صدر مدرس (۳) جلد انگریزی کتب و تھرماس وغیرہ
" مرزا غلام مصطفٰے بیگ صاحب اول مددگار ایک نقروی تمغہ۔
مسٹر کاچم بانیا صاحب ساہو "
مولوی محبوب علیشاہ صاحب مددگار ایک جلد تعلیم القرآن

بتاریخ ۱۰ اردی بہشت ۱۳۳۷ف بازیگاہ پر اسپورٹس اور فٹ بال ہوا انعامات تقسیم کئے گئے اس کے بعد مدرسہ کی جانب سے معززین مقامی کو اٹ ہوم دیا گیا جن میں مولوی ضیاء الحق صاحب مددگار مہتمم تعمیرات ضلع بھی شریک تھے۔

دوسرے دن صبح کو تعلیمی انعامات و عالیجناب نواب صدر اعظم بہادر کے عطیہ ۵ (جو بابت دورہ عطا فرمائے گئے تھے) کی شیرینی تقسیم کی گئی۔

پبلک خود روپیہ جمع کرکے اپنی ضروریات کو پورا کرے گی۔

شرکار کانفرنس کا مجمع مدرسین کا مجمع ہے۔ اس لئے میں ان کو فرائض کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں مدرسین کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے فن سے خوب واقفیت حاصل کریں۔ تعلیم اب ایک سائنس بن گئی ہے۔ انگلستان اور جرمنی میں متعلمین کی ذہنیت اور ان کے محلے دماغی کا معیار مقرر کیا جاتا ہے۔ تب کہیں ان کو ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ فن طب کی واقفیت کے بغیر کسی مرض کا علاج معالجہ کرنا حماقت آمیز نتائج پیدا کرتا ہے۔ اگر مدرسین اپنے فن سے واقف نہ ہوں تو روحانی علاج کیسے ممکن ہوگا۔ یورپ میں نارمل سکول کا نصاب تین سال کا ہوتا ہے۔ ہمارے مدرسین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نارمل سکول جاکر کم سے ایک سال تک عملی کی تعلیم حاصل کریں۔ (۲) علم میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہورہی ہے۔ جو بات مسلمہ آج ہے کل غلط ثابت ہورہی ہے اس لئے معلومات کے بڑھانے کے لئے مدرسین حضرات کو کتب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تعلیم ایک سمندر ہے جس کی تہہ نہیں ملتی۔ اکثر مدرسین ملازمت کے بعد کتابوں کا مطالعہ ترک کردیتے ہیں جس کے باعث لڑکوں کو موجودہ حالات کے علم سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا (۳) مدرسین کی اخلاقی حالت قابل تقلید ہونی چاہئے جس مدرس کی اخلاقی حالت درست نہ ہو وہ کس طرح لڑکوں کی اخلاقی حالت درست کرسکتا ہے۔ لڑکوں میں تقلید کا مادہ بدرجہ اتم ہوتا ہے مدرس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ایک قابل تقلید نمونہ بناکر لڑکوں کے سامنے پیش کرے۔ اگر مدرس کی اخلاقی حالت خراب ہو تو نہ صرف اس کے ساتھ اس دنیا میں سخت تدارک کیا جاتا ہے بلکہ خدا کے ہاں بھی اس کو اپنی اخلاقی اثرات کا جو لڑکوں پر برے یا بھلے پڑے ہوں جواب دہ ہونا پڑے گا (۴) مدرس کو چاہئے کہ بے تعصب و بے لوث ہو اور مدرسہ کے بچوں کو

اپنے بچے اور قوم کے بچے تصور کرے۔ (۵) اساتذہ کی مالی حالت ان کے اطمینان قلب کے لئے تشفی بخش نظر نہیں آتی۔ اپنی مالی حالت کے درست کرنے میں ان کو ممکنہ تدابیر اختیار کرنا چاہئے۔ مالی حالت کے خراب ہونے سے جسمانی دماغی اور اخلاقی خرابی رونما ہوجاتی ہے۔ اگر مدرسہ میں مدرس کا ذہن نیٹ کے تقاضے یا بیوی بچوں کی فاقہ کشی پر منتقل ہو تو بھلا وہ لڑکوں کو کس طرح تعلیم دے سکے گا۔ (۶) مدرس کو علاوہ تعلیمی فرائض دکاردبار کے ملک کے سوشیل اور سیاسی معاملات میں حصہ لینا چاہئے۔ مدرس یورپ میں قضیہ کا لیڈر اور رہنما ہوتا ہے۔ لوگ ہر معاملہ میں اس سے رائے ومشورہ لیتے ہیں۔ اور وہ ان کے رنج وخوشی میں حصہ لیتا ہے۔ تعلیم نسواں کے معاملہ میں مرد کو اعلیٰ خیالی سے کام لینا چاہئے جب تک عورتوں کو کچھ آزادی نہ دی جائے ان کے قوائے جسمانی دماغی واخلاقی معطل رہیں گے"!

روز اول اجلاس دوم (۱۷ اسفندار۔ سہ پہر)

سوا تین بجے نظم خوانی کے ساتھ دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا مولوی شمس الدین احمد صاحب بی اے۔ بی ٹی نے اپنی رپورٹ پڑھی جس میں دور عثمانی کی برکات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں بفضل خدا تعلیم سرعت کے ساتھ عام ہو رہی ہے چنانچہ بے شمار ہائی اسکولس مڈل اسکولس و مدارس تحتانیہ وکالج کے قیام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی بھی قائم ہوچکی ہے جو ہر گوشہ ملک کو منور کر رہی ہے اوساں معزز عہدہ دار ومخیر اصحاب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا جنہوں نے قیام کانفرنس و اسپورٹس ونمایش تعلیمی میں فیاضانہ امداد فرمائی اور خصوصاً مولوی غلام احمد خاں صاحب اول تعلقدار صاحب و نواب اصالت جنگ بہادر اور میر مہدی علی صاحب شہید کے اسمائے گرامی اس وجہ سے عزت کے ساتھ لئے گئے کہ ان ہر سہ ہستیوں نے انجمن کی مالی امداد میں کافی حصہ لے کر اس کے قیام اور کامیابی میں ممکنہ سہولتیں بہم پہونچائیں۔ انجمن اساتذہ کی مختصر تاریخ

ان کی ضروریات زندگی کثیر ہیں۔ جب تک ان کی مالی حالت درست نہ ہوگی ملک کی تعلیمی حالت درست نہیں ہوسکتی۔ حکومت کہاں تک پبلک کی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے۔ اہل ملک کی سماجی حالت نہایت ابتر ہے مس میو نے اپنی کتاب میں ہند کی سماجی حالت کا جو ذکر کیا ہے اس کا بیشتر حصہ صحت پر مبنی ہے۔ صرف پچیس فی صدی اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے ہمارے لئے اس کتاب کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ تاکہ وہ لوگ جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں اس سے مستفید ہوسکیں۔ ہماری سماجی حالت کس قدر افسوسناک ہے کہ غیر ملک کی عورتیں بھی اس پر معترض ہیں۔ حضرات! ان حالات کے تحت جو تعلیمی ترقی ہمارے ملک میں ہورہی ہے بسا غنیمت ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں مختلف نظار نے ملک کی تعلیمی حالت کو ترقی دی ہے۔ لیکن دور عثمانی میں نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کے زمانے میں بلحاظ تعداد طلبا بلحاظ تعداد مدارس اور بلحاظ اعلیٰ تعلیم کے تعلیمی حالت میں نمایاں ترقی ہوئی ہے جامعہ عثمانیہ اسی زمانہ کی ایک قابل قدر اور قابل تقلید پیداوار ہے۔ تعلیمات کے نصاب تعلیم پر اکثر حضرات معترض ہیں۔ مگر میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ تعلیمات کا نصاب نہایت ہی اچھا ہے۔ یہ نصاب یورپ کا ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ یورپ کے طلبار کو تعلیم مکمل طور پر دیجاتی ہے۔ اور یہاں کی تعلیم نامکمل طور پر ہو رہی ہے۔ دستکاری کی تعلیم یہاں وسطانیہ میں نہیں دی جاتی۔ دستکاری کی تعلیم دینے اور حاصل کرنے کے لئے نہ حکومت ہی تیار ہے۔ اور نہ ملک زراعت اور

صنعت وحرفت کے لئے زمینات وآلات وغیرہ کی سخت ضرورت ہے اور
اس کے لئے کثیر رقم درکار ہے۔ ملک میں صنعت وحرفت کا زور ہو تو اس کی
تعلیم بھی مفید ثابت ہوگی۔ موجودہ حالت میں صنعت وحرفت کے مدارس
کھولنے کا سوال قبل از وقت ہے۔ البتہ زرعی مدارس چل سکتے ہیں تحتانیہ
کی تعلیم کے بعد زرعی مدارس کے کھولنے کا مسئلہ سررشتہ تعلیمات کے زیر غور ہے
زرعی مدارس کھولدیئے جائیں تو ملک کے افلاس کا مسئلہ ایک حد تک حل
ہوجائے گا۔

یہ اعتراض کہ تعلیمات کے اخراجات کثیر ہیں بالکل غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حضرات!
تعلیم ارزاں نہیں ہوسکتی۔ ارزاں وگراں کا سوال ہی بیکار ہے۔ ارزاں کا آخر
مقصد کیا ہے؟ کیا تعلیم دینے کے لئے عمارت نہ ہو یا اساتذہ کم ہوں یا آلات
تعلیم وسائنس کم ہوں! بغیر عمارت کے بغیر اساتذہ کی کافی تعداد کے بغیر آلات
تعلیم نہیں ہوسکتی۔ ان چیزوں کے مہیا کرنے میں سررشتہ تعلیمات ہر ممکنہ
کوشش عمل میں لا رہا ہے سال گزشتہ انگلستان کی تعلیم ثانویہ پر نو ملین پونڈ
(۱۳۵ کروڑ روپیہ) کا صرفہ ہوا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ تعلیم میں
روپیہ کی کس قدر ضرورت ہے۔ جبری تعلیم ہو تو سررشتہ تعلیمات کو ڈیڑھ
کروڑ کی ضرورت ہوگی۔ حضرات! میں جب مدارس کے معائنہ کے لئے جاتا ہوں
اور مدارس کی عمارتوں کی ابتر حالت پر نظر ڈالتا ہوں تو یقین جانئے کہ میں
اپنے آپ کو ایک بڑا مجرم پاتا ہوں مدرسوں میں نہ ہوا آتی ہے۔ نہ روشنی اس سے
لڑکوں کی جسمانی و دماغی قویٰ پر جو مضر اثرات پڑ رہے ہیں ان کو اب یہاں
بیان کرنے کے لئے مجھے وقت نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی تعلیم کے لئے دو کروڑ کا
بجٹ ہونا چاہئے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ

کانفرنس تعلیمی ضلع کریم نگر

کانفرنس تعلیمی ضلع کریم نگر کا انعقاد منجانب انجمن اساتذہ زیر صدارت جناب مولوی محمد حسین صاحب جعفری نائب ناظم تعلیمات سرکار عالی ماہ اسفندار کے ہفتہ سوم میں ہوا کانفرنس مندرجہ ذیل شعبہ جات پر مشتمل تھی ٹورنمنٹ و اسپورٹس ۔ نمائش تعلیمی ۔ اجلاس ہائے کانفرنس ٹورنمنٹ و اسپورٹس کا انتظام نہایت باقاعدہ طور پر کیا گیا تھا اسپورٹس اور ٹورنمنٹ ۱۵ ؍ تا ۲۰ ؍ اسفندار روزانہ صبح و شام ہوتے رہے اور ۲۰ ؍ اسفندار ۱۳۳۷ف کی شام کے چھ بجے کامیاب ٹیموں اور کھلاڑیوں کو شیلڈز کپس طلائی و نقرئی تمغے جناب صدر نشین صاحب نے اپنے ہاتھ سے عطا فرمائے ۔

نمائش تعلیمی کا انتظام مشن اسکول کریم نگر کی عمارت میں کیا گیا تھا اشیاء نمائش ضلع کریم نگر کے جملہ مدارس تحتانیہ وسطانیہ و فوقانیہ کے اساتذہ و معلمات طلباء و طالبات کی تیار کردہ تھیں ۔ ۱۷ ؍ اسفندار ۱۳۳۷ف کو پونے دس بجے جناب صدر نشین صاحب جلسہ نے نمائش تعلیمی کا افتتاح فرمایا نمائش کا قیام مسلسل پانچ روز تک رہا ۔ دو روز صرف خواتین کیلئے مخصوص تھے ۔ بقیہ ایام میں پبلک جوق جوق سامان نمائش دیکھنے کے لئے آتی رہی عمدہ نمونہ جات کے صلہ میں تمغے اور اسناد عطا ہوئے ۔

اجلاس ہائے کانفرنس　　　روز اول اجلاس اول　　　(۱۷ ؍ اسفندار ۱۳۳۷ف)

صبح کے دس بجے قرأت قرآن شریف کے ساتھ کانفرنس کی ابتدا ہوئی ختم قرأت پر جناب مولوی غلام احمد خاں صاحب صدر مجلس استقبالیہ اول تعلقدار ضلع کریم نگر نے حاضرین جلسہ سے جناب صدر نشین صاحب کا تعارف کرایا اور ضلع کریم نگر کی مردم شماری کا ذکر کرکے تعلیمی حالت پر خصوصاً تعلیم نسواں پر اظہار تاسف کیا اور مختلف سررشتوں کے

مقامی عہدہ داران کا جنہوں نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں دامے درمے سخنے قدمے معاونت فرمائی تھی گرم جوشی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اس کے بعد صدارت کی تحریک کی گئی جسکی تائید جناب مولوی میر مہدی علی صاحب شہید مہتمم خزانہ ضلع نے کی اور مولوی سید ذوالفقار علی صاحب حقانی کی مزید تائید پر جناب صدر نشین صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے اور ایک جامع بسیط اور فصیح و بلیغ تقریر فرمائی جس کا اقتباس درج ذیل ہے

عام طور پر اس امر کی شکایت کی جا رہی ہے کہ تعلیم میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہو رہی ہے اور جو تعلیم ملک کو دی جا رہی ہے وہ مفید نہیں ہے۔ جن کا یہ خیال ہے ان سے یہ استدعا ہے کہ وہ اس قسم کا الزام سررشتہ تعلیمات پر نہ لگائیں۔ کیونکہ یہ قرینہ انصاف نہیں ہے۔ کسی ملک میں تعلیمی ترقی انفرادی حیثیت سے نہیں ہوتی۔ سماجی، سیاسی اقتصادی اور علمی ترقی کا پہلو بہ پہلو ہونا نہایت ضروری ہے ان کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ملک ایک گاڑی ہے جس کے چار پہیے ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ ایک پہیہ کے نکل جانے سے گاڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دے سکے۔

ملک ہند کی سیاسی فضا، ہندو مسلم کی نا اتفاقی و کشیدگی کے باعث بالکل ابتر ہو گئی ہے۔ ہمارا ملک بھی اس متعدی مہلک مرض سے محفوظ نہیں ہے۔ ملک کے افراد "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کے مفہوم کو فراموش کر چکے اور کر رہے ہیں۔ اہل ہند نے قوم کے معنی غلط سمجھ لئے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ انگلستان میں انگریز یہودی وغیرہ سب ملکر ایک قوم کہلاتے ہیں جہاں قوم کا بچہ ہندو یا مسلمان کا بچہ سمجھا جائے گا۔ اس ملک کے افراد میں کس طرح ایثار کا مادہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کو خاص خاص باتوں سے محروم رکھنے کی کوشش کریں گے غرض جب تک ملک کی سیاسی حالت درست نہ ہو گی تعلیمی حالت کا ترقی کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے ملک کی اقتصادی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ پبلک افلاس کا شکار بنی ہوئی ہے اور

پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بنیاد ۱۳۳۵ف میں مولوی سید ذوالفقار علی صاحب صدر مہتمم تعلیمات صوبہ ورنگل کی ہمدردی و رہنمائی سے ڈالی گئی۔ مدت یکسال میں انجمن نے کوئی نمایاں کام نہیں کیا صرف انتظامی جلسوں پر اس کو قناعت کرنی پڑی آغاز ۱۳۳۶ف سے انجمن کی زندگی کا جدید دور شروع ہوا اور مولوی قادر محی الدین صاحب بی۔اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ جگتیال کی رہنمائی سے انجمن نے عملی کام شروع کردئے۔ مفید مضامین پر لکچرس اور عملی اسباق کے نمونے ہونے لگے اور صاحب موصوف کے بعد مولوی سید واحد علی صاحب جعفری بی۔اے اول مددگار مدرسہ فوقانیہ کریم نگر کی ان تھک کوششوں سے حالیہ اجلاس کانفرنس اسپورٹس و نمائش تعلیمی کی شکل میں رونما ہوئی بغرض نظر ثانی نصاب تعلیمی مرتبہ کانفرنس صوبہ ورنگل سنہ ۱۳۳۱ف ذیلی مجالس کا انتظام کیا گیا۔ دیسی کھیلوں کا نصاب مرتب ہوا حفظان صحت کی تعلیم کے لئے مولوی واجد علی صاحب صدر مدرس پداپلی سے ایک کتاب مرتب کرائی گئی اور پندرہ موزوں مقامات پر انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں ختم رپورٹ پر کل عہدہ داران و اراکین انجمن و کارپردازان کانفرنس کا شکریہ ادا کیا گیا اس کے بعد ڈاکٹر عبدالملک صاحب سول سرجن ضلع کریم نگر نے اصول حفظان صحت و طبی معائنہ مدارس پر ایک مضمون پڑھا اور مولوی ضمیر عباس صاحب مددگار مدرسہ جگتیال کے مضمون "فطری تعلیم حقیقی تعلیم ہے" پر جلسہ روز اول ختم ہوا۔

روز دوم اجلاس اول (۱۸ اسفندار۔ ۱۱ ساعت)

بھجن اور نظم کے بعد مولوی سید تفضل حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ نتھنی نے مدارس میں موزوں پیشوں کی تعلیم پر نہایت دلچسپ مضمون پڑھا اور بتلادیا کہ پیشہ و ہنر کی تعلیم کا فقدان قوم کے حق میں کس قدر تباہ کن ثابت ہو رہا ہے مولوی غلام احمد خاں صاحب اول تعلقدار نے "جدید طریقہ تعلیم" پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حقیقی تعلیم وہی ہے جس کا تعلیمی طریقہ صحیح ہو یہی وجہ ہے کہ غیر اصولی تعلیم و تربیت سے بچوں کے

قوائے دماغی تباہ ہوئے جاتے ہیں اور دینی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر بچوں کو دینی معلومات صحیح طور پر بہم نہ پہونچائے جائیں تو وہ بدچلن دوستوں کے میل جول سے تباہ ہوجائیں گے۔ اس کے بعد مولوی شمس الدین احمد صاحب مہتمم تعلیمات نے کھیل اور تعلیم پر تقریر کرتے ہوئے اس امر کو ثابت کیا کہ بچوں کی ترقی تعلیم و تربیت اسی کھیل ہی میں مضمر ہے

روز دوم اجلاس دوم (۱۸ اسفندار وقت سہ پہر)

نظم خوانی کے بعد مولوی اعظم صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کورٹلہ نے "پراجکٹ متھڈ" پر مضمون سنایا اور مولوی قادر محی الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ جگتیال نے ہندوستان کی قدرتی تقسیم پر جغرافیہ کا عملی سبق دے کر اس میتھڈ کی توضیح کی جس سے جدید طریقہ تعلیم کے متعلق حاضرین کے خیالات میں خاص تبدیلی پیدا ہوئی۔

روز سوم اجلاس اول (۱۹ اسفندار۔ ۱۱ ساعت

جلسہ کی کارروائی نظم خوانی سے شروع ہوئی اور مولوی سید جعفر علی صاحب صادق نے صنعت توشیح میں ایک قصیدہ حضرت اقدس و اعلیٰ کی مدح میں پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی صدر مہتمم تعلیمات نے جناب صدر نشین صاحب اوران عہدہ داران مقامی و دیگر معزز حاضرین کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے انعقاد کانفرنس میں اپنی مالی امداد و ہمدردی کا ثبوت دیا اور حضرات مدرسین سے مخاطبت کرکے اس امر کا اطمینان دلایا کہ سررشتہ تعلیمات مدرسین کی مالی مشکلات کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس کے بعد رام کشن رائو صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی ناظر مدارس جگتیال نے "خاموش پڑھائی" پر انگریزی طلبا ر سکنڈ فارم کو عملی سبق دیا اور "پراجکٹ متھڈ" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نیز مولوی اعزاز الدین صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ سرسلہ نے "اخلاقی تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا۔ اجلاس کانفرنس کے کل امور طے ہوچکنے کے بعد مولوی میر باسط علی خانصاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا ناظم عدالت ضلع نے باجازت صدر نشین صاحب ایک تقریر کی جس

صاحب موصوف نے تعلیمی معاملات میں پبلک کی عدم دلچسپی کو ظاہر کرتے ہوئے بورڈنگ ہوز کی عدم موجودگی کے متعلق اظہار تاسف کیا اور پبلک سے اپیل کی کہ بلا امداد سرکار ایک بورڈنگ ہوز کے قیام کی فکر کریں جس میں قوم کے ہونہار طلباء اطمینان کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں۔

روز سوم اجلاس دوم (۱۹؍اسفندار۔ وقت سہ پہر)

حسب تفصیل ذیل رزولیوشن بعد بحث و مباحثہ پیش ہوئے اور بغلبہ آرا منظور ہوئے

(۱) "چونکہ موجودہ نصاب طبقہ نسواں اپنے مقاصد کے حصول میں ہر طرح ناکام ثابت ہوا ہے اس لئے مدارس نسوان کی ضروریات کے لحاظ سے علیحدہ نصاب مرتب ہونا چاہئے"۔

(۲) "مدارس میں دیسی کھیلوں کو رائج کیا جائے اور ان کا نصاب بھی مرتب کیا جائے۔

(۳) "دیہاتی مدارس میں مبادیات زراعت و باغبانی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

آخری اجلاس (۲۰؍اسفندار۔ ۱۰ بجے صبح)

اس اجلاس کا آغاز دس بجے صبح کو ہوا مولوی غلام احمد خاں صاحب تعلقدار ضلع نے بحیثیت میر مجلس استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے جناب صدر نشین صاحب اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور آخر میں اعلیحضرت اقدس و صاحبزادگان بلند اقبال و صاحبزادیاں والا تبار کی ترقی عمر و اقبال کی دعا مانگی اس کے بعد جناب صدر نشین صاحب نے اختتامی تقریر کی اور مولوی غلام احمد خاں صاحب تعلقدار ضلع کی تقریر پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ صاحب ممدوح نے تحتانی تعلیم کے لئے معلمات کو مدرسین سے زیادہ سود مند بتایا ہے ممالک مغربی میں یہ بات نہایت آسان ہے لیکن ہمارا ملک ابھی اس قابل نہیں ہے یہاں خود مدارس نسواں کے لئے معلمات کا قحط ہے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی موجودہ تعلقات کو بہتر بنایا جائے اور خواتین کو حصول تعلیم میں کچھ زیادہ آزادی دی جائے

تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ صرف خانہ داری کی تعلیم سے وہ اچھی مائیں یا دایہ بن سکتی ہیں۔
جناب مہتمم صاحب تعلیمات کریم نگر کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا "میں مقامی
عہدہ داروں کو تعلیمی کانفرنس میں حصہ لیتے دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوا۔ مجھے اب تک کسی
جگہ مقامی عہدہ داران کو تعلیمی معاملات میں حصہ لیتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا
عہدہ داران مقامی کا سررشتہ تعلیمات کے ساتھ یہ اتحاد عمل ضلع کریم نگر کے ساتھ
مخصوص نظر آتا ہے" حفظان صحت پر خاص کتابیں نصاب میں داخل کئے جانے کے متعلق فرمایا
"مدرسین کو چاہئے کہ وہ حفظان صحت پر اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں پڑھ کر نوٹ لکھوا دیا کریں نصاب
میں کسی خاص کتاب کا داخل کرنا حفظان صحت کے وسیع دائرہ کو محدود کرنا اور ان پر ظلم کرنا ہے"
جناب ڈاکٹر عبدالملک صاحب کے حفظان صحت والے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے
فرمایا کہ "یہاں رقبہ کے لحاظ سے آبادی کی کثرت اور ملک کے محدود ذرائع معاش ملک کی
عام تباہی اور امراض کا باعث ہیں پبلک کو حفظان صحت کے مسائل پر خود غور کرنا چاہئے"۔
جناب اعزازالدین صاحب نے نصاب تعلیم میں اخلاق پر کوئی کتاب نہ ہونے کی شکایت
کی تھی اس پر آپ نے فرمایا کہ "مدرسہ گھر اور بیرونی بداخلاقی کی مسموم فضا کو ٹھیک کئے بغیر کوئی
اخلاقی کتاب کسی شخص کے اخلاق کی اصلاح نہیں کر سکتی نیک صحبت بہترین کتاب ہوتی ہے"
دیسی کھیلوں کے ترویج دینے کو پسند فرمایا اور کہا کہ ان کھیلوں میں حصہ لینے سے انسان میں
حفاظت خود اختیاری کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ جناب ناظم صاحب عدالت ضلع کے
قیام بورڈنگ ہوز کے متعلق تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "حکومت نے تحتانی تعلیم کو
مفت کر کے کافی بار اٹھایا ہے حکومت اس وقت اس بار کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ وسیع پیمانہ پر
دارالاقامہ جات کا انتظام کرے اگر پبلک کی مالی حالت درست ہو تو وہ خود دارالاقامہ جات کا
انتظام کرے گی" نمائش کے سامان پر بے حد خوشنودی کا اظہار فرمایا اور مقامی عہدہ داران کا
جنھوں نے دریا دلی کے ساتھ مہمان نوازی کی اور کانفرنس کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا تھا

شکریہ ادا کیا۔ شام کے چھ بجے تقسیم انعامات کا جلسہ منعقد ہوا جس کا تفصیلی ذکر گورنمنٹ کی ضمن میں درج کیا گیا ہے معتمد صاحب کانفرنس نے منجانب انجمن صدر محترم کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور اس پر کانفرنس کی کارروائی ختم کی۔

آہ ولایت

آنا تیری دلیل جانے کی ہے۔

دنیا میں روزانہ ہزاروں کتم عدم سے منصۂ شہود پر آتے اور عالم فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ مشیت ایزدی ہے۔ مگر ان ساکنان عالم کی اچانک موت پر افسوس بلکہ سخت افسوس جن کی ذات سے ملک اور قوم کو فائدہ حاصل ہوئے اور مزید فوائد حاصل ہونے کی توقع تھی۔ ایسی فیض رسان ہستیوں کے لقمۂ اجل ہونے پر جس قدر تاسف کیا جائے وہ کم ہے۔ کیونکہ آج قحط الرجال کے زمانہ میں یہ ہستیاں مغتنمات کا حکم رکھتی ہیں۔ چند ہی روز ہوئے کہ ہم ایسی ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی یعنے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم مددگار ناظم تعلیمات و نائب مدیر المعلم کی جوان مرگی پر آنسو بہا چکے ہیں۔ یہ آنسو ابھی سوکھنے بھی نہ پائے تھے کہ گردش لیل و نہار نے ہمیں مولوی سید ولایت علی صاحب مرحوم صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ و مدیر رسالہ ٹیچر کی اچانک موت پر آنسو بہانے پر مجبور کر دیا ہے۔

مرحوم مولوی اکبر صاحب کے مشہور خاندان کے ایک فرد فرید تھے۔ آپ کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ آپ جامعہ عثمانیہ کی پہلی کھیپ کے بی۔اے تھے۔ فراغ تعلیم کے بعد آپ کا ابتدائی تقرر مڈل اسکول بھینسہ کی صدارت پر ہوا جہاں آپ کی عمدہ صفات کی وجہ سے آپ کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کے بیان میں اہالیان تعلقہ مذکور عذب البیان و

رطب اللسان ہیں۔ تقریباً ایک سال کے بعد آپ کا تبدل مڈل اسکول شاہ علی بنڈہ کی صدارت پر ہوا اور یہاں آپ تقریباً چار سال تک مامور بکار رہے ہے۔ اس عرصہ مدت میں آپ نے اپنے حکام۔ مددگاران اور طلبا مدرسہ کو اپنی کارروائی۔ خوش اخلاقی۔ افسرشناسی ماتحت نوازی اور مروت کا گرویدہ کر لیا تھا۔ آپ نہایت منتظم۔ خوش اخلاق۔ خوش مذاق رقیق القلب ملنسار مخیر۔ ہمدرد ملک۔ جوشیلے اور ہونہار جوان تھے۔ آپ کی ان خصوصیات کی وجہ سے آپ کے دوست واحباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ کے ان اوصاف کا نقشہ ان کے دلوں پر اس طرح مرتسم ہوا ہے کہ وہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی آپ کی اچانک موت کی جان گسل خبر سنتا ہے تو اس کو اپنے ایک عزیز کے انتقال سے زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔

مرحوم کو زبان اردو پر خاصہ عبور تھا۔ اسی لئے رسالہ ٹیچر کے ارباب حل وعقد کی نکتہ سنج نگاہ نے آپ کو رسالۂ مذکور کے حصہ اردو کا مدیر منتخب کیا تھا۔ اس کام کو آپ نے جس کاوش اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ ناظرین پر روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے۔ آپ کی اچھی اردو دانی کا اس امر سے بھی بین ثبوت ملتا ہے کہ آپ نے جماعت چہارم و پنجم کے لئے دو کتابیں تالیف کیں جن میں آپ کے مضامین بھی قابل قدر ہیں اور یہ کتابیں برائے منظوری ٹکسٹ بک کمیٹی میں پیش ہیں۔

مرحوم کو اسکاؤٹنگ کی تحریک سے بیحد دلچسپی تھی اور اس کے امتحان میں آپ بدرجہ اول کامیاب تھے آپ نے اس موضوع پر تین کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ پبلک جب آپ کے اس کام سے روشناس ہوگی تو اس کو معلوم ہوگا کہ مرحوم کو نہ صرف اس تحریک سے غایت درجہ ہمدردی تھی بلکہ اس پر خاصہ عبور تھا۔

مرحوم تعطیلات سرما میں ٹینس ٹورنمنٹ میں شرکت اور سیر و تفریح کی غرض سے اورنگ آباد گئے تھے۔ تین چار روز تک مختلف کھیلوں میں حصہ لینے کے بعد آپ بعارضہ

نمونیا مبتلا ہو کر اسی حالت میں بلدہ آئے اور جنرل ہسپتال افضل گنج میں رجوع کئے گئے یہاں آپ کا علاج نہایت دماغ سوزی۔ ہمدردی اور فراخ دلی سے کیا گیا۔ اس اثنا میں آپ کے اعزا اور احبا بیمار پرسی کے لئے جوق در جوق آتے اور بطیب خاطر گھنٹوں آپ کی تیمار داری میں مصروف رہتے۔ گو آپ کے علاج اور تیمار داری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا مگر بمصداق مصرع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

آٹھویں اسفندار کو شام کے ٹھیک ساڑھے چھ بجے آپ نے اپنے اعزا و احباب کو داغ مفارقت دیکر داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ آمین۔

غلام دستگیر فاروقی

افتتاحیہ

مولوی ولایت علی مرحوم ملک میں یہ خبر نہایت افسوس و حسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ حیدرآباد ٹیچر کے سرگرم کارکن و اڈیٹر مولوی سید ولایت علی صاحب بی۔ اے نے عین عنفوان شباب میں بتاریخ ۵ ہر اسفندار ۱۳۵۴ ف ایک ہفتہ کی علالت کے بعد اپنے احباب و اعزاء کو دائمی داغ مفارقت دے کر سفر آخرت اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم گوناگوں دلچسپیوں کے نوجوان تھے۔ ادبی ذوق سلیم کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور سماجی تفریحوں کے دلدادہ تھے۔ اسکوٹنگ سے آپ کو غیر معمولی تعلق تھا اور کام کے تقدس پر مرتے دم تک ایمان رہا۔ خوش خلق و ہنس مکھ "ولایت" کی کمی ہر جگہ محسوس کی جارہی ہے لیکن ہمارے رسالہ کو مرحوم کی بیوقت موت سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی آسانی سے ممکن نہیں ہے۔

بائنڈاُون تی کلب مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج حیدرآباد آج کل پیشہ وری تعلیم کے چرچے ہر طرف ہو رہے ہیں لیکن ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم نے پیشوں کے مسئلہ کو دشوار بنادیا ہے۔ عام طور پر بعض پیشے ذلیل اور بعض شریف سمجھے جاتے ہیں حالانکہ کسی پیشہ کو کسی پر فوقیت نہیں۔ مسلمان قوم اس غلط ذہنیت عامہ کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں لیکن بے سود۔ در اصل اگر کسی تحریک کو بار آور کرانا مقصود ہے تو ابتدا بچوں سے ہونا ضروری ہے یہاں اساتذہ اور صدر مدرسین کی اہم ذمہ داریاں شروع ہوتی ہیں "صدر مدرس بہت سی مفید تحریکات کی تخم ریزی کر سکتا ہے" اور اسی تخم ریزی پر فصل کا دار و مدار ہے ہندوستانیوں میں ایک بڑا نقص (جس سے مدرسین مستثنیٰ نہیں ہیں) یہ ہے کہ جب وہ

کسی کام یا اصول کو اچھا سمجھتے ہیں تو یہی پہل کرنے میں پس و پیش کرتے رہتے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج حیدرآباد کے قابل صدر مدرس نے پیشہ وری تعلیم کی ترویج کی طرف پہلا قدم بڑھایا ہے۔ سید تجمل حسین صاحب بی اے عالم باعمل ہیں اور ان چند باہمت لوگوں میں سے ہیں جو کسی نیک کام کی ابتدا کرنے میں دوسروں کا منہ نہیں دیکھتے آپ کی توجہ و ترغیب سے طلبار مدرسہ کا ایک چھوٹا سا ٹی کلب قائم ہوا ہے جس کا انتظام بالکل طلبا کے ہاتھ میں ہے۔ جس عمدگی اور سلیقہ سے بچے اپنے کلب کا کام انجام دیتے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس طریقۂ عمل سے نہ صرف بچوں کو تجارت، امداد باہمی انتظام، خود اعتمادی اور معاملہ فہمی کی تعلیم ہوگی بلکہ ان کے ننھے دلوں سے پیشوں کی ذلت آفرینی کا غلط خیال نکل جائے گا اور یہی بچے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر پیشے اختیار کرنے میں عار نہ سمجھیں گے۔

سیاڈوتھ انڈین ٹیچرز یونین کی تعلیمی کانفرنس ویلور ذوالقرنین کا قول ہے کہ" استاد کا رتبہ بڑا ہے کیونکہ ماں باپ تو صرف جسم کی پرورش کرتے ہیں اور استاد روح کی تربیت و ارتقار کا ذمہ دار ہے" سکندر کے ہمزبان تو دنیا کے تمام لوگ ہیں اور ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ استاد کی ذمہ داریاں نہایت اہم ہیں اور دنیا کی قومیں اپنی ترقی و فروغ کے لئے معلمین کی محنت و توجہ کی رہین احسان ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ مدرسین" بیچارے نہایت ہی مسکین، جفاکش مزدور ہیں جن کی حالت بہت قابل رحم ہے ان کے لباس اور چہرے سے لاپروائی اور غربت ٹپکتی ہے" یہ حلیہ ہے اس طبقہ کا جس کی برتری میں کسی کو کلام نہیں جس کی فیض گستری کا منت کش سارا عالم ہے۔ پہلے زمانہ میں ناانصافی اتنی اذیت دہ نہ تھی کیونکہ مدرسی ان لوگوں کے لئے مخصوص تھی جو آزمائشوں میں گھٹیا درجہ کے ثابت ہوتے تھے، مگر فی زمانا جب کہ سررشتہ تعلیمات کو معلمی کے لئے اعلیٰ ذہنیت اعلیٰ قابلیت اور اعلیٰ اسناد کی تلاش ہے" یہ ناقدری اور کس مپرسی

روح فرسا ہے

زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا اور نہ زمانہ والے۔ مصائب کے تھپیڑے خاطر خواہ محرک بن جاتے ہیں اور پریشانیوں اور صعوبتوں کے ہجوم میں فلاح و فراغ کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مدرسین کی بےچپرزی اور تہی مائیگی بھی آخرکار تازیانہ بن گئی اور ان کو اپنی خستہ حالی کا احساس پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں تعلیمی انجمنیں قائم ہو گئیں جن کا منشا، نہ صرف تعلیمی مسائل کا حل وعقد ہے، نہ صرف معلم اور معلم کے مابین تبادلہ خیالات اور قیام اخوت ہے بلکہ سب سے بڑا اور ضروری مقصد اپنی سقیم حالت پر نوحہ خوانی کرنا ہے۔

ساؤتھ انڈین ٹیچرز یونین (انجمن اساتذہ ہند جنوبی) کی سالانہ کانفرنس میں موخرالذکر مقصد نہایت نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ صدر نشین ایم۔ ایس۔ سدر شیو آئیر صاحب ایم اے نے اپنے خطبہ میں دراصل اس عام بےچینی کی ترجمانی کی ہے جو حلقہ معلمین میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ تنخواہ کا مسئلہ ہمیشہ پیچیدہ اور الجھا ہوا رہے گا لیکن مدرسین کی تنخواہ کا مسئلہ حقیقتہً قابل توجہ ہے۔ گزشتہ چند سال میں کئی کانفرنسیں ہوئیں لیکن اس طبقہ کی زار نالی کا کچھ اثر نہ ہوا ستم یہ ہے کہ صوبہ مدراس کے ڈپٹی انسپکٹروں اور مددگاران مدرسہ کی یافت کم کردی گئی۔ یہ پالیسی بالخصوص اس وجہ سے اور بھی قابل اعتراض ہے کہ گورنمنٹ کے طرز عمل کا اثر دوسرے قسم کے مدارس پر پڑتا ہے۔ سرکاری ملازم تو پھر بھی کچھ اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن لوکل فنڈ و خانگی مدارس کے معلمین کی زندگی وبال ہے تنخواہ کم دوسرے ذرائع آمدنی تقریباً صفر اور موسمی تعطیلات کے وقت علیحدگی کا خرخشہ غریبوں کی روح تحلیل کئے رہتا ہے۔

اپنی کس مپرسی اور ناکام حقوق طلبیوں کی کشاکش میں بھی اساتذہ اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے اگر صاحب کو رنج ہے کہ "ہم زیادہ کام نہ کر سکے" لیکن ناکامیوں کا سبب تنگ حوصلگی نہیں بلکہ تنگدستی ہے

پر سچ ہے کہ "ابھی بہت کچھ تبلیغی کام کرنا ہے" لیکن تبلیغی کاموں کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے
اگر کچھ اور چندہ جمع ہو جائے تو البتہ "انجمن" اپنے نمایندوں کو بڑے بڑے اضلاع کے
جلسوں میں بھیجکر ان کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کر سکے گی اور اساتذہ کی رائے کو
تعلیمی معاملات میں موثر بنا دے گی"۔ یہی کافی نہیں بلکہ ہمیں دوسرے صوبوں کی اسی قسم کی
انجمنوں سے رشتہ بندی کرنا چاہیئے ہمیں یورپ و امریکہ کی انجمن ہائے اساتذہ سے
روابط پیدا کرنے کی ضرورت ہے نہ صرف یہ جاننے کے لئے کہ پیشے کی وقعت بڑھانے
اور اساتذہ کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے وہ کیا طریقے اختیار کر رہے بلکہ یہ معلوم
کرنے کے لئے کہ وہ کیا تجربات و تحقیقات کر رہے ہیں تاکہ ہم بھی ان کی طرح بچوں اور
نوجوانوں کی تعلیم کی اہم جدوجہد میں حصہ لے سکیں"۔

ہمیں صدر کانفرنس کی رائے سے پورا اتفاق ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ
اس مفید مشورہ پر عمل کر کے مقامی انجمنیں بہت جلد متحد ہو جائیں گی اور اجتماعی حیات میں
ایسی قوت و استواری پیدا کریں گی جو تمام مشکلات کا مقابلہ کر سکے گی اور مسلمانہ زندگی کو
باوقعت، فارغ البال اور مفید قوم و ملک بنا دے گی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مدراس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۲۶
و ۲۷ و ۲۸ ڈسمبر ۱۹۲۷ء کو مدراس میں منعقد ہوئے۔ اس مرتبہ کانفرنس کو تین شعبوں میں
تقسیم کیا گیا تھا۔ عام جلسوں کے صدر لاہور کے مشہور بیرسٹر شیخ عبدالقادر صاحب تھے
لیکن شعبہ اصلاح معاشرت و تعلیم نسواں کی صدارت ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب ایم اے
ایل ایل ڈی جج ہائیکورٹ الہ آباد کے سپرد ہوئی اور اردو کانفرنس کی صدر نشینی کے لئے
قرعہ فال علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کے نام نکلا۔

صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنے ایڈریس میں صوبہ مدراس کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے
متعلق فرمایا کہ "۴۲ لاکھ کی مردم شماری میں سے ۱۹۲۵ و ۲۶ء میں دونوں صنف کے ۲۲۵۰۰

طلباء و طالبات تھے ان میں سے ۳۰۰۰، ۱۷ طلبا، مسلمانوں کے مخصوص مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ مسلمانوں کے مخصوص مدارس زیادہ تر ابتدائی مدارس ہیں جن میں عربی یا اردو یا دونوں قسم کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ اگرچہ ابتدائی مدارس میں مسلمان طلبار کا اوسط فی صدی ۹۵ ہے مگر ثانوی مدارس میں یہ اوسط گھٹ کر ہ فی صدی رہ جاتا ہے اور پیشوں کی تعلیم کے کالجوں میں یہ اوسط ایک فیصدی ہو جاتا ہے" ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت بالکل ناقابل اطمینان ہے، اور ان کو نہ صرف اپنے تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھانا ہے بلکہ ابتدائی مدارس کی تعلیم کا انداز بدلنے اور ثانوی مدارس اور پیشہ وری کالجوں میں مسلمان طلبار کی تعداد میں اضافہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

ان حالات کا لحاظ کرتے ہوئے شیخ سر عبد القادر صاحب نے اپنے خطبہ میں جو باتیں بیان کی ہیں وہ سب مسلم حیات کی تجدید و ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ فنی تعلیم اور زرعی نصاب کی اہمیت آج ہر ہندوستانی تسلیم کرتا ہے۔ مروجہ نصاب کی خامی اچھی طرح ظاہر ہو گئی اور ہندوستان نظام تعلیم کی ترمیم کے لئے بیچین ہے۔ مسلمانوں کو دوسری قوموں سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ بڑھتی ہوئی بیکاری کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ" ایسی تعلیم پر قناعت نہ کریں جو سی نوشت و خواند اور عام واقفیت کے ایک معمولی درجہ کی تحصیل پر ختم ہو جاتی ہے بلکہ اپنے نصاب کو اس طرح بدلیں کہ طلبا، اپنی روزی آپ کمانے کے قابل ہو جائیں خواہ انہیں سرکاری نوکری ملے یا نہ ملے" یہ ترمیم و تبدیلی اس طرح ہو کہ" طلبا ایسی طرز زندگی اختیار کریں جو ان کے گرد و پیش کے حالات کے لئے مناسب ہو۔ اگر وہ زراعت پیشہ لوگوں میں سے ہیں تو انہیں لکھائی پڑھائی اور حساب کے ساتھ زراعت کی تعلیم اصولی و عملی دونوں دی جائے۔ اگر وہ شہری باشندے ہیں تو صنعت و حرفت سے انہیں بہرہ ور کیا جائے"

تعلیم بالغان کی ضرورت ہندوستان میں دوسرے ملکوں سے زیادہ ہے یہاں

آبادی کا بڑا حصہ افلاس و تنگدستی کا شکار ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اچھی طرح ہوش بھی نہیں سنبھالے پاتے کہ کسب معاش کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ یہاں جبری تعلیم نہیں ہے ان بدنصیبوں کے لئے تعلیم کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ مدارس کے تعلیمی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بچے ابتدائی تعلیم کے بعد مدارس کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور ۹۰ فی صدی سے کچھ زیادہ بچے عربی حروف تہجی اور چند پاروں کے سوا تعلیم سے معری رہتے ہیں۔ اس لئے اُن کو بڑے ہونے کے بعد حصول تعلیم کا موقعہ دینا نہایت ضروری ہے۔ اسلامی انجمنوں کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف بچوں کی تعلیم پر وقت، روپیہ اور توجہ صرف کریں بلکہ زیادہ عمر والے لوگوں کو بھی زیور علم سے آراستہ کرنے کی سعی کریں۔ ڈنمارک اور پنجاب کی مثالوں نے ثابت کر دیا ہے کہ تعلیم بالغاں حد درجہ مفید و ضروری ہے۔

معزز صدر نشین کے نزدیک آج کل "جس تعلیم کا ہماری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم نام رکھا جاتا ہے وہ صرف طفل تسلی ہے"۔ ہمارے خیال میں اس قسم کی تعلیم کو "مسلم تسلی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مدارس میں مذہبی تعلیم جیسی ہوتی ہے (یعنی جہاں جہاں ہوتی ہے) ظاہر ہے اور جیسی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے۔ مذہبی تعلیم جیسی یا جتنی بھی ہو کافی نہیں ہو سکتی۔ مدارس میں فی زماننا وہ مذہبی فضا پیدا نہیں ہو سکتی جس کی ضرورت ہے "جس سے صحیح مذہبی تخیل بچوں کے اندر پیدا ہوتا اور مذہب ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کرتا کہ ان کی روزمرہ زندگی کے تار و پود کا جزو بن جاتا" موجودہ زمانہ میں مسلم والدین کا ہمیشہ سے زیادہ فرض ہے کہ وہ مدارس کی مذہبی تعلیم پر اکتفا نہ کریں، نہ گھر پر ہی احکام شرعیہ کی تلقین کافی سمجھیں بلکہ اپنی روزمرہ حیات میں ایسی تبدیلی پیدا کریں اور دینداری اور مکارم اخلاق کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ بچوں کے دلوں میں اوائل عمر ہی سے اسلام کی خوبیاں اور فرائض و سنن کا احترام راسخ ہو جائے۔

مسلمانوں کی ناداری کا تقاضا ہے کہ غریب بچوں کی فیس و امدادی وظائف کا انتظام کیا جائے۔ سرکاری معافیاں اور وظائف ناکافی ہیں۔ قوم ایسی دولتمند نہیں کہ ضروری سرمایہ اکٹھا کر سکے۔ ان مشکلات کے مدنظر شیخ صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے وہ حادرجہ مفید ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ جو حضرات بنک کے روپیہ کے منافع سے خود متمتع نہیں ہوتے ان کو اس میں کچھ پس وپیش نہ ہوگا اس روپیہ سے غریب طلبا کی حاجت براری ہو۔

اصلاح معاشرت کا شعبہ اس کانفرنس کی امتیازی خصوصیت تھی۔

معاشرتی خرابیاں ہماری زندگی میں ایسی مضبوطی سے پیوست ہوگئی ہیں کہ کسی قسم کی اصلاح کے نام سے دل کانپ اٹھتا ہے لیکن خرابی خرابی ہے اور خواہ وہ کتنی ہی قدیم اور عام کیوں نہ ہو اس کا دور کرنا ہی بہتر ہے اس شعبہ کے قابل احترام صدر نے اپنے عالمانہ خطبہ میں ہماری تمام معاشرتی خرابیوں، بدعتوں اور اخلاقی بداطواریوں کو ان کی کریہ شکلوں میں سب کے سامنے پیش کر دیا اور شادی بیاہ کے رسوم ورواج، طلاق، زچہ بچہ کی نگرانی، مسلمانوں کا اسراف، عورتوں کی کاہلی، خیرات کے مذموم طریقوں کی حقیقت وابتداء اور دوسرے اقتصادی، خانگی، اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈال کر یہ بھی بتا دیا کہ علاج کی کیسا صورتیں ہیں۔ تعلیم نسواں کے ضمن میں پردہ کے سوال کو ڈاکٹر صاحب نے تشنہ چھوڑ دیا ہمارے نزدیک اس متنازعہ فیہ مسئلہ کا تصفیہ جس قدر جلد ہو جائے اچھا ہے۔ پردے کے خلاف ساری دنیائے اسلام میں سخت جدوجہد ہو رہی ہے۔ گو ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان اس معاملہ میں یورپ کی کورانہ تقلید نہ کرے گا لیکن اسلامی پردہ کی ضرور کوشش ہوگی جب ماہرینِ تعلیم کی رائے ہے کہ پردہ (یعنی وہ غیر اسلامی پردہ جو ہندوستان میں رائج ہے) تعلیم میں سدراہ ہے، جب اطباء و حکماء کا فیصلہ ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں بند رہنے سے نہ صرف عورتوں کی صحت خراب ہوتی ہے بلکہ آئندہ نسلوں پر مضر اثر پڑتا ہے، جب اسلام ایک خاص حد تک ترک پردہ کی اجازت دیتا ہے تو مناسب ہے کہ اس اہم سوال کا

کچھ نہ کچھ تصفیہ جلد ہو جائے۔ اکثر صاحبان رائے نے ذاتی طور پر تصفیہ کر بھی لیا ہے لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کے لئے کوئی آمادہ نظر نہیں آتا۔ یہ زمانہ نہ تو شخصی حکومتوں کا ہے اور نہ پیٹر اعظم کا نادرشاہی طریقۂ عمل ممکن ہے۔ ہمارے لئے بقول ڈاکٹر صاحب" پرانے اوارات کو خیرباد کہنے سے زیادہ موثر تدریجی ترقی کا طرز عمل ہے جو آہستہ مگر یقینی ہے" اس لئے بہتر ہوگا کہ ہندوستان کے علمار کرام اور اکابر قوم یہ طے کرلیں کہ پردہ کس حد تک مذہبًا ضروری ہے اور کس حد تک اسے ترک کیا جاسکتا ہے اور جو کچھ طے ہو اس پر تمام مسلمان دیانت داری سے عمل کریں اس کے بعد بھی بعض حضرات کو عذر ہوگا کہ موجودہ پشت کی عورتیں بے پردہ نکلنے پر تیار نہ ہوں گی یہ بالکل قرین عقل ہے لیکن ہم تو قطعی فیصلہ کر کے راستہ صاف کر دیں اولاً تو خود عورتوں میں بیچینی پیدا ہو گئی ہے اور ان کی انجمنیں اپنے حقوق و مفاد کے لئے کوشاں ہیں ہمارا فیصلہ ان کے لئے سہولت کا باعث ہوگا۔ ثانیاً اگر موجودہ پشت اس آزادی سے فائدہ نہ اٹھائے تو کم از کم نئی پود کو ابھی سے اس کا عادی بنایا جا سکتا ہے۔

تحریکات کانفرنس میں سے جو تحریکیں تعلیم موپلہ اور تعلیم معلمات سے متعلق ہیں وہ واقعی قابل قدر ہیں۔ قوم موپلہ جو صوبہ مدراس میں کافی تعداد میں ہے تعلیمی نقطۂ نگاہ سے نہایت پست ہے اور سخت ضرورت ہے کہ ان کی تعلیمی حالت درست بنانے کی زبردست کوشش کی جائے۔ مدراس میں معلمات کی قلت ثانوی تعلیم نسواں کی ترقی میں مانع ہے۔ اس لئے یہ تحریک قابل لحاظ ہے کہ ثانوی معلمات کی تعلیم کے لئے انتظام ہو۔ چونکہ وہ مدارس جن میں اس انتظام کی خواہش کی گئی ہے لوور پرائمری معلمات کو تیار کرتے ہیں اس لئے گورنمنٹ کے لئے کچھ مشکل نہ ہوگا کہ ان مدارس میں ثانوی معلمات کی تعلیم کا بندوبست کردے

جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ عثمانیہ میں عالیجناب مہاراجہ بتاریخ ۲۶ ہردے ۱۳۳۷ف مطابق غرہ دسمبر ۱۹۲۷ء سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر صدر اعظم دامپر جامعہ کا خطبۂ صدارت عثمانیہ یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا

عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی و امیر جامعہ نے اس شاندار موقعہ پر نہایت جامع اور محققانہ خطبہ ارشاد فرمایا جو مفید معلومات اور قیمتی ملفوظات سے مملو ہے۔ تعلیمی مسائل کا امیر نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ یورپ کے جدید تریں انکشافات، ماہرین فن کے تجارت علمیہ اور ہمارے ملک کی اہم ضروریات کا توازن و تقابل کرنے کے بعد جن خیالات کو ظاہر کیا گیا ہے وہ موجودہ نظام تعلیم کی نظر ثانی میں مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ دور حاضرہ کے معاشی اور اقتصادی حالات اپنی گریز پا ترقی اور تبدیلی کے باعث اس قدر مختلف ہوگئے ہیں کہ ہمارا تعلیمی مقصد بالکل بدل گیا ہے۔" ہمیں ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو ذہنی نشو و نما کے ساتھ معاشی اور اقتصادی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرے۔" امیر جامعہ نے جن کی جلیل القدر ہستی علوم و فنون کے لئے مائہ ناز ہے اپنے عالمانہ خطبہ میں ہمارے مقصد تعلیم کے متعلق فرمایا "طلباء کے اس جوہر قابل کا اُبھارنا یا سنوارنا ہے جس سے ذہنی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ خصوصیات قومی روایات اور انفرادی مذاق و رجحان برقرار رہیں تاکہ ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق زندگی کے علمی و عملی شعبہ میں حصہ لے سکے"۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس مقصد کے تحت ہمارا موجودہ نظام تعلیم کہاں تک ہماری ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مروجہ نصاب تعلیم ایک حد تک ذہنی اور اخلاقی نشو و نما میں ممد و معاون ہے مگر ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "مقررہ نصاب کی تکمیل اور حصول اسناد کی حد تک ہمارے طیلسانین کی مساعی محدود ہیں۔ وہ وسیع پرور ماحول جس کی فضا میں تحقیق و تنقید و تالیف و تصنیف اور عالی مذاقی کی پرورش ہو ابھی ہمیں نصیب نہیں ہوا" بلکہ ابھی فقط تحصیل اسناد کا شوق اور دھن ہے اور ملازمت ہی کسب معاش کا واحد ذریعہ سمجھی جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں ہم کو کسی اور کام کے قابل بناتی بھی نہیں۔ اس سے روز بروز شائستہ نوجوانوں کی بیکاری بڑھتی جارہی ہے اور سیاسی اور معاشی بیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں

اس بلائے برم کا صرف ایک علاج ہے۔ اور مہاراجہ بہادر نے تیر بہدف نسخہ تجویز کردیا کہ "ملک میں زرعی و صنعتی ترقی کے قدرتی اسباب موجود ہیں۔ اُن سے فائدہ اُٹھانے کیلئے جامعہ میں شعبہ زراعت کا قیام بھی مناسب ہوگا۔ شعبہ زراعت کے ساتھ ایک معمل کی بھی ضرورت ہوگی جہاں ملک کے زرعی پیدوار کے کثیر پیمانہ پر حاصل کرسکنے کے اسباب معلوم ہوں۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ جامعہ کے طیلسانین کافی تعداد میں یورپ یا امریکہ جاکر زرعی کیمیا کی تعلیم حاصل کریں"

حیدرآباد میں مڈل، میاٹرک اور ایف اے پاس مدرسین کی ٹرننگ کا انتظام ہے لیکن ابھی بی ٹی کی تعلیم کا کچھ بندوبست نہیں۔ مہاراجہ بہادر نے سررشتہ تعلیم کی دشواریوں کا لحاظ کرتے ہوئے جو مدرسین کو بیرون ممالک محروسہ بھیجنے میں پیش آتی ہیں، سفارش فرمائی کہ جامعہ میں ایسا شعبۂ تعلیم قائم کیا جائے جو بی ٹی اور ایم ٹی کی تعلیم دے سکے۔ جامعہ میں انگریزی کے علاوہ جرمن اور فرنچ زبان کی تعلیم پر بھی مہاراجہ بہادر نے زور دیا۔ ہمارے نزدیک اگر السنۂ جدیدہ کی تعلیم شام کے وقت پبلک کو بھی دی جائے تو اس تعلیم کی فائدہ رسانی بہت وسیع ہو جائے گی۔

ممالک محروسہ میں تعلیمی مصارف کا بار کلیتہً سرکار اُٹھاتی ہے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ جب تک کہ قوم سرکار کا ہاتھ نہ بٹائے تعلیمی رفتار لازمی طور سے سست رہے گی اکثر ممالک یورپ میں قوم اپنی نئی پود کی تعلیم کی ذمہ دار ہے اور کثرت سے خانگی مدارس مصروف تعلیم ہیں بڑے بڑے لوگ نہایت فیاضی سے چندوں میں شریک ہوتے ہیں اور وصیت ناموں میں مدارس اور جامعات کو بڑی رقمیں چھوڑ جاتے ہیں دیسی ریاستوں میں خصوصاً حیدرآباد میں حالات برعکس ہیں۔ مہاراجہ بہادر نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "سرکار مصارف کا بار اُٹھانے میں بحد امکان دریغ نہ کرے گی۔ مگر کسی ملک میں علم و عمل کا احیاء صرف حکومت کی یک طرفہ کوشش سے نہیں ہوا۔ یورپ کے جامعات کا

ذکر کیا، برطانوی ہند کے سرکاری جامعات میں بھی ایسے سینکڑوں عطیات و اوقاف ہیں جو علم دوست اور ذی مقدرت اصحاب کی عالی مذاقی کی مستقل یادگار ہیں۔ میں آکسفورڈ اور کیمبرج جیسے بعید از وقوع مقامات تک لے جاکر وہاں کے عطیات سے واقف کرانا نہیں چاہتا، قریب تر کلکتہ ہی کو چلئے کہ جہاں کی یونیورسٹی میں عطایا کے دین کی گونج آپ کے کانوں میں پہونچے بغیر نہیں رہ سکتی، جن میں خاص طور پر کلکتہ یونیورسٹی میں صنعتی تعلیم کے لئے سر راس بہاری گھوش آنجہانی کا شاندار عطیہ قابل اشارہ ہے۔ ان اچھی مثالوں کی تقلید حیدرآباد میں بھی ممکن ہے"

مذہبی تعلیم کا مسئلہ بھی آج کل پیچیدگی اختیار کر رہا ہے اور اس تعلیم کا عملی نتیجہ فرقہ واری مناقشات کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے ہماری مذہبی تعلیم کا مقصد صاف اور واضح ہو جائے۔ مذہبی تعلیم کی ضرورت بتاتے ہوئے اس کے نصب العین اور مقاصد کے بارہ میں امیر جامعہ نے فرمایا:۔

اگر مذہبی تعلیم قومی خصوصیات اور اُن آبائی روایات کے برقرار رکھنے کی محرک ہو جو کسی مذہب و ملت کی روحانی اور مادی ترقی میں کار آمد ہو سکتے ہیں، تو اس تحریک کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا حریف و عنید بنے۔ ہندوستان کی اقتصادی اور سیاسی ترقی اُسی وقت ممکن ہے جب مذہبی اور فرقہ واری تعصب اور تنگ نظری کا خاتمہ ہو جائے۔ مذہبی تعصب اور اُس کے ناعاقبت اندیش نتائج سے ہندوستان جیسے پُر امن ملک میں آئے دن جو فسادات پیدا ہو رہے ہیں، ہندوستانی قومی زندگی کے حق میں خطرناک بلکہ مہلک ہیں۔ افسوس ہے کہ تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش قائدین مذہب کو اپنی ذاتی دلچسپیوں کا آلہ بنا کر قوم کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان کو یہ بھی گوارا نہیں کہ قوم کے وسیع مفہوم کا اطلاق بھی اپنے مذہب کے دائرہ سے باہر غیر مذہب ہم وطنوں پر ہو سکے جس ملک میں قومیت کے یہ معنے ہوں اُس کی فلاح و بہبودی کی اُمید کیسا

کارگر ہونا مشکل ہے۔ عناد اور تعصب کی کجروی کو مذہب کا مسلکِ حقیقی سمجھنے والے لوگ ہمارے اخلاق، ذہنیت اور قومیت کے ارتقاء کے دشمن ہیں۔ یہ وہ جراثیم ہیں جن کے مہلک اثرات کا استیصال ہر روشن خیال پاک مشرب تعلیم یافتہ شخص کا فرض ہے ورنہ اگر اس مہلک وبا کے اثرات خدانخواستہ بڑھ جائیں تو تنازع للبقا میں ہماری کوئی جدوجہد کارگر نہ ہوسکے گی۔

جامعہ عثمانیہ نے بہت بڑا داؤں لگایا ہے اور اس کی جیت ہار بڑی حد تک اس زبان کی علمی دولت پر منحصر ہے جسے جامعہ میں ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے مخالفین کو سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اُردو زبان کے علمی خزانے محدود ہیں لیکن اس قلیل مدت میں جو کام جامعہ نے کر دکھایا ہے اُس نے مخالفین کا منھ بند کر دیا ہے۔ "باایں ہمہ اردو کی جیسی ہمہ گیری اور وسعت ہونی چاہیے وہ نہیں ہوئی۔" دارالترجمہ سے نصابی کتب کے ترجمہ کا جو کچھ بھی کام ہوا یا ہو رہا ہے وہ بھی موجودہ حالات کے اعتبار سے قابلِ تحسین ہے "مگر یہ کافی نہیں ہے۔ امیر جامعہ نے اُردو زبان کی علمی دولت بڑھانے کے لیے دو باتوں کی ضرورت بتائی۔ ایک تو یہ کہ "وہ طیلسانین جن کی ذہنی اور ادبی قابلیتوں کی نشو ونما جامعہ عثمانیہ کی تعلیم سے ہوئی ہے، اپنے اپنے مذاق اور رجحان کی مناسبت سے تصنیف و تالیف میں دلچسپی ظاہر کریں" دوسرے یہ کہ "ایسے علمی رسالوں اور مجلوں کی اشاعت بھی ضروری ہے جو علمی زندگی کے حق میں ممد و معاون ہوں" بحمداللہ کہ اردو زبان کی دونوں ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ ایک طرف تو "جامعہ کے بعض طیلسانین اور طلبا تصنیف و تالیف کے کام میں بذاتِ خود دلچسپی لے رہے ہیں" اور دوسری طرف انجمن ترقی اردو کا رسالہ "سائنس" علم و عمل کا نیا باب کھول دے گا۔

تعلیم نسواں کے متعلق مہاراجہ بہادر نے محض اظہارِ ضرورت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ تعلیم نسواں کی سست رفتاری کے اسباب و علل کا غائر مطالعہ فرمانے کے بعد نسوانی تعلیم کی خصوصیات اور نسوانی نصاب کی ضروریات پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ حیدرآباد میں تعلیم نسواں کے

آغاز و ترقی کا ذکر کرنے کے بعد تعلیمی سست رفتاری کے اسباب اور نسوانی نصاب تعلیم کی نوعیت کے متعلق ارشاد ہوا۔

"تعلیم نسواں کی سست رفتاری کے میری دانست میں دو وجوہ ہیں۔

(۱) ملک میں تعلیم نسواں کی ضرورت کے احساس کا فقدان اور رائے عامہ کی ناواجبی مخالفت۔

(۲) ایک ایسے نصاب تعلیم اور نظامِ تربیت کا نہ ہونا جس میں ہمارے ملک اور قوم کی ذہنی اور معاشرتی خصوصیات کا کافی طور پر لحاظ ہو۔

نسوانی تعلیم میں تعلیم خانہ داری اور فنون لطیفہ کو وسعت دینا چاہئے اور اس کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی سلسلہ رہے۔ خانگی زندگی معاشرت اور تمدن کی پہلی منزل ہے۔ اس میں عورت اور مرد کے حقوق اور اختیارات یکساں نہیں ہیں۔ عورت کو ہر اعتبار سے اس میں فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ تہذیب معاشرت اور تدبیر منزل میں عورت کی ذمہ داری نسبتاً مرد سے زیادہ ہے۔ ہماری معاشرت کی بعض خامیاں اور خرابیاں جو جہل کی تاریکی اور توہمات سے پیدا ہوئی ہیں قابل استیصال ہیں۔ اس کے لئے عورتوں کی ذہنیت اور ترقی بھی لازمی ہے۔ مگر طبقۂ نسواں کی ذہنیت کی تربیت یا اُن کے علمی جمود و سکون کو مٹانے میں نہایت حزم و احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کیونکہ ذہنی تربیت کے ساتھ اُن اعلیٰ حسیات خصوصیات اور روایات کا برقرار رکھنا بھی نہایت ضروری ہے جن سے ہندوستانی نسوانیت کی روح زندہ ہے۔ ہندی خواتین اعلیٰ تعلیم پائیں، ہر شعبہ علم و فن میں مردوں کے برابر رہیں، مگر ساتھ ہی اس کے ہندی نسوانیت کی خصوصیات کو بھی ملحوظِ خاطر رکھیں۔ غیر اقوام کی کورانہ تقلید ہندیوں کی مفلس مشرقی قوم کے حق میں خودکشی ہے۔ عورتیں مردوں سے زیادہ ذکی الحس ہیں اس مناسبت سے اُن کی اعلیٰ قابلیتوں کو سنوارنے کا بہترین ذریعہ فنون لطیفہ کی تعلیم ہے"۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت پر ایک سرسری نظر

از مولوی سید ولایت علی مرحوم

ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد کے اجلاس منعقدہ آذر ۱۳۲۷ف میں ان مسائل میں سے جو پیش کئے گئے تھے۔ اکثر ایسے تھے جن کا ملک کی تعلیمی حالت سے براہ راست تعلق تھا۔ طوالت کے خوف اور اس خیال سے بھی کہ عام تقاریر کانفرنس کی روئداد میں عنقریب شائع ہوں گی۔ ہم صرف خطبہ صدارت کے متعلق چند خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ پر مغز اور مفید معلومات اور دیرینہ تجربہ کی باتوں کے لحاظ سے نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے کنٹب بیرسٹرایٹ لا ہوم سکرٹری کا خطبہ صدارت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ نواب صاحب نے اپنے خطبہ میں ملک کی تعلیمی حالت کا شروع سے لے کر اس وقت تک نہایت دلکش پیرایہ میں صحیح خاکہ کھینچا ہے۔ اور موجودہ ضروریات تعلیمی کی طرف بھی قوم کو توجہ دلانے کی کوشش فرمائی ہے۔

نواب صاحب نے عام اور لازمی تعلیم کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

"یہی سب سے سخت اور کہنہ بیماری ہے جس کا ہر محب وطن اور خیرخواہ قوم کو ہندوستان میں مقابلہ کرنا پڑے گا اور آپ کو جو ریاست حیدرآباد میں تعلیم کی ترویج واشاعت کا مبارک مقصد لے کر کھڑے ہوئے ہیں سب سے پہلے اسی اصول کو طے کرنا پڑے گا کہ ملک میں ابتدائی تعلیم لازمی اور بلالحاظ مذہب وملت عام ہونی چاہیئے یا نہیں اگر آپ کی تعلیمی انجمن واقعی تمام ملک کی اصلاح اور خیر کے واسطے قائم ہوئی ہے اور اگر آپ حقیقت میں قومی تعلیم کے علمبردار اور داعی ہیں تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب آپ کو بلاتاخیر دلیری اور

وضاحت کے ساتھ لازمی اور ہمہ گیر تعلیم کے مذکورہ بالا مقصد کو اپنی فہرست مقاصد میں سب سے اوپر جگہ دینی چاہئے اور تحریر و تقریر۔ افہام و تفہیم اور ترغیب و تشویق کے ہر ذریعہ جائز سے اور ملک کے ہر گروہ اور فرقہ کے اکابر میں اسی عقیدہ کی تبلیغ کرنی چاہئے جب تک ابتدائی تعلیم لازمی اور عام نہ ہو اس وقت تک ہماری نکبت و زبونی میں کمی نہیں آئے گی۔ اگر آپ نے اس مقصد عظمیٰ کے لئے واقعی کمر ہمت باندھ لی اور چند سال کی پیہم اور منتظم کوشش سے ملک کے اکثر متین اور ذی فہم اہل الرائے کو اپنا مؤید بنا لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ سرکار آصفیہ آپ کی اس قومی اور اولوالعزمانہ آرزو بر لانے میں اعانت اور سرپرستی نہ فرمائے۔ حضرات میں پھر دہراتا ہوں اور دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خوش نصیبی سے آپ کو خدائے رحیم نے ایک ایسے فرمانروا کا عہد حکومت دیا ہے جس کی علم نوازی اور معارف پروری دنیا میں ضرب المثل ہوتی جاتی ہے۔ جو ہر قسم کے علمی اور قومی فلاح کے کاموں کا فیاض، سرپرست و مربی ہے اور حیدرآباد کی شہرت و ترقی کی دلی تمنا رکھتا ہے۔ ہماری غفلت مجرمانہ اور ہماری دون ہمتی قابل ماتم ہوگی، اگر ایسے حوصلہ مند اور بیدار مغز بادشاہ کے زمانہ میں بھی علم کی ترویج و ترقی کی تمام ممکن و میسر تدابیر اختیار نہ کریں۔ دوسرے یاد رکھنا چاہئے کہ اگر ہمارا دشوار و بزرگ مقصد پورا نہ ہو تو بھی اس کے لئے جو کوشش اور کاوش کی جائے گی وہ رائیگاں نہ جائے گی اور اس کا کم سے کم فائدہ ضرور ہوگا کہ ترقی تعلیم کی موجودہ رفتار کہیں زیادہ تیز ہو جائیگی اور کیا عجب ہے کہ ہمارا منصوبہ کم از کم دارالملک حیدرآباد میں پوری طرح عمل میں لانے کے قابل سمجھا جانے لگے۔"

اس مبارک مقصد کے متعلق کسی کو اعتراض کی گنجایش نہیں۔ ہر تعلیم یافتہ شخص اس بات کا خواہاں ہے کہ ملک کا کوئی فرد زیور علم سے عاری نہ رہے۔ دوسرا اہم مسئلہ جس پر نواب صاحب موصوف نے اپنے زرین خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ "مسئلہ تعلیم نسواں ہے"

اس کے متعلق نواب صاحب فرماتے ہیں۔

"ممالک ہند میں تعلیم کی ترویج و ترقی میں دو بڑی رکاوٹیں طبقہ اناث کی جہالت اور نیچ ذاتوں کی زبوں حالی ہے۔ اگرچہ ریاست حیدرآباد نے تعلیم نسواں کے معاملہ میں دوسرے علاقوں سے کچھ کم دلچسپی اور روشن خیالی کا ثبوت نہیں دیا لیکن تعلیم نسواں کی کوششوں سے جو نتائج اب تک حاصل ہوئے ہیں وہ بجائے خود بہت ہی ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ہیں۔ مانا کہ گزشتہ تیس برس میں خواندہ عورتوں کی تعداد فی ہزار دو سے بڑھ کر آٹھ فی ہزار ہو گئی لیکن یہ کونسی خوشی کی بات ہو سکتی ہے کہ اب بھی ہمارے ملک کی کم و بیش ۶۰ لاکھ عورتوں میں سے کل پچاس ہزار خواندہ ہیں اور باقی ۵۹ لاکھ سے بھی زیادہ ظلمت جہل میں مبتلا ہیں۔ کم و بیش چار لاکھ لڑکیاں پانچ سال سے پندرہ سال تک کی عمر کی ملک میں ایسی ہیں جن کی تعلیم کا انتظام اصولاً ہونا چاہئے لیکن ۱۳۳۵ف کے اخیر تک تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں ابتدائی ثانوی مدارس کی کل تعداد سات سو چھ سے زیادہ نہ تھی اور ان میں ۳۵۰۶۶ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں یعنے ہر ایک ہزار قابل تعلیم عمر کی لڑکیوں میں سے فقط سات تعلیم پاتی تھیں۔

تعلیم نسواں کے راستے میں جو خاص موانع ہمارے ملک میں سد راہ ہیں اور ان کے متعلق ہمارے جرائد اور مجالس میں سالہا سال سے بحثیں ہو رہی ہیں۔ اس مسئلہ کا تعلق درحقیقت اصلاح رسوم و معاشرت سے زیادہ ہے اور اس تعلیمی مجلس میں اس پر تفصیلی بحث چھیڑنا شاید کسی قدر بے محل ہوگا تاہم تعلیم کی تبلیغ دعوت کے سلسلہ میں آپ کو بھی اُن لا یعنے اوہام اور تعصبات سے جنگ کرنی پڑے گی جو قدیم رواج اور رسم پردہ میں ہماری قوم کے نصف حصہ کو دائماً جہالت میں گرفتار رکھنے کے درپے ہیں۔ تعلیم نسواں کے ان موانع میں سب سے سخت شئے پردہ کی رسم ہے اور چونکہ اس کے

قیام پر سب سے زیادہ ایک خاص طبقہ کو اصرار ہے اس لئے خاص انہیں حضرات کی خدمت میں مختصر طور پر مجھے یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلا مذہب اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کو تمام اسلامی حقوق اور فضائل میں مردوں کا شریک وسہیم بنایا اور انہیں مردوں کی طرح ذمہ دار انسان سمجھ کر ان کے خاص خاص حقوق وفرائض قرار دئے۔ پس یہ کس قدر حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ آج اسی مذہب کے نام نہاد پیرو حقوق نسوان کے معاملہ میں اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں سے زیادہ تاریک خیال اور تنگ دل ثابت کر رہے ہیں۔ یہ بات کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ آج کل مروج ہے اس کا مذہبی عقاید یا شعائر سے کچھ تعلق نہیں۔ بدیہی طور پر اسی ایک دلیل سے ثابت ہے کہ دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں میں پردے کی ایسی شدتیں نہ اب ہیں اور نہ کبھی پہلے گوارا کی گئیں۔

نواب صاحب نے جو موانع اور رکاوٹیں بتلائی ہیں وہ سب کے سب ٹھیک ہیں مگر اس میں ہم صرف اتنی بات اور بڑھانی چاہتے ہیں کہ ملک میں تعلیم نسواں کی طرف سے جو غفلت ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے مدارس میں شریف اور تعلیم یافتہ استانیوں کی بہت کمی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے شرفا اپنی بچیوں کو تعلیم کی خاطر مدارس کو بھجوانے سے رکتے ہیں۔ اگر ایسے ترغیبی ذرائع اختیار کئے جائیں جس سے شریف اور تعلیم یافتہ خواتین اس عقدہ کو حل کرنے کا عزم بالجزم کر لیں تو چند ہی سال کے بعد "تعلیم نسوان" میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سے متعلق اگر ہم ایک تجویز یہاں پیش کر دیں تو نامناسب نہیں۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک کی شریف اور تعلیم یافتہ بیوہ عورتیں اس معاملہ میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتی ہیں ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ملک میں بہت سی شریف اور تعلیم یافتہ بیوہ عورتیں ایسی ہیں جو محنت مزدوری کر کے یا بیکاری میں بنا وقت کاٹ رہی ہیں۔ اگر ایسی خواتین کو تعلیمی مقاصد اور پیشہ مدرسی کی فضیلت سمجھا کر ملک کی

خدمت کے لئے ابھارا جائے تو تمام رکاوٹیں دور ہوسکتی ہیں۔ ایسی خواتین بجائے اپنا وقت بیکاری میں صرف کرنے کے پیشۂ مدرسی کی طرف توجہ کریں تو ہم خرما و ہم ثواب کی مصداق ہوں گی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جس طرح زنانہ ہسپتال کے لئے ملک کی سرآوردہ خواتین کی کمیٹی مقرر کی گئی ہے اگر یہاں کے زنانہ مدارس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے بھی ایک ایسی کمیٹی مقرر ہو تو ایسے لوگ بھی جو لڑکیوں کو مدرسہ بھجوانے میں تامل کرتے ہیں وہ بھی بخوشی اپنی بچوں کو لایق مائیں بنانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

تیسرا اہم مسئلہ جس کے متعلق نواب صاحب موصوف نے اپنے خطبہ میں تذکرہ کیا ہے وہ تعلیم کی نوعیت ہے۔

اس مسئلہ پر ملک کے موجودہ حالات کا خیال کرتے ہوئے بیحد غور و خوض کی ضرورت ہے محض ادبی تعلیم سے کوئی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد طلبا کے رجحان کو دیکھ کر کسی ایک پیشہ کی تعلیم دی جانی ضروری ہے اور چونکہ ہمارے ملک کا عام پیشہ زراعت ہے لہذا زراعت کی ترقی اور ذرائع معاش کو وسعت دینے کے لئے اس امر کی شدید ضرورت ہے زراعتی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

اب رہا مذہبی تعلیم تو اس کے متعلق نواب صاحب موصوف کا یہ خیال قابل غور ہے۔

> "اس منزل (تحتانیہ) میں مذہبی عقائد یا رسوم و شعائر کی تعلیم محض تقلیدی ہوتی ہے اور اس لئے بہتر ہے کہ یہ کام بچوں کے والدین یا خاندان والدین کے ہاتھ میں ہی چھوڑ دیا جائے اور سرکاری سررشتہ تعلیمات ایک عام اخلاقی اور انسانی تعلیم سے بڑھ کر کوئی ذمہ داری نہ لے۔ البتہ اس کے آگے وسطانی منزل میں مذہبی تعلیم کا انتظام ممکن اور مناسب ہے۔ مگر اس میں بھی ہمیں چھوٹے چھوٹے فرقوں کے فروعی اختلاف عقاید کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور تا امکان ہر مذہب کی وہ اخلاقی اور اصولی تعلیم درسی نصاب میں داخل کی جائے گی۔ جس پر اس مذہب کے تمام یا اکثر فرقے اور شاخیں متفق ہیں"

اپنے منشار کی صراحت کے لئے تمثیلاً مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کے مذہبی نصاب میں صرف قرآن حکیم اور اس قسم کی مسلمہ احادیث کی تعلیم ہونی چاہئے جو بہترین اخلاق و تہذیب سکھانے والی ہیں۔ اور جن کا انسانی معاشرت اور عملی زندگی سے تعلق ہے۔ پھر یہ کہ مذہبی تعلیم بھی اس کے اصلی ماخذ سے ہونی چاہئے اور درسی نصاب میں اتنی عربی تعلیم لازم کردینی چاہئے کہ طالب علم اردو ترجموں کی مدد سے خود قرآن کے معنے سمجھنے کی کسی حدتک صلاحیت پیدا کرے۔ تفصیلی طور پر یہ بحث ماہرین ہی کی مختصر جماعت میں طے ہو سکتی ہے لیکن اس خیال کو یہاں پیش کرنے کی میں نے اس لئے جسارت کی قرآنی عربی ادبی عربی سے مختلف چیز ہے اور مسلمانوں کو اس کا سیکھنا سکھانا نسبتہً طور پر بہت سہل ہے۔"

آخری مسئلہ "تعلیم بالغان" کا ہے جس کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس قسم کی تعلیم کے لئے دو ایک سال ہوئے کہ بلدۂ حیدرآباد میں مدارس شبینہ کا افتتاح بھی ہو چکا ہے۔

غرض عام پر نواب صاحب موصوف کا عالمانہ خطبہ صدارت ہمارے ہم مشرب بھائیوں کے لئے خاص طور پر اور عام طور پر دوسرے حضرات کے لئے بھی ایک اچھے معلومات کا ذخیرہ ہے۔

"تعلیم و تربیت" کمیٹی ماہرین تعلیم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کا پہلا نمبر ہمیں حال میں وصول ہوا ہے جو بعض وجوہ سے بجائے اکتوبر کے آخر دسمبر میں شائع ہو سکا۔ آج کل رسالوں کی کمی نہیں لیکن بدقسمتی سے اکثر اردو رسالے کچھ تو زمانہ کی بدمذاقی اور ناقدری اور کچھ نشر و اشاعت کی دشواریوں کی وجہ سے کوئی خاص غرض وغایتہ نہیں رکھتے۔ ان کا نہ تو کوئی نصب العین ہوتا ہے اور نہ کوئی معیار ظاہر ہے کہ ایسے رسالے قوم و ملک کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اور نہ زبان و ادب کی۔ ہمیں یہ دیکھکر نہایت مسرت و اطمینان ہوا کہ رسالۂ تعلیم و تربیت ان معدودے چند رسالوں میں سے ہے جو ایک خاص مقصد سے جاری ہوئے ہیں تعلیم و تربیت اسم بامسمیٰ ہے اور اس کے مقاصد اس کے نام میں متضمن ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمیں وہ پراسپکٹس نہ دستیاب ہو سکا جس میں اس کے مقاصد کی توضیح کی گئی ہے لیکن کمیٹی مذکور کے لائحہ عمل کا منشاء ہے کہ اس رسالہ میں "تعلیمی مسائل کے متعلق نظری اور عملی نقطۂ نظر سے مضامین لکھے جائیں۔ جن تعلیمی مسائل میں اختلاف ہے ان کے متعلق تبادلہ خیالات کیا جائے اور اس ملک اور دوسرے ممالک میں جو تعلیمی تجربات کئے جا رہے ہیں ان کی اشاعت ہو تاکہ اساتذہ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوں" ان اعلیٰ اور قابل قدر مقاصد کا رسالہ میں شروع سے آخر تک التزام ہے۔

ہندوستان تعلیمی میدان میں دوسرے ملکوں سے صدیوں پیچھے ہے اور بقول مسٹر تھیوڈور ماریسن، سابق پرنسپل علیگڈھ کالج "ہندوستان کا تعلیمی لباس ان اترے ہوئے کپڑوں سے بنتا ہے جسے انگلستان کا محکمۂ تعلیم بیکار سمجھ کر پھینک دیتا ہے"۔ یورپ ایک

تجربہ سے دوسرے تجربہ کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے اور ہندوستان کو بسنت کی خبر نہیں۔ یورپ اپنے جگر پاروں کی ذہنی، اخلاقی، جسمانی نشوو نما کے لئے نئی نئی طرز تعلیم اختیار کر رہا ہے اور ہندوستانی معلم اٹھارویں صدی کے تعلیمی گنبد میں بند دنیا و مافیہا سے غافل ہے۔ اسی تعلیمی پستی کے مدنظر رسالہ کے صفحات پر نئے تعلیمی تجربات نظر آتے ہیں تاکہ ہندوستان اگر یورپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے تو بہت پیچھے نہ رہ جائے اور نئے تعلیمی تجربات سے واقف و مستفید ہوتا رہے۔

غریب مدرسین کی حالت زار کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ان کی دلچسپی و فائدہ رسانی کے لئے بزم معلمین کا باب مخصوص ہے جس میں "کام کی باتیں ہوں گی عالمانہ انداز میں نہیں جسے ہم آپ جیسے بھلے آدمی دیکھکر ڈر جائیں بلکہ سہل زبان اور سیدھے سادھے طرز میں" اسی حصہ میں اساتذہ اپنی بپتا ایک دوسرے کو سنا کر جلے پھپھولے پھوڑ لیا کریں گے۔

مضامین خاص جلیل القدر اصحاب کے قلم سے نکلے ہیں اور مفید خیالات اور اچھوتے تخیلات سے لبریز ہیں۔ اقتباسات و شذرات تعلیمی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

اس رسالہ کی ادارت میں تین اصحاب شریک ہیں ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پی ایچ ڈی ڈی فل پروفیسر علیگڈھ یونیورسٹی ڈاکٹر عابد حسین صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی اور خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے۔ ایم ای ڈی پروفیسر ٹریننگ کالج علیگڈھ اور بقول مسٹر عبداللہ یوسف علی "یہ مناسب ہے کہ ایسے رسالہ کی ادارت جس کے مقاصد اس قسم کے ہیں ایک شخص کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ اس میں مختلف الخیال لوگ شریک ہوں" فاضل اڈیٹروں کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی رسالہ کے بلند پایہ معیار کی کافی ضمانتیں ہیں اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے عدیم المثال رسالہ ہے جس کی تبلیغ اور رہنمائی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں نئی تعلیمی روح پھونک دے گی۔ ہمارے نزدیک کسی مدرس کی میز اور کسی مدرسہ کا دار المطالعہ اس رسالہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہم اڈیٹر صاحبان کو ان کی معرکۃ الآرا

کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

رسالہ کا حجم ۱۵۰ صفحہ اور سالانہ چندہ صرف (صہ) کلدار ہے اور دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ سے ملسکتا ہے

اکسیر دندان کے علاوہ

ہر قسم کی درسی کتب

آلات تعلیمی اور صحیح پارہ ہائی قران مجید

مطبوعہ دفتر رسالہ واعظ

لطیفیہ کمپنی پبلیشرز و بک سیلرز یاقوت پورہ

حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے

The Hyderabad Teacher.

Approved by the Directors of Public Instruction, Hyderabad Deccan, Central Provinces & Berar and Bihar & Orissa for the use in Schools.

SUBSCRIPTION RATES.

O. S. Rs. 3 including postage for the Nizam's Dominions annually.

B G. Rs. 3 do do British India annually.

O. S. 12 As. excluding postage for the Nizam's Dominions per single copy.

B. G. 12 As. do do British India do

ADVERTISEMENT RATES.

Space.	Whole year.			6 months.			Per issue.		
	Rs.	A.	P.	Rs.	A	P.	Rs.	A.	P.
Full Page ...	10	0	0	5	8	0	3	0	0
Half Page ...	5	0	0	2	12	0	1	8	0
Quarter Page ...	2	8	0	1	6	0	0	12	0
Per line ...	0	10	0	0	8	0	0	6	0

OBITUARY NOTICE.

The late Mr. SYED VILAYET ALI.

We deeply regret to announce the death of Mr. Syed Vilayet Ali, B. A., which took place at the Afzul Gunj Hospital, Hyderabad Deccan, on the 11th January, 1928. The deceased was Head-Master of the Shah Ali Bunda Middle School and Branch Secretary of the Hyderabad Teachers' Association. He also edited the Urdu section of the *Hyderabad Teacher* with great energy and ability for nearly a year. He was a keen sportsman, and during the last Christmas vacation he exposed himself during a tournament at Aurangabad, in which he was taking part. He returned to Hyderabad with double pneumonia, to which he succumbed within a few days. His death is a great loss to the Teachers' Association, particularly to the *Hyderabad Teacher*. He was only 28 years old, and he leaves behind him a young widow, a child 9 months' old and a large circle of friends to mourn his loss.

MYSORE UNIVERSITY & KANADA.

Mr. S. Krishna Iyengar, Professor of Economics in the Nizam College and Fellow of the Mysore University, has sent us copy of a letter issued by him to the Fellows of the Mysore University, proposing the introduction of Canarese as the medium of instruction in that University. He has also sent us extracts from a few of the replies received by him including one from Nawab Hyder Nawaz Jung Bahabur. From a perusal of the Memorandum issued by Mr. Iyengar we understand that conditions are propitious for the introduction of his resolution in the Mysore University Senate. As the Memorandum has been issued to the Press, we think it unnecessary to give any extracts from it here. All that we wish to say here is that it is a matter for gratification that the principle of using vernaculars as media of instruction in Indian Universities, boldly adopted by the Osmania University 10 years ago is gradually, although, we must say, a little too tardily, gaining recognition in the various provinces of India. We are glad that Mr. Iyengar is moving the Mysore University in the matter and hope that the Mysore public will strongly support him and that the Senate of the Mysore University will adopt this highly beneficent measure.

---

education of a child below 6 is the home, and this is presumbly what Lady Barton meant when she said that education should begin in the home. As a preliminary step to the introduction of compulsory education, we suggest that a census of all girls of school-going age should be organised on the same lines as the census of all boys between 6 and 12 years of age was taken in Hyderabad about two years ago. This is a task in which the co-operation of the Hyderabad Women's Association would be valuable to the Education Department. The active assistance of the Association will also be needed to educate public opinion in favour of compulsory education so as to facilitate its early introduction.

The Conference also passed resolutions urging that every effort should be made to increase the number of trained women teachers, and recommending medical inspection of girls by lady doctors in all schools, provision of alternative courses to suit the needs of girls who do not intend to take up college education and the appointment of a committee with an adequate representation of ladies for drawing up a suitable curriculum and selecting proper readers for girls. We have no doubt that all these resolutions will receive at the hands of the authorities concerned the close and sympathetic consideration which they deserve. But we should again like to emphasise the fact that the attainment of the aims and objects of the Hyderabad Women's Association is not possible unless the members themselves work for them. Along with other activities, we suggest that a magazine may be started at once for the promotion of these aims and objects. At all events, we trust that the energy, self-sacrifice, sincerity and courage, which the noble work undertaken by the educated ladies of Hyderabad involves, will not be found wanting in them. We wish them every success.

---

are to understand the duties and responsibilities for which their sons must be trained, the Purdah must go. If women are to have that freedom of mind and that variety of interests, without which there can be no joyous life, the Purdah must go. The woman behind her Purdah is as much a captive as a bird in a cage. Pent up behind the Purdah she is steeped in ignorance and allowed to grow and to flourish like a pet animal ....". Opinions might differ as to whether "the Purdah must go" entirely, but most educated Indians are agreed that it is high time that at least a modification was introduced. In this connection, we should like to invite attention to the views expressed by Nawab Zulkadar Jung Bahadur, which we have published elsewhere. He has shown clearly that the kind of Purdah which is observed in India to-day has nothing to do with Islam. We are afraid, however, that in the absence of a Mustafa Kamal in India, no improvement in the present state of affairs is possible in the near future unless the women themselves fight for their freedom. We suggest the Hyderabad Women's Association and other similar societies of women in India including the reform of the Purdah system in their programme of work.

Another important resolution adopted at the Conference was that primary education should be made compulsory for all girls between 5 and 11 years of age. Steps are being taken in Hyderabad to introduce compulsory primary education for boys, and we strongly support the proposal for extending the measure of compulsion to girls also. But we think that compulsion should begin at 6 and not 5 years of age. In England it has been found that children who enter school at 6 or 7 catch up by the age of 9 with other children who entered at 5. It is true that there are Kindergartens and Nursery schools in Europe for children under 6, but these institutions are intended for children whose parents cannot provide for their education at home, and every child is not compelled to attend them. The proper place for the

the women of India are no longer content to leave the problem of their education to be tackled by men. The first All-India Women's Conference on Educational Reform, which was held at Poona a year ago under the distinguished presidency of Her Highness the Maharani of Baroda, gave ample proof of this awakening among them. Since then there has been a great deal of activity, in which the women of Hyderabad have also taken part by starting a society called the Hyderabad Women's Association for Educational Advancement. The Association has already enlitsed 200 members and held its 1st Annual Conference on the 5th January, 1928 with Lady Barton as President. In opening the Conference, the President made a brief speech in the course of which she advised those present to begin the education of children in their own homes and pointed out that cleanliness, morality and unselfishness were the basis of education and really more important than learning.

The resolutions passed at the Conference show that the members of the Hyderabad Women's Association are keenly alive to the obstacles that lie in the way of the education of girls in India and that they also understand the special needs of Girls' schools. One of these obstacles is the system of early marriages. The Conference adopted a resolution that legislation should be passed to raise the marriage age to 16 and the age of consent to 18 years. While opinions may differ, as they did at the Conference, as to what precisely the marriage age and the age of consent should be, every one who has the cause of the social and intellectual elevation of Indian women at heart, will agree that there is an imperative need for raising the age in each case. Another obstacle is the Purdah system. We are surprised that hardly any reference was made at the Conference to this practice. Speaking of the custom of Purdah at the All-India Women's Conference, 1927, Her Highness the Maharani of Baroda in her eloquent presidential address said: "If women are to take their part in the raising of the tone of social life, if they

English does not necessarily connote an acquiescence in a lower standard of positive knowledge. The one is quite independent of the other. While we regret the deplorable condition of the general University standards in India and believe that the Osmania University, no less than other Indian Universities, needs a stiffening in its demands for culture and general attainments, at the same time we regard partisans of one Indian University running down another on the strength of the doubtful possession of a particular virtue as an example in another form of the proverbial rivalry between the kettle and the pot.

The valuable advice given by the Maharaja Bahadur to the professors and students, we are sure, will be taken to heart by them. If followed, it will help them in their efforts to raise the prestige of the University.

To those who are familiar with the work of Nawab Hyder Nawaz Jung Bahadur in the cause of education in general and of Hyderabad Education in particular, the eulogistic terms in which the Chancellor spoke about it while conferring upon him the honorary degree of the Doctor of Laws, will not seem to be exaggerated. He is not merely an able financier. He is also a great, sound and experienced educationist, combining in himself a broad vision with a remarkable insight for details. The University, in fact, has honoured itself by conferring its highest distinction on one of its founders and chief supporters.

WOMEN'S EDUCATION: CONFERENCE AT HYDERABAD.

Perhaps one of the reasons why the efforts that have been made in India for the education of girls since the close of the last century have met with comparatively little success is that the share of Indian women in these efforts has been very small. It is therefore gratifying to find that

neglected this branch of education with the consequence that it has now to face the problem of unemployment among the educated classes. Surely we can profit by this mistake and avoid a similar problem here.

As regards a new faculty of Co-operation, we are of opinion that the existing Department of Economics should be so re-organised as to include Co-operation and other allied subjects under it. Nevertheless, we think that the Maharaja Bahadur's suggestion for getting one or two men specially trained in Co-operation in France and Germany is a valuable one.

Similarly, the question of the faculty of education is one of re-organisation so far as the University is concerned. The best way of dealing with this question, we think, would be to include a new group of subjects in the B. A Course. The existing Training College might be developed to provide training for the B. T. Course, for arrangements for teaching practice can be made by the Director of Public Instruction more easily and efficiently than by the University. The latter might, however, undertake the business of conferring M. T. degrees on such B. T.'s of standing as produce a thesis and submit the same to the Faculty of Education.

Again, though compulsory English cannot be dispensed with for a long time to come, provision should be made for the teaching of French and German and an example set to the other Indian Universities. When we say this, we are not forgetful of the suggestions made in certain quarters that the University should first improve its standards of English. These, we admit, are not so high as those of one or two other Indian Universities. We shall deal with this question at some future date. For the present, it is enough to point out that people who ridicule the University on this ground have no idea of the place of English in our University scheme and are perhaps mixing up unconsciously two different things. The existence of a lower standard in

EDITORIAL NOTES.

OSMANIA UNIVERSITY CONVOCATION ADDRESS, 1927.

HIS Excellency Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, G. C. I. E., the Chancellor, delivered a scholarly address at the Convocation of the Osmania University held on the 1st of December 1927. It is nearly a decade since the University was established. It was high time that new ground was broken at the time of the annual stock-taking. Statements justifying the University and emphasising again and again the use of the vernacular as a new departure from current University practice in India—a common characteristic of the addresses delivered on similar occasions in the past—had begun to appear rather stale. It was perhaps this reason that induced the Maharaja Bahadur to discuss in his able address, amongst other matters, certain practical questions vitally affecting the University organisation. The need for proper buildings was rightly stressed as urgent. We hope the authorities will forthwith take the work of construction in hand.

Another important question dealt with by the learned Chancellor was the necessity for the institution of additional faculties of Agriculture and Industries, Co-operation, Education and Modern Languages.

To provide occupation for the ever-increasing number of educated persons by training them in agricultural and industrial pursuits, Government should immediately take measures to establish a college of Agriculture and to develop the Technical Institute at the Mint into a full-blown Technological Institute. The latter work should be done in consultation with the Director-General of Industries and a committee of experts capable of offering sound advice on the industrial possibilities of the State. British India

The Chaddergbat High School Boy Scouts.

We have received a report from the Scout Master of the Chaderghat High School of a three days' camp held at Yusufguda during the first week of October, 1927. It contains a sketch of the camp site and a number of snapshots showing the scouts at work. It appears that the 28 Scouts and 4 officers who attended the Camp had a busy and an enjoyable time. They cooked their own food, swam in the tank situated near the Camp, learnt their tenderfoot and second class tests, played games and sang at the camp fires.

In his foreword to the report, Mr. M. Pickthall, Principal of the Chaderghat High School, says, "It is good to go out into the country, to breathe a purer, freer air, and take a wider view. It is good to go back for a time to the life of primitive folk, if only to learn how simple and how easily supplied are our essential needs. You, Scouts of the Government High School at the Silver Hounds Camp, formed a little self-contained community like a tribe of the Arabian desert or a Turkish *Urdu* (horde); but with the pleasures which proceed from wider knowledge and more conscious discipline, and a joy in work and play known only to Boy Scouts".

We congratulate Mr. Fiaz Husain, the Scout Master, on the excellent get-up of the report as well as on the success of the Camp.

---

took them round the harbour. The camp broke up on the 14th night and the various contingents departed with happy recollections of the Jamboree.

The Hyderabad Contingent. Well over 200 scouts and scouters from Hyderabad attended the great Jamboree. Mr. S. M. Hadi, the Director of Boy Scouts, was in charge of the Hyderabad Contingent and was responsible for its splendid discipline and efficiency. H. E. H. the Nizam's State Flag was hoisted daily at the camp during the usual Rally of the Hyderabad Scouts. The contingent contributed its quota to the genereal scout displays and camp fire items. The Aurangabad scouts demonstrated 'cycle stretcher', while the Hyderabad contingent as a whole contributed one of the best items of the camp fire in the form of a Noble's Marriage Procession, in which all the 200 took part. Thanks to the facilities afforded by the Education Department to the scouters and scouts to attend the Jamboree, they will long cherish the memories of this important event.—*Sivan.*

Scouters' Third Training Camp, Hyderabad Deccan.

The Third Scouters' Training Class organised by the Hyderabad Boy Scouts' Head-Quarters was held during the last week of December, 1927. Thirty-six teachers—seven from the Balda Division and the rest from the various districts—went through the training at a camp held at Chundulal's Baradari. Every effort was made to make their stay pleasant and comfortable. Mr. S. M. Hadi, B. A., (Cantab :), Director of Boy Scouts, and his Assistant, Mr. Ali Musa Raza, are to be congratulated on the success of the Camp. No outside help was taken except that of Dr. Hardikar who delivered four lectures on First Aid. We hope that teachers who have just been trained will start new troops in their respective schools and endeavour to make scouting popular and successful in the State.

BOY SCOUT NOTES.

Bombay Boy Scout Jamboree, December 1927.

For the first time in the history of scouting in the Bombay Presidency, more than 11000 scouts from all parts of India, Burma and distant Ceylon, met together at the All-India Scout Jamboree. Never was there such a large gathering of scouts witnessed anywhere in India since the institution of the scout movement in this country. Naturally, the Bombay Presidency was most represented. But large contingents from all the Provinces of India, still larger from the Native States and troops from Burma and Ceylon, were present to make the Jamboree a larger and a more representative gathering than the Jamboree held in Madras at the end of 1926.

The daily programme consisted of kit inspection, displays, sight-seeing and camp fires. The Jamboree commenced on the 10th morning, when the various contingents poured into the camp at Worli. On the same evening a practice Rally in the presence of H. E. Sir Leslie Wilson, the Chief Scout of Bombay, was held. On the 11th December the Jamboree was formally opened by His Excellency Lord Irwin, the Viceroy and Chief Scout for India. The grand ceremony was witnessed by thousands of enthusiastic citizens of Bombay. The great March Past of all the scouts, with their multicoloured banners, lasted for nearly 40 minutes. After the March Past, His Excellency Lord Irwin, in declaring the Jamboree open, said that the gathering was significant as a symbol of the brotherhood of scouts all over India. He also pointed out that the same brotherhood extended throughout the Empire.

The remaining days of the Jamboree were devoted mainly to sight-seeing, scout displays and demonstrations. The scouts enjoyed a pleasant time on the steamers that

would be more successful. He thought that to some extent they had been successful in the Madrasa-i-Aliya Boarding House. Success in the other direction was easier. Except for games, the boys were encouraged to wear their own rather than European clothes: they were advised to adhere to their own customs, and they were induced to look for literary culture through the channels to which there was easiest access, *viz.* Arabic, Persian, and Sanskrit. Above all, they were expected to be loyal to the ruling house of the great State to which they belonged and to realize that in being so they would be loyal to India as a whole and to the Empire. If to the above, there could be added something of that spirit which found its best expression in the motto "noblesse oblige" or the sense of duty expressed in the proud motto—as generally interpreted—of the Prince of Wales, then there should follow the readiness to take full advantage of the intellectual advantages that school life gave. A rightful claim to have fulfilled all these objects would indeed make them fortunate and it was necessary to remember that if much depended on the School, much also depended on the parents and still more on the boys themselves. Like other schools they had their successes and their failures.

Broadly speaking, there was no better test of the effectiveness of a school than the existence of a really vigorous Old Boys' Association. The recent revival of the Nizam College Old Boys' Association was particularly gratifying in this respect. It was entirely due to their generosity that the functions of the following day would be possible, which seemed to show that the Old Boys, many of whom were in close touch with the School or College, were satisfied that the joint institution was doing good work.

The Principal went on to remark that most of what he had been saying had reference to the School rather than the College. This was natural under the circumstances. The College had its own hopes and its own difficulties, but that was not the occasion to speak of them. One of these difficulties in earlier days was the exacting standard of the Madras University Examination. Very few students used to pass. This was all changed now and the more immediate difficulty at the present time was to get their graduates employed.

After the Sahibzada Sahib had kindly presented the prizes, the Principal when thanking him on behalf of the College, School and guests, said that the 18th November 1927 would always remain a Red Letter Day in their annals and would be added to the list which recorded the visits of His late Highness in 1889, 1890 and 1894, of H. E. the Viceroy Lord Elgin in 1895 and that of H. R. H. the Duke of Connaught in 1889.

---

above have grand-sons in the School at the present time and we still have hopes of the fourth.

The next important stage in the development of the School was the opening in 1884 of two special classes for Civil Service Probationers and for boys selected for training in England.

It was the wish partly to advance the Civil Service Class by carrying its instruction beyond the Matriculation stage and partly to effect economy in the Educational Budget, that led to the amalgamation in 1887 of the Madrasa-i-Aliya, the Civil Service Class and the Hyderabad College. The latter contained very few students at the time - so much so that it was reckoned that the cost of each one of them in Staff and Establishment alone worked out to about Rs. 2,500 per year, as compared with the present four or five hundred. From that date the combined institution was known as the Nizam College, but the most important part of it was the Madrasa-i-Aliya. This remained the case for the next 20 years. Since then, however, there has been a tendency for the position to be reversed and it is now the College branch which figures largest in the eyes of the Government and of the general public. As far as actual numbers are concerned, the balance is still fairly well preserved. Thus on the 30th Azur last the numbers were College 283 and School 215, but where the latter suffers is that it no longer gets the same share of the attention of the most highly qualified members of the Staff except for purely administrative purposes.

This is a defect which needs remedying, and I am sure that in saying so, I am voicing the sentiments of a large number of the senior Old Boys who are here this afternoon. If and when the time comes to try to remedy it, I look forward to having the support of the Old Boys' Association and of a large number of others as well.

Of one thing I am quite certain and that is, no matter what the future may have in store for the School, both this generation and future generations of Old Boys would be unanimous in demanding that the name of the Madrasa-i-Aliya should be preserved. To complete the history of the School I ought to mention the move that was made from Rumbold's Kothi to Asad Bagh where we now are. This was by order of H. E. H. the Nizam soon after his accession, and I need only say that we gained immensely by the change".

Passing on to the special purpose of the School as originally founded, the Principal said that speaking generally their first object had been the formation of character. On the one hand, they wanted to introduce something of the Public School tradition of England, on the other, they did not want in any way to denationalize their boys. It was not easy to introduce in India the Public School tradition of England. Certainly the four Chief Colleges had not achieved it, but possibly the new school which it was proposed shortly to found in Dehra Dun on the English Public School system

young once and no doubt looked upon the successful completion of their first 50 years as an important occasion just as we do. It marks a definite stage in our growth and it is right and fitting that we should celebrate the occasion not unmindful of those to whom the school owes its foundation.

We owe our origin to the wisdom of that great administrator Sir Salar Jung. He had previously arranged for the education of the members of his own family and it then occurred to him, possibly on the suggestion of the late Syed Hussain Bilgrami Nawab Imad-ul-Mulk, that it would be wise to extend the advantages to the sons of the other families, who, in virtue of their family possessions or traditions, were likely to be called on to hold high positions, in the State and so in 1877 the private institution was converted into a Government one intended for the sons of the leading nobles and jaghirdars and of State officials. At the same time, it migrated from the Nawab's own garden in the City to Rumbold's Kothi and came to be known as the Madrasa-i-Aliya.

The first regular meeting of the Board of Governors of which we have record was held in 1877 and one of the members on that occasion was the late Nawab Imad-ul-Mulk, who in matters educational was Sir Salar Jung's right hand man. At the time of his death last year, Nawab Imad-ul-Mulk was still a member of the Board of Governors. For some time, as a result of his accident, he had not been able to attend the meetings, but he still saw all the papers. There were periods, of course, when his connection with the School was broken, as for example, when he was on the Secretary of State's Council in England, but it was not for long and he retained his interest in it to the end.

Going to say good-bye to him before taking leave to England last year, I spoke to him of the coming Jubilee and I know he was prepared to make a great effort to be present at this function, if possible. Unfortunately, that was not to be, but it would not be right on this occasion to forget what he did for the School.

The records of these early days are not all tinged with sadness. Thus it is pleasant to see figuring in the School Roll of 1877 and 1878 the names of some who are present in the Hall at this moment. Little boys then, pillars of the State now, some of them—*e. g.* Raja Kishen Pershad (H. E. the Maharaja) and Mir Surfaraz Hussain Khan (Nawab Fakhr-ul-Mulk Bahadur); then you will all recognise the names of Mir Mumtaz Ali and Mir Liakat Ali, the latter with a heart as young now as it was then. The wonder of it all to me is that their Head Master Mr. Krohn is still alive. His name sounds to me as if he was of Norwegian origin and I fancy that nothing but the tough durability like that of the Norwegian pine tree would have enabled anybody to survive a class of little Liakat Alis, if indeed the saying be true that the boy is father to the man.

Those of you who are not already well aware of it will rejoice with me when I tell you that three of the four boys mentioned

District, which was sent to Mr. H. A. Krohn, the first Head Master, as a memento of the Jubilee from the Old Boys' Association.

The possibility of making provision for these trophies and for supplying refreshments not only to visitors to the Sports and "Mushaira", but also for every student in the College and every boy in the School was entirely due to the generosity of the Old Boys. No less than 134 of them contributed in some form or another, which speaks well for their interest in the old School or College. They reaped their reward in the succees of the gathering, which to them was a happy opportunity of reviving old memories and to those now on the roll an incentive to preserve the traditions of one of the leading educational institutions in the Dominions.

As no full report of the proceedings has been published, a reproduction of the speech of the Principal at the Prize Distribution is given.

After expressing the loyal gratitude of the College and School to H. E. H. the Nizam for his kindly interest which prompted him to send his sons to represent him and after offering the Sahibzada Sahib a hearty welcome on his first, but, as he ventured to hope, not his last visit, he proceeded as follows with reference to the significance of the Jubilee celebration.—

"Fifty years will to those familiar with the long continuous history of some of the schools of England seem a very short life. Eton was founded in 1440. Winchester in its present form dates back to 1373, but probably had its beginnings in a Grammar School that had been in existence prior to the Norman Conquest. Much older still are the schools connected with the great Cathedrals, for example, St. Peter's York 734 A. D., King's School Worcestor 680, and King's School Canterbury 620 with a continuous history for over 1300 years. Compared to these ancient foundations, our life has been a very brief one—nor even in Hyderabad are we the oldest school. I believe that one of the Government Schools, namely Chaderghat, is a few years older, while St. George's School is certainly older and the Brigade School in Secunderabad considerably so. All these schools however—even the oldest of them—were

It has become traditional at the Nizam College that on these occasions there should be no reading of the Annual Report. The academic successes are set forth in the printed prize lists and the Principal in his address calls attention to any other matter of particular interest which may have occurred during the year. True to this custom, the Principal Mr. K. Burnett contented himself with an address on the significance of the particular occasion, though incidentally it may be here noted that the College results in the Madras University examinations were well up to the good average of recent years. The total number who obtained a degree whether M. A., B. A. (Hons:), B. A. (Pass) or B. Sc. was 31. 42 students passed both parts of the Intermediate examination, thus qualifying for the degree courses and another 34 passed in one or other part. Of a total number of 144 who sat for an examination, only 24 were wholly unsuccessful. In the School the results were much less satisfactory, but it is recognized that in a school examination results are by no means the first consideration, and in any case, every school is liable to its ups and downs in this respect.

The proceedings in the Hall terminated with cheers for His Exalted Highness the Nizam, after which the Sahibzada Sahibs and principal guests took their departure through the big porch, on either side of which were drawn up the Boy Scouts of the Madrasa-i-Aliya who were well turned out.

On the second day the chief functions were the Sports (Past and Present), the College Students' Variety Entertainment, and at 9-30 P. M. a very well attended "Mushaira", presided over by Nawab Hyder Yar Jung Bahadur Taba-Tabai, who for very many years was associated with the institution as a prominent member of the Staff.

There was great enthusiasm throughout, and especially was this seen during the Athletic Sports. The number of prizes given was more than 50 and many of the cups were of considerable value. Among them was one-the gift of Mr. Khaja Mohiuddin, now Assistant Taluqdar in the Bidar

The Madrasa-i-Aliya Jubilee Celebrations.

On the 18th and 19th November 1927 the Madrasa-i Aliya celebrated its Jubilee in commemoration of the 50th year of its existence. The proceedings were under the kind and gracious patronage of H. E. H. the Nizam, who unable to be present himself, deputed the Sahibzada Sahib Nawab Azam Jah Bahadur and his brother Nawab Moazam Jah Bahadur to represent him at the Prize Distribution.

The first day opened at 10 A. M. with the annual Past *vs.* Present Cricket match. The present team was stronger than it has been for many years and had had a very successful season, while the Old Boys' team, though it included three or four members of the winning eleven in the Quadrangular Cricket Tournament, was not at its full strength. Consequently, the match ended in favour of the Present and terminated rather sooner than was expected, so that the spectators who arrived after 4-30 P. M. saw very little, if any, of the play.

Meanwhile, a large number of Old Boys and guests had arrived and were entertained at tea by Mr. K. Burnett, M. A. (Oxon), Principal of the College, and at 5-15 all assembled in the College Hall for the annual prize distribution.

The Sahibzada Sahib gave away the prizes and to many of those present the thought occurred that he acquitted himself very well in what was understood to be his first public function. Among others on the platform besides the Sahibzada Sahib and his brother Nawab Moazam Jah Bahadur, were H. E. the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, the Hon'ble Mr. L. M. Crump, Officiating British Resident, Nawab Fakhr-ul-Mulk Bahadur, Nawab Sir Amin Jung Bahadur and Mr. W. J. Prendergast.

Balance Sheet of The Hyderabad Teachers' Association

for the years 1335 & 1336 Fasli.

INCOME.	Rs.	as.	ps.	EXPENDITURE.	Rs.	as.	ps.
Balance brought forward from the year 1334 Fasli. ...	555	9	8	To Contingencies for the year 1335 Fasli. ...	102	11	3
Monthly subscription collected during the year 1335 Fasli.	1070	7	0	,, Allowance to Peons etc. for 1335 Fasli. ...	225	0	0
Monthly subscription collected during 1336 Fasli. ...	919	5	0	,, Conference Expenditure 1335 Fasli. ...	318	14	8
Bank interest. ...	23	0	0	,, Publication of 1st Conference Report. ...	320	0	0
Sale of the Report of 1st Conference. ...	192	11	3	,, Aid of the Magazine for 1335 Fasli. ...	400	0	0
				,, Contingencies for 1336 Fasli. ...	79	0	0
				,, Allowance to Peons 1336 Fasli. ...	211	0	0
				,, Aid of the Magazine 1336 Fasli. ...	360	0	0
				Total for the year ending 1336 Fasli. ...	1956	9	11
				Balance in hand. ...	804	7	0
TOTAL....	2761	0	11	TOTAL....	2761	0	11

(Sd.) MOHAMED SHARIF.

General Secretary and Auditor.

taken in the correction and valuation of students' exercises. It was further pointed out that it was a mistake to be over-generous in valuing answer-papers. To economise time teachers should get dictation exercises corrected by students themselves in the class room by interchanging the same. Mr. Chari of the Mufidul Inam School said that if general reading was to be useful, what students read from books borrowed from the school library should be tested by the teacher. All the members were in favour of the establishment of a Central Co-operative Society. Mr. Prakash Rao regretted that the Black Board was considered useful only for Mathematics and Drawing. There was a lively discussion on 'Kindergarten', and it was generally agreed that this method of instruction should be introduced in a larger number of schools.

---

pointed out that students should be encouraged, and not compelled, to read books from the school library, so that their powers of imagination might be developed.

Chanchalguda Middle School.

Eight meetings were held at this centre. Mr. Fasihuddin of the Rainbazar Primary School spoke at great length on the 'Art of Questioning'. At another meeting, Mr. Bahadur Husain Khan voiced a general complaint when he said that it was wrong to give the dignified name of 'library' to the odd collection of books usually found in a Primary school. Mr. Azimuddin gave a very useful model lesson on the 'Use of the Black Board'. In the course of the discussion on 'Manual Training', it was pointed out that psychology had established a close connection between the nerves in brain and those in the fingers and that when the latter were exercised, they influenced those in the brain in a wholesome manner. Messrs. Parmesh Rao and Laik Ahmed exhibited a few beautiful flowers made of paper by the boys of their school.

Middle School Darus-Shafa.

Mr. Mushtaq Ahmed pointed out that school excursions could not be organised unless parents co-operated with the school authorities by extending a little financial help. Mr. Abbas Namazi was responsible for a very useful and interesting model lesson.

Darul Uloom High School.

Mr. Abdur Razack said that Drawing helped students later on in a good many occupations. Mr. Hisamuddin spoke at great length and said that there was no religious objection to the teaching of the art of Drawing. Mr. Ganesh Chand, B.A., B.T., illustrated by a model lesson the principles that should guide one in framing questions. Mr. Prakash Rao, M.A., L.T., spoke on the value of excursions. Mr. Mahboob-ul-Hasan emphasised that great care should be

were two of the subjects which greatly aroused the interest of the members. Though there was a good deal of theoretical discussion on these, nobody thought it necessary to give a practical turn to the same by means of a model lesson.

Shah Ali Bunda Middle School.

Eight meetings were held during the year. Speaking on 'School Excursions', Mr. Shaik Mahboob described an excursion to Golconda which he had organised for his pupils and which had proved extremely useful. At another meeting when the subject for discussion was 'Correction of written exercises', the members generally expressed the view that teachers should not correct mistakes but should merely mark them, leaving the students to make the necessary corrections themselves. 'Manual Training' was considered necessary for all pupils.

Mustaidpura Middle School.

The members evinced much interest in the discussions on 'The necessity for the establishment of a Central Co-operative Society', 'Correction of Exercises' and Kindergarten'. The question of 'interest' was brought in in connection with the first subject and the general feeling seemed to be that 'interest' was permissible under certain circumstances. During the discussion on the second subject, one of the members condemned the practice of not giving credit to a student for method when his answer was wrong. Most of the members were opposed to the introduction of the kindergarten system so long as primary schools were not staffed with women teachers.

Asafia High School.

Altogether six meetings were held at this centre and a fair amount of interest was shown in the subjects discussed. Five members including the headmaster took an active part in the discussions.

Middle School, Golconda.

Only four meetings were held at this centre. The subject of 'School Libraries' led to a lively discussion. It was

College, emphasised the point that excursions gave an additional interest to the instruction imparted in the class room, while at another meeting Mr. Mustafa Husain was responsible for a well-thought-out model lesson. At the third meeting Mr. Ramanuja Chari, B.A., B.T., Head Master, Nampalli High School, while winding up the discussion on the "Art of questioning," pointed out that a good teacher not merely tested the memory of students by putting questions, but also with their help stimulated their thinking powers and maintained discipline in the class. At a subsequent meeting Mr. Mohamad Peer, the kindergarten teacher of the Chaderghat High School, delivered an interesting and useful lecture on "Kindergarten".

The deep interest which Mr. Ramanuja Chari, the local Secretary, takes in the work of the Association was, in the main, responsible for the success of most of the meetings at this centre.

Mahboob College, Secunderabad.

At all the meetings members evinced great interest in the subjects discussed. Mr. Krishna Swami gave a long talk on 'School Libraries'. Mr. Purshotham spoke at length about the difficulties which Froebel had to contend against in his life-time, and said that self-effort was the secret of kindergarten.

A. V. High School, Bolarum.

The local secretary, Mr. Shiva Shankaran, introduced two novel features at this centre. He asked the teachers and headmasters of other schools affiliated to this centre to preside at the meetings by turns. Secondly, he invited members of the outside public interested in educational questions to attend and take part in the meetings. These features gave additional interest to the discussions at the various meetings.

Middle School, Gosha Mahal.

The attendance at the meetings was very satisfactory. The use of the 'Black Board' and 'The Art of Questioning'

The Hyderabad Teachers' Association

BRANCH REPORTS FOR 1336 F.

Residency Middle School.

Six meetings were held at this centre. During the discussion on 'School Excursions' it was unanimously agreed that excursions to places of interest situated near a school should form an essential part of lessons on geography. Mr. Burhanuddin gave a model lesson to illustrate the art of questioning. At a subsequent meeting Mr. Chandawarkar, M. A., delivered a learned discourse on 'School Libraries'. A very animated discussion took place on the subject of 'Kindergarten'. Mr. Ahmeduddin, B. A., Headmaster of Kachiguda Middle School, exhorted the audience to get on with their work without paying any attention to outward show and said that to those who had grasped Froebel's principles lack of costly material should be no obstacle in putting those principles into practice.

Islamia High School, Secunderabad.

Very interesting discussions took place at three of the six meetings held during the year. While speaking on 'School Excursions', Mr. B. S. Iyer pointed out that real education would become possible only when teachers gave up the present practice of teaching from books within the four walls of a class room and resorted to open-air instruction underneath the sky.

Middle School, Shah Gunj.

Altogether nine meetings were held and a fair amount of interest was shown in the subjects discussed. There was a general feeling amongst the members that manual training should form part of the curriculum of studies in schools.

Nampalli High School.

During the discussion on 'School Excursions', Mr. Mehdi Husain Zubaire, B. A., B. T., Lecturer, Osmania Training

speeches. In doing so, he said that what they had heard that evening had whetted their appetite for more and that they would look forward to the lectures which Mr. Syed Mohamad Husain and Mr. Syed Ali Akbar had promised to deliver at the next Conference of the Hyderabad Teachers' Association.

The Central Executive Committee of the Hyderabad Teachers' Association has decided that officers of the Education Department and teachers not belonging to the Hyderabad Division can become members of the Association on payment of Rs. 4/- annually. This will also cover a year's subscription to the "Hyderabad Teacher". We are extremely thankful to the Principal and professors of the Nizam College for their prompt response to our invitation to them to join the Association, and we hope that the staffs of other institutions outside the Hyderabad Division will follow suit.

Mr. Ahmed Husain Khan, B. A., Principal, Darul Uloom High School and Mr. Harihar Iyer, Vice-Principal, Chaderghat High School, attended the All-India Teachers' Conference in Calcutta at the end of December, 1927 as representatives of the Hyderabad Teachers' Association.

When Mr. Ali Akbar visited the school, he asked the Directress where the apparatus used by the children had been made, and he was surprised when she replied, "We make our own apparatus". Mr. Ali Akbar next described his visit to Miss McMillan's Nursery School in the East End of London, which was intended for children whose mothers were obliged to go out to work during the day. The school worked in close co-operation with the mothers, who brought their children in the morning on their way to their work and took them away in the evening on their return home. The children were bathed every morning and given three meals a day. At these meals the serving was done by the children themselves in rotation. The school work was carried on as much as possible in the open air in the school garden. Side by side with the Nursery School, there was a Training Centre for Nursery School Teachers, and the students under training helped the staff of the Nursery School in taking care of the children and in supervising their work, play and meals. There was a clinic attached to the school, and a medical examination of all the children was held once a fortnight.

School Inspection. In conclusion, Mr. Ali Akbar said that school inspection, as it was carried out in England, was different from school inspection familiar to us in India. An Inspector in England was regarded as a friend, guide and counsellor. Mr. Ali Akbar remarked that everybody would expect that after what he had seen in England, he would change his methods of inspection. Nothing would give him greater pleasure than to do so, but he would like to remind them that conditions here were different from those in England.

* * *

After this, Mr. Ahmed Husain Khan, B. A., Principal, Darul Uloom High School and Vice-President of the Association, got up to propose a vote of thanks to the guests of the evening for their extremely interesting and instructive

included in the curriculum of schools or not. The Teachers' Associations as well as the authorities were generally in favour of teaching this subject to school boys. But in his opinion its mere inclusion in the curriculum was not enough to produce a body of citizens who would ensure future peace. It was necessary that instruction in the subject should be given by teachers who really believed in the principles which they were called upon to teach.

Religious Instruction. With regard to religious instruction, Mr. Ali Akbar said that the general opinion of educationists in England, Germany and Switzerland was against such instruction being given in schools. They thought that religious instruction was not in consonance with freedom, which should be the guiding principle of education. According to their view, children should be allowed to think out the problem of religion for themselves on growing up.

Post-Primary Education. Another tendency, to which Mr. Ali Akbar referred, was the provision of varied courses of study in the post-primary stage for children of various capacities. At the end of the primary course, educational tests and measurements were generally used, in addition to an ordinary examination, with a view to the classification of pupils for further education.

Pre-school or Kindergarten Education. Pre-school or kindergarten education, *i. e.* education of children below 5 years of age, was becoming as popular in England as it had been for some years in Germany. One of the most famous kindergartens in Germany was the Pestalozzi-Froebel House. There was a Training Institution for women teachers attached to this kindergarten, and the children were looked after not only by the kindergarten staff but also by the students of the Training Institution. Special attention was paid to the health of the children who were bathed every day and examined medically once a fortnight.

Co-operation of Parents. He had also been struck by the cooperation of parents in school work. At the annual prize distribution of an Elementary School in Paris which he attended, he found that the parents of the vast majority of the pupils were present. It was an interesting sight to see each prize-winner, after receiving his prize, advance towards his parents to be kissed and blessed by them. The teachers appeared to be well-acquainted with the parents of their respective pupils. In Germany there were Parents' Councils to promote an understanding between school and home. Parents and teachers sometimes met to discuss problems of education and the needs of the school concerned.

The use of the Cinema and Wireless in Schools. Mr. Ali Akbar next dealt with the use of the cinema in schools, which, he said, was rapidly becoming popular both in England and Germany. His impression was that Germany was much more advanced in the production of educational films than England. But he thought that the English were ahead of the Germans in the development of wireless broadcasting as a means of education. The use of wireless broadcasting had proved valuable in England especially in the teaching of foreign languages and music.

The British Broadcasting Corporation always engaged experts to give the wireless lessons; for example, in the case of French, always a Frenchman with proved ability in teaching French. A programme of the wireless lessons to be given during each month was announced beforehand, and the schools possessing wireless receivers arranged their time-tables accordingly. But it must be remembered that both the Cinema and Wireless were used in schools to supplement the work done by the class-teacher, and not as a substitute for it.

The Teaching of the Principles of the League of Nations. Continuing, Mr. Ali Akbar said that while he was in England there was a controversy going on there as to whether the principles of the League of Nations should be

the Bergmen Osterberg Physical Training College for Girls at Dartford in Kent, which the delegates of the Imperial Education Conference visited at the invitation of the Principal. This College was a residential institution intended for girls wishing to become teachers of physical education in Girls' schools. It had extensive grounds and three gymnasia. Besides physical education, *i. e.*, gymnastics, games, dancing and swimming, the girls were taught the Theory and Practice of Teaching, Physiology, Anatomy, Hygiene, Theory and Practice of Massage, Medical Gymnastics and School Remedial Gymnastics. The course of training was for 3 years. The pupils gave in the presence of the delegates a display of the physical exercises taught in the College, some of which were more strenuous than those prescribed even for boys of the High section in India. The health of the students was most enviable, and thanks to the residential system and the attention paid by the institution to general education and character-formation, they were exceedingly well-informed and highly cultured and had charming manners. Referring to physical education in Germany, Mr. Ali Akbar said that there was hardly any school in that country without a well-equipped gymnasium and a trained physical director. Physical exercises, swimming, breathing exercises, out-door games and school journeys had all acquired added importance in Germany after the War owing to the abolition of compulsory military training.

Medical Inspection of Schools. Continuing, Mr. Ali Akbar said that closely associated with physical education was the provision made for medical inspection of school children. In England as well as Germany medical inspection had been extended to Secondary schools, and there were special schools for children who were either mentally or physically weak or defective. The success of medical inspection of schools in both the countries was due to the close co-operation of teachers and parents with the school doctor.

The Principle of Activity. He dealt at first with the Principle of Activity. Activity, he explained, meant giving pupils greater opportunities of exercising their senses, bodies, and hands. According to this principle, the function of a school was not so much to impart information as to develop capacities by means of self-activity and self-expression. It emphasised that the child should learn through experiment rather than through dictation. He should know his immediate objectives, select ways and means of attaining them, and should by his own efforts find his way through mistakes to the truth. Great importance was attached to the materials of instruction, the aim being to develop with a minimum of material the maximum of skills, capacities, and joy and pleasure in work. Mr: Ali Akbar said that though he did not get an opportunity of visiting any school conducted entirely on these lines, he saw the application of the Principle of Activity in the workshops of some of the Elementary schools which he visited in Berlin. In these institutions, manual instruction was considered to be as important as other subjects of the curriculum, and it was not only used for giving the pupils a knowledge of the materials and developing in them skill and artistic sense, but it was also pressed into the service of other subjects like physics and geography. The "Gartenarbeitschule", garden activity school, was based on the same idea. It was recognised that it was no good teaching Nature Study in the class-room. If the instruction was to bear fruit, it must be given in a practical manner in a garden.

Physical Education. Another tendency which Mr: Ali Akbar described was the value attached to physical education. The important part which out-door games played in the life of an English school was well-known. But few people in India knew that the arrangements for the physical education of girls in England were as efficient as those for the physical education of boys. In this connection, the speaker mentioned

egates from all parts of the British Empire, representing ferent nationalities, races and civilizations. It was prising to find that the educational problems and ficulties of these countries were similar. Secondly, hange of ideas with delegates from other parts of the itish Empire enabled the representatives of India to know plans which those countries were adopting to adjust ir respective educational systems to suit modern economic l social conditions. Thirdly, the Hyderabad delegates got good opportunity of describing at the Conference the gress of education in their state during the enlight-d rule of H E.H. Nawab Mir Osman Ali Khan Bahadur, zam of Hyderabad. Incidentally, they were also able to ar the misunderstandings in the minds of some of the er delegates regarding the Osmania University. Besides derabad, five other Indian States, *viz.* Mysore, Travan-e, Cochin, Patiala and Jaipur, had sent delegates to the nference. In conclusion, Mr: Mohamed Husain thanked organisers of the Conference for their hospitality and ressed great admiration for the tact and ability with ich the Chairman, the Duchess of Atholl, had conducted proceedings of the Conference. He also thanked H. E. H. Nizam's Government for deputing him and Mr: Ali bar to attend the Conference.

* * *

: Ali Akbar's Speech : rn Tendencies Education.

Mr: Ali Akbar then addressed the gathering. He associated himself with Mr. Syed Mohamad Husain in thanking the Teachers' Association for the welcome extended to them that afternoon and the Advisory Committee he Imperial Education Conference for the hospitality ch they had received at their hands during their stay in gland. The speaker proceeded to describe some of the dern tendencies in education, which, he said, he had iced in his recent visit to Europe.

The Hyderabad Teachers' Association.

Welcome to Messrs. S. Mohamed Hussain and S. Ali Akbar.

On the 25th November, 1927 the Hyderabad Teachers' Association held a meeting in the Methodist Boys' High School Assembly Hall to welcome Mr: Syed Mohamed Husain, B.A., (Oxon:), Deputy-Director of Public Instruction, and Mr: Syed Ali Akbar, M. A., (Cantab:), Divisional Inspector of Schools, Hyderabad Division and President of the Association. About 200 members were present. In the course of a short speech, Mr. Marmaduke Pickthall, Principal of the Chaderghat High School and Vice-President of the Association, who presided, explained the object of the meeting, and on behalf of the Teachers' Association congratulated Messrs: Syed Mohamed Husain and Ali Akbar on their successful and profitable tour in England and on the Continent. He also expressed the hope that the Education Department would benefit by the experiences gained by these two officers abroad. Moulvi Hisamuddin Saheb, Assistant, Darul-Uloom High School, speaking in Urdu, said that the account of the Imperial Conference and of the part taken by Messrs Mohamed Husain and Ali Akbar which had appeared in the *Hyderabad Teacher* showed how admirably the Hyderabad State had been represented at that gathering.

* * *

Mr: Syed Mohamed Hussain's Speech: The Imperial Education Conference.

Mr: Syed Mohamed Husain thanked the members of the Teachers' Association for their appreciation of the work done by him and Mr: Ali Akbar at the Imperial Education Conference and said that this appreciation was a source of great encouragement to them. He said that as he was going to give later on a separate lecture on the Educational System of Denmark, he would confine himself to stating a few broad facts about the Imperial Education Conference. There were at the Conference

exhibits from Calcutta Model works and Captain Petaval's Technical Institute.

Judging the work of the Conference as a whole one felt that, though it must be declared a success for which the organisers deserved congratulations, a few things had been overlooked. It would have been better if the exhibition had been organised on a larger scale and housed in a different building. More time might, with greater advantage, have been allotted for the discussion of topics of practical educational value by not confining the Conference within two days or, if this was impossible, by holding morning and afternoon sessions on both the days instead of one session per day. Again, though the Conference was held at a time when the schools and colleges were closed, a few excursions to places of educational interest might have been organised for the delegates.

To conclude, though here and there a critical note is struck in reviewing the proceedings of the Conference and suggestions offered, it is needless to say that this is done in the interests of the Federation. It is hoped that the organisers of the next year's conference to be held at Poona, along with the Conference of Asiatic Teachers, will make it an unprecedented success.

---

progress of education during the year under review in the different parts of India, including the Indian States. The lecturer paid a tribute of admiration for the work done in the Punjab by Sir George Anderson, regretted that the latter had retired and hoped that the good work done by him would be continued by his successors. He then expressed his gratification at the establishment of the Agra University and referred briefly to the schemes for the reorganisation and expansion of the Universities of Aligarh, Benares and Calcutta. Speaking about Bengal, he condemned the attitude of the previous lecturer towards the bill for compulsory Primary Education. With reference to the Osmania University, he said that he used to be one of those who entertained doubts about the wisdom of making vernaculars the media of instruction in colleges. During his recent visit to Hyderabad, he went to the Osmania University College and watched a professor of philosophy lecturing in Urdu on some metaphysical topic. Since then, he said, he had become a convert and looked forward to the day when vernaculars would be used more and more as vehicles of instruction for college work. In this connection, he referred to the move in the same direction at the Andhra and Baroda Universities. Continuing, he noted the great advance made by the State of Travancore in the matter of education for women, where the State was experiencing great difficulty in finding employment for the large number of educated ladies. Before concluding his review, he commended the work of the Inter-University Board and condemned the Hon'ble Mr: S. R. Das's scheme for the establishment of a Public school in India on the ground that such a school, if established, would merely create a new caste and foster snobbishness.

Under the auspices of the Conference an Educational Exhibition had also been organised. This was on a very modest scale. It contained in addition to the charts, maps, and other publications from Longmans' and MacMillans',

deleting the latter part of the resolution on the ground that he was a pacifist and objected to Military Training of all kinds. But the Conference would have none of this and the amendment was dropped for want of a seconder.

(4) That arrangements be made in schools for lectures on Health and Hygiene and that Government be requested to open special clinics for school children at special centres.

(5) This Conference resolves that Government be requested to institute travelling scholarships for teachers.

(6) This Conference protests against the non-representation of educational interests on the Cinema Enquiry Committee.

(7) This Conference approves generally of the recommendations of the Committee of the League of Nations on International Intellectual Co-operation.

For want of time most of the resolutions were read out from the chair and taken as approved. Also, so much time was taken up by the discussion of resolutions of a minor and local character, that papers on important educational topics on the agenda had also to be taken as read.

Amongst the other notable features of the Conference were two lectures, one by Mr: Neogi on 'Education in India' illustrated by lantern slides and another by Professor Seshadri on 'Progress of Education in India during 1927'.

The first lecture was one long harangue on the rottenness of the system of education as established in India by the British Government. As one listened to this diatribe, one could not help but feel that there was in Mr: Neogi more of the politician than of the educationist. The lecturer even went to the length of exhorting the audience to oppose the bill recently introduced into the Bengal Council for making Primary Education compulsory.

The second lecture by Professor Seshadri was a study in contrast. It was a calm, cool and critical study of the

to the more advanced nations of the West, abolition of the compulsory study of the only Western language, which an over-whelmingly large majority of the students in India learn, is likely to do more harm than good. Even now, though provision for the teaching of French and German in schools and colleges is scanty, yet the few who wish to go abroad and work at the Western Universities, do learn one or other of these languages. What is needed at present is not so much abolition of the compulsory study of English as greater facilities for the teaching of French and German at our universities. When the vernaculars are fully developed and a recognized common language other than English comes into being, English might be given the same place in our curricula of studies as we would give to any other western language.

The following are some of the important resolutions passed at the Conference:—

(1) This Conference is of opinion that the constitution of the Senate of the University of Calcutta should be so amended as to provide for a majority of elected representatives of schools, colleges and university teachers.

(2) This conference resolves that the medium of instruction and examinations in the secondary and higher stages of instruction in this country be the languages of the different provinces and this Conference urges upon the Government and the Universities in the different provinces to organise bureaus for translating standard books on science and letters from foreign into Indian languages.

(3) This Conference resolves that physical education be made compulsory in all schools and colleges in India and urges upon the Government to make adequate provision for Military Training of the students of the Universities.

This resolution excited a spirited debate. The situation looked piquant when a hefty looking delegate, dressed in the picturesque garb of the Frontier, proposed an amendment for

ventured out of their districts—perhaps who had never seen a great river or a mountain or never visited any of the places rich with the relics of the past—such teachers, he declared, could never feel, much less communicate, an enthusiasm for the subjects they taught.

Again, he continued, though India was a veritable paradise for exploration to the students of the natural sciences, yet Botany, Zoology and Geology were utterly and shamefully neglected. The responsibility for this apathy lay, in his opinion, on those who framed the curricula of studies. He then passed on to a consideration of his own subjects, Mathematics, Physics and Chemistry and said that though a vast number graduated in these subjects, yet the total output of new knowledge was depressingly small.

He then exhorted the audience to be true to their calling and hasten the work of nation-building by their silent and unobtrusive work. This business of exhortation was rather a lengthy affair, and, though pitched in an admirable key, was marred by an unnecessary gibe at the Congress and the politicians, for whose work the President seemed to have scant respect.

Matters so far dealt with formed part of the printed Presidential address, copies of which had been distributed amongst the audience. In addition to amplifying the topics dealt with therein, the learned President spoke for another half an hour or so on diverse educational topics. With most of what he said in this connection no educationist would disagree. But it is doubtful whether all will agree with him in the view that the compulsory study of English in schools and colleges should at once be abolished. He maintained that knowledge in the school stage could more easily be imparted through the medium of vernaculars, and as for college work, he thought French and German more essential than English. As long as the vernaculars are not fully developed and embody in their respective literatures only varying fractional amounts of the total knowledge available

remedies suggested by him. While discussing the last, he said very strikingly that the teacher who sang the hymn of hate was untrue to his vocation, but even more false was the cringing and cowardly teacher who would teach wrong things, inculcate false history and give lessons in dwarfed patriotism for the sake of paltry gains in job or lucre.

After this, Dr: Raman delivered his Presidential address. He began with a personal reminiscence. He said that when he was in residence in Pasadena near the Pacific Coast of the United States as a visiting Professor at the California Institute of Technology, he happened to take part in a Conference of High School Teachers of the State of California. All the teachers of the state had come together in obedience to the laws of the state which made it obligatory on all of them to meet once a year at public expense in a conference lasting a whole week. He pleaded for the provision of similar opportunities for teachers in India, so that they might come together once a year and exchange ideas and refresh and strengthen their knowledge.

Continuing, he said, that it was the fashion to speak of education as one of the nation-building departments. But politicians and administrators who spoke in that strain forgot that the work of nation building could not be carried on when its educators were half-starved men deprived of all opportunities of gaining new knowledge. The work of teaching, he remarked, was the dullest of dull drudgery. When this was sustained and illumined by the enthusiasm of the teacher for his subject—by the joy of acquiring or of creating new knowledge and of responsive enthusiasm kindled by its communication to others—then alone the work was lifted from the dreariest of routine to the noblest of professions. It was impossible, he said, to communicate to others an enthusiasm which one did not oneself feel. He illustrated this again with personal reminiscences of his school days, especially of the hours spent in the geography and Indian History classes. Teachers who had never

The Third Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations.

By AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.,
Principal, Darululoom High School, Hyderabad Deccan.

The 3rd Annual Conference of the Federation was held in Albert Hall, Calcutta, on the 29th and 30th December 1927, under the presidentship of Dr: C. V. Raman, F.R.S., Professor of Physics, Calcutta University. About 500 delegates attended the Conference. Of these, though the majority hailed from Bengal, a good many represented other Provinces and some of the Indian states.

Principle G. C. Bose of the Bangabari College, as Chairman of the Reception Committee, read out the welcome address. In the course of this, he pointed out that the system of Western education had denationalised Indians, harmed their moral and spiritual nature and was merely manufacturing B. A.'s. and M. A 's. in large numbers without turning out real scholars, discoverers and inventors. He remarked that real men where they had been evolved had come in spite ot that system of ha-lfbaked unrealities where instruction acted as a dead weight on the budding soul and killed all natural growth. The secondary schools, he said, were ill-housed, ill-managed, over-controlled, dummy organisations catering for short cut passes in the examinations. Mr. Bose then supplemented this pessimistic diagnosis of the state of education in India by a few suggestions for its improvement. Full control and management of educational institutions by educationists, introduction of physical training in schools and colleges, study of Indian art, music and Provincial vernaculars, formation of Social Service Leagues working under the direction of school masters and free discussion of political, social and economic problems in all educational institutions, were some of the

(2) Welcoming the experiment of using Urdu as the medium of instruction for Muslim students in the Presidency.

(3) Requesting the Mussalmans of India to lay the foundation of a Poly-technical Institute without further delay and appointing a Sub-Committee to discuss the proper place and scheme of its organisation.

(4) Appointing a Sub-Committee to frame a suitable and comprehensive syllabus for religious instruction to be imparted with English education for the Mussalmans of India.

(5) Requesting the authorities of the Aligarh Muslim University to take immediate steps to make Urdu the medium of instruction and examination up to the Matriculation, and to give Urdu the status of an optional subject in the Intermediate and B. A. classes, as has been done in the Universities of Punjab, Allahabad, Lucknow and Patna.

In his concluding remarks, the President exhorted the Muslims to carry out the resolutions into practice to the best of their power. With a vote of thanks to the chair, the Reception Committee and the Proprietor of the Wellington Cinema where the Conference held its sittings, the proceedings came to a close.

---

for those educated Muslim women who wanted to advance their material interests and get an income, viz: teaching and medical practice. Both were noble callings which should be taken up by them. He also suggested that a Ladies' Conference should be held in each district for the promotion of the education of Muslim women. Dr. Sulaiman then read out portions of his printed address in which he discussed various social problems which needed reform.

Mr. Khaja Gulammus Saiyadain of the Aligarh Muslim University delivered a lecture on 'Social Reform', in the course of which he exhorted the Muslims to practice economy in their expenses on occasions like marriage, death, etc.

When the Conference reassembled in the afternoon of the second day, Prof: F. D. Murad of the Muslim University delivered an illuminating lecture on "Wireless and recent scientific discoveries", in which he explained the importance of electricity in modern life.

He was followed by Dr: Monsoori, who while explaining the importance of technical education, pointed out the urgent need for the foundation of a Poly-technical Institute for the benefit of Muslim students.

On the third day Mrs. Mazharuddin read from behind the screen a paper on 'Female Education', in which she supported in eloquent language the movement for giving education to Muslim girls and made a stirring appeal for contributions for starting a fund in Madras for awarding scholarships to Muslim girl students and helping deserving pupils. This appeal was generously responded to and a large number of those present promised donations and annual subscriptions.

Some of the important resolutions that were passed were as follows:—

(1) Appointing a Mopla Education Board with a view to ameliorating the educational condition of the Moplas.

versity in successfully adopting Urdu as the medium of instruction in higher education even in scientific and technical subjects, thus vindicating the charge that it was unsuitable and insufficient for being used as such.

While emphasizing the value of physical education, he pointed out that for a long time it was not considered to be an essential part of education. The studious boys and sporting boys represented two distinct classes. Fortunately, the idea had undergone a complete change, and it was high time that particular attention was paid to that well recognised principle of modern education in our schools and colleges. Referring to the Boy Scout movement, he observed that it brought about a change in the spirit of school boys and made men of them. It was in the Scout camps that they learnt to be friends, to forget sectarian differences and serve their fellow-men. So he advised his co-religionists to take the fullest advantage of this useful movement.

Justice Dr. Sulaiman, who presided over the second day's deliberations, addressed the Conference on female education. He drew attention to four aspects of female education, viz: first, whether according to the Islamic conception, female education was objectionable; secondly, whether it was really practicable; thirdly, whether it was of any utility; and lastly, what would be the best method of securing a speedy advance and progress in the field of Muslim female education? He said that the conception of education in early times was a high and noble one It meant enlightenment of the mind and the imparting of knowledge, so that the recipient might learn how to discharge his duties towards God and man. In those days the most important part of the education of Muslims consisted in the reading of the Quran. The next object was to acquire knowledge in the widest sense. He was confident that if Muslim women so desired, it would be possible to make arrangements for observing Purda in educational institutions. He pointed out that there were two openings

Council of State suggesting that the interests on deposits in the Imperial Bank of India and its Branches all over the country belonging to such Mussalmans as had conscientious objection to the taking of interest might be made over to the Educational Institutions and Associations of the community. If this proposal was accepted by the Government, it would render additional help to Muslim education. A resolution to this effect was also passed by the Conference.

Dealing with adult education, the President said that adults who became literate would find the accomplishment of great practical use, to themselves in their every-day affairs of life. He referred to the progress his own province, the Punjab, had made in that direction and advised other provinces to follow its example. As regards the method of teaching adults, he observed that due attention must be paid to what was of interest and importance to them. Each pupil should be encouraged to progress at his own pace and along his own bent. The instruction should be largely individual and the main function of the teacher should be to stimulate and guide.

According to Sir Shaikh Abdul Qadir, what passed for religious instruction hardly deserved that name. Devoting just one period a day to the teaching of a book of religion could hardly be called religious teaching. Neither could the occasional enforcement of the rule that boys should go to the College Mosque for their prayers make them really religious or God-fearing men. What was needed very urgently was the influence of personal example to create among the boys a true religious spirit and to have religion woven into the fabric of every-day life of students.

Closely connected with our religious education was the study of Arabic, Persian and Urdu. Regarding the last mentioned, he said that it was the *lingua franca* in North India as well as in many parts of the South. It had a growing literature, the cultural value of which was very great. He commended the efforts of the Osmania Uni-

a knowledge of agriculture, both in theory and practice, should be imparted to them along with instruction in reading, writing and simple arithmetic. If they were destined to live in towns, the teaching of arts and crafts should be combined with literacy. In the advanced countries of Europe, education was imparted to children and youths in such a way as would meet their special requirements. He quoted passages from the unpublished reports of Messrs. Sanderson and Parkinson, who had been sent by the Punjab Government to study the system of rural education in England with a view to the adoption of some of the English methods in the Punjab. They had observed that the avowed aim of rural education in England was to turn out 'handy men'. We should also follow the same ideal in educating the youths of our country. We should make 'handy men' of them—men who would be useful to the parental home on leaving school and who would subsequently be in a position to make their own homes comfortable and pleasant—in short men, who would make themselves useful in all possible ways in their own humble surroundings and thereby make themselves useful to the country. That a change in the present educational system in India was urgently required admitted of no question. The volume of popular opinion in favour of vocational and industrial training was fast growing. Agriculture being the chief occupation of the majority of the Indians, the opening of such schools as would come very close to the life and ideal of the agriculturist appeared to be a dire and urgent necessity in rural areas.

The general poverty of the Muhammadans prevented them from giving a good education to their children. To remove this disability to a certain extent, Sir Abdul Qadir advocated the formation of Muslim educational societies in every district and province, whose chief duty would be to collect funds with a view to granting scholarships to deserving Muslim students. In this connection, he referred to the resolution moved by the Hon'ble Seth Harron Jaffar in the

the Madras Presidency had made in the field of Muhammadan Education since 1901 when the Conference was held at Madras for the first time. Dealing with elementary education, he pointed out that while the strength of boys reading in the Elementary schools was 170,000, it dwindled to 5800 in Class V in 1925—26. He attributed this fall to extreme poverty and irregular attendance of boys and the preponderance of untrained teachers. In view of the poverty of the Muhammadans, secondary education, he said, was almost free in schools under Muslim management. He pointed out the need for opening special classes in non-denominational secondary schools for imparting instruction to the Muhammadan boys through the medium of Urdu. In the field of higher and professional education, the Muhammadans of the Presidency were still more backward, but the Muhammadan Education Society of Southern India had been doing its best in that direction by allotting scholarships amounting to about Rs 6,000 a year. Speaking about the possible sources of income for the encouragement of Muhammadan education, he emphasised the need for the extension of the provisions of the Wakf Act to mismanaged Trusts in the presidency, so that their income might be devoted to educational purposes.

In his able Presidential address, Sir Shaikh Abdul Qadir discussed various educational problems likely to contribute to the welfare of Indians in general and Muhammadans in particular. Dealing with the question of Muslim education, he said that having made considerable advance in secondary education, our first business now should be to pay attention to its quality. A man who combined some vocational knowledge with a fair amount of literacy was, as a rule, better equipped for the battle of life than a man who possessed only the one or the other of these qualifications. He suggested that the present curricula be so amended as to fit in with the particular kind of life the boys would lead—rural or urban. If they were to be agriculturists,

observed in this country is not to be seen and has never been seen in other Islamic countries.

Religious Instruction. As regards social observances and religion, boys and girls of tender age only imitate their elders because their intellect is not developed enough to allow them to enter into such questions in a rational way. It will be advisable if the religious part of their education at this stage is left to the parents themselves and the Education Department only arranges for the literary and moral sides of their training. But when the students go to the secondary schools, arrangements may be made for their religious instruction But the minor differences of the various sects will have to be set aside and the teaching of each religion imparted according to a code about which the majority of the people of that religion are unanimous.

The Fortieth Session of the All-India Muhammadan Educational Conference.

By ABDUR RAZZAK, M. A., B. L.,

Head Master, Islamiah High School, Secunderabad.

The fortieth session of the All-India Muhammadan Educational Conference was held for the second time at Madras on the 26th, 27th and 28th December 1927. Delegates from different parts of India attended. A new feature of the Conference was the Social Reform Section, which was presided over by the Hon'ble Justice Dr. S. M. Sulaiman of the Allahabad High Court. The success of the Conference was largely due to the interest taken by the energetic Secretary of the Reception Committee, Mr. A. Hameed Hasam, B.A., LL.B.

In his welcome address, Mr. C. Abdul Hakim, Chairman, of the Reception Committee, dwelt at length on the progress

compulsory elementary education without difference of caste and religion can be introduced into the Dominions, and if you support this view you must lose no time and have courage enough to adopt methods for the introduction of this system. It is apparent that the evils from which the country is suffering to-day cannot be removed until and unless the masses are properly educated. You should therefore resort to speeches, writings and all other methods in the shape of warnings and persuasions which may help to impress on the various communities and classes the imperative need of compulsory education. If you gird up your loins and make a systematic effort to convince the authorities on this point, I have no hesitation in believing that His Exalted Highness' Government will lend their support to your sincere proposals.

Education of Girls. Gentlemen, the obstacles which lie in the way of female education have been discussed in papers and at different meetings for a considerable time. It is a question which in reality relates to reform in our customs and social conditions and the present Conference is not the proper place to discuss those matters. Still for the cause of education you will have to fight with some old and deep-rooted prejudices which under the name of religion keep nearly one-half of our population steeped in ignorance. One of these is the purdah system, and as a large class insists upon its maintenance, I cannot help observing that in all the religions of the world Islam is the first religion which laid great stress upon the protection of the rights and honour of women. According to Islam, woman holds an equal position with man and she enjoys all those privileges and rights which the other sex enjoys. It is surprising that the followers of the same religion now show such bigotry and narrow-mindedness in the matter of female education. The way in which the purdah is being observed in the big towns of India has absolutely nothing to do with the doctrines of Islam, and this view becomes quite clear when we find that the rigour with which the purdah is

the material which will give the child an outlet. Examples of such material are dramatisation of stories; models of villages made by children; school newspapers run and financed by boys; self-governing assemblies of school children, which give them an opportunity of corporate living and also for creative activity; the play-ground, where each boy tries to do his best for his side.

Self-expression alone leads to a society without cohesion and without solidarity. Children should be taught to express themselves in relation to their fellow-beings. We must make children feel that they are part of a group, which is in turn part of another group, until they will feel their solidarity with the whole world. They must be made to realise the unity of mankind and must be taught that the world's good is their own and that in their good is the world's.

The true meaning of freedom in education lies first in giving children the knowledge and skill necessary for preparing them for living in the present-day world, and secondly, in doing this in so small a part of the day that time is left for group and creative activities.

The Hyderabad Education Conference, 1927.

Extracts from the Presidential Address of Nawab Zulkadar Jung Bahadur, M. A., (Cantab:), Barrister-at-Law, Home Secretary, H. E. H. the Nizam's Government.

Compulsory Primary Education. Owing to the prejudices of centuries and religious traditions of thousands of years, which have divided us into so many castes, we fail to understand that we as a nation cannot make any progress until and unless every inhabitant of this country enjoys a peaceful and contented life. You, gentlemen, who have placed before you the noble cause of the dissemination of education in the Dominions must first decide whether

teacher goes out of the room, this should make no difference to discipline among boys. In the Dalton Plan there are no special text-books. This Plan, to be successful, should carry with it diagnostic tests and suitable text-books.

In all these ways, it is possible to fit the school to individual differences.

FREEDOM BY INDIVIDUAL MASTERY BY DR. CARLETON WASHBURNE,
Superintendent of the Winnetka Schools, U. S. A.

It is said that the function of a school is to provide the environment from which the child will draw the things which he needs. Those who hold this view use the analogy of seeds. We must see that they have the ground and proper conditions to grow in. Beyond this, we must not interfere, else the seeds will not grow. But children must function in the world as it is. It will not do to put them in an artificial environment, an environment containing only those things which are good for them.

We cannot count on the natural instincts of children. We must give them the knowledge and skill which they are going to need. For this we must study adult society and learn what knowledge and skill children are going to need when they grow up. We must also provide for variations, differences between various individuals. All progress depends on each individual varying from others. The traditional system is defective in this respect. It puts time before achievement. The solution lies in the application of scientific methods to knowledge and skill. The entire school curriculum should be scientifically organised, so that each child may progress at his own rate. It is only when the child is given a chance of self-expression that he can contribute to making the world better than it is. For creative activities the right kind of environment is essential. There must be stimulus for the child to express himself and stimulus depends upon environment. We must organise

than those in their bodies. The class system is wrong, because children in the same class are not alike. Intelligence tests show that differences within a class are greater than differences between that class as a whole and the class immediately above or below it. The consequence of the existing system is failures. Failures damp the child's spirit and the disgrace attached to them has a bad effect on his self-respect. Another result of the class system is that we praise clever boys for work which is really below their capacity. A third consequence is that children are promoted without having received enough grounding and without ability to follow in the next class. We train children to accept mediocre achievement.

The problem is how to give children a chance of moving forward as individuals. The curriculum must be divided into two parts:—(1) Things which every child must know—knowledge and skill; (2) Creative activities. In the traditional schools, time is constant, while achievement varies. In the new schools, achievement is constant, while the time varies.

Three steps are necessary for individual technique:—

(*a*) To know exactly what it is that you expect every child to know. There are certain things which we want to be alike, *e.g.*, spelling, certain specific facts which everybody must know.

(*b*) To prepare tests for correcting particular mistakes. Tests must be diagnostic; they should at once help to find out what is wrong and where the child needs help. In Arithmetic, for example, when a boy makes a mistake in addition, he should be referred to a test containing similar combination of numbers.

(*c*) To prepare text-books that children can easily understand. Text-books should be such that each child can teach himself, proceeding step by step. The teacher should merely help, and there should be no class teaching. If the

The development of the scientific knowledge of the reading processes in recent years has greatly simplified learning. A teacher must know what these processes are. He must teach reading for comprehension and avoid teaching children to read mechanically.

There must be the same scientific method in the preparation of materials for instruction. We must provide for—

(*a*) Processes connected with skill—spelling, arithmetic, hand-writing, reading, etc.

These processes should not occupy more than 20% of the time of the school.

(*b*) Materials dealing with the problem of understanding how people live together in the world—political and social life, democratic government, physical environment, etc.

Here selection is very important. The teacher should know what a child should know in order to understand his environment. He must choose his concepts and work out concrete examples by which the ideas of these concepts can be impressed upon the minds of children. To guarantee maximum of growth with the minimum of expense there should be a plan of the concepts of life which we are going to teach to the child in each year.

(3) Creative art. The same methods of scientific selection are necessary for creativeness. We must try to discover the artistic and creative faculties of each child, and we must try to draw them out as fully as possible.

Educationists should therefore understand not only the child but also adult life, and they should become students of both the method and art of education.

The Class System. The logic of a tailoring concern which makes clothes of the same size is the logic of many schools, where differences in the mentality of different children are ignored, though these differences are greater

(2) The necessity of creation in the child has been overlooked.

A new type of schools has arisen, but the old traditions still persist, and even to-day in New York City the *minimum* number for a class in the elementary schools is 45.

There are two schools of thought :—

(1) The first school advocates intellect training, science, and knowledge for the sake of knowledge; it believes in conformity, control and discipline.

(2) The second school advocates development of emotional life, Art and knowledge for use ; it believes in initiative, freedom and activity. According to this school of thought, education is not for "I know" but for "I experience".

The problem is how to reconcile science and art ; we must live within the science ; we must learn the technique of art. While the scientific teacher has great respect for ideas, in the free schools no emphasis is laid on ideas. Nor have these schools any respect for adult society. This is wrong, because infancy is a time for preparation for adult life.

The aim of education is to obtain the maximum of growth with the minimum of expense. "Growth" means the growth of child towards understanding himself and the society to which he belongs. So the teacher must plan and prepare, have material ready—projects, excursions, all apparatus—if the maximum of growth is to be attained with a minimum expenditure of time and energy. We cannot depend upon the spontaneous interests of children ; there must be selection, and the teacher must know what concepts he will try to teach his children within a defined period. Lack of design is a besetting sin of the free schools.

Reading is of fundamental importance in schools. Children must be given capacity to read so that they may understand themselves and the world in which they live.

must not distort facts, and must not preach; yet it must give a message and make an emotional appeal or the message will not get through—get across, I suppose I should say.

The World Conference on New Education

II

By SYED ALI AKBAR, M. A., (Cantab:),

Divisional Inspector of Schools, Head-Quarters, Hyderabad-Dn.

The following are the notes taken down by me of two important lectures delivered at the Locarno Conference, a brief account of which appeared in the last issue of the *Hyderabad Teacher*.

FREEING THE CURRICULUM BY DR: HAROLD O. RUGG,

Educational Psychologist at the Lincolin School of Teachers' College, New York City.

Schools should produce living human beings, superior human beings. We want people who will live a dynamic life, people who can think.

From the 17th century onwards man turned away from the contemplation of spiritual things to exploit the physical matter; he tried to better his standard of life. Thus came about a new philosophy, philosophy of practical life. Out of this there grew in the United States of America the scientific movement in education. Since 1900 America has been trying to devise methods for measuring and analysing the human mind. Two things happened:—

(1) A method has been devised for discovering the law of measurements.

it would content the enthusiasts, there would be no difficulty in the matter. Unfortunately it is not sufficiently enticing to attract the interest of the producer of films, and it is not what the enthusiast claims Nothing struck me more during ths discussions at the recent European Conference in Basle on the use of the film in Education, nothing is more persistent through the American literature on the subject, than the assumption that all knowledge is of equal value for school purposes, and that the film should be used in schools as a means of giving information of all kinds and quite apart from its value for the school's plan of work. It is not the function of the school to give mere knowledge, but to train its pupils in the use of knowledge, and that training gains in effectiveness by being concentrated upon a carefully thought-out and defined body of information. I saw many educational films in Basle of which the only value was in giving odd bits of knowledge. The school can only attempt so disorderly a task by neglecting its own special province. The result, as has already been discovered in America, is superficiality and an inability to reflect.

I return to that sphere of the school's work which I summarised as "influence;" a sphere which has been strangely neglected by the advocates of the use of the film in school. It offers at least two advantages; it is not concerned with the details of the school's plan of work and often need not be concerned with the actual plan of work at all; it is a sphere in which mass instruction is admissible because its aim is not formal instruction at all. The film seems admirably suited for the purposes of suggesting interests, of widening experience, of adding to that miscellaneous store of information which adds so much to the understanding of life. Something quite different from the ordinary entertainment film, though of like technical excellence, something different from the "educational film" as it exists at present, is wanted for this purpose. The film

clear mental picture will occur to individuals, not to the class as a whole. The cinematograph seems too cumbrous a machinery to use in these case.

But pass on to a later stage in schoolwork, and substitute "process" (using the word in a very wide sense) for "thing," and the case for the moving picture seems strengthend. All depends, however, on the relation of the process to to the selective plan of the school work. Provided the "Process"—whether it be the spinning and weaving of wool as carried on before the Industrial Revolution, or the life of a Norman baron in his castle, or life and surroundings in modern India, or the life history of a plant or animal—arises naturally and normally as part of the scheme of work which the school has planned as a coherent whole for its scholars, a film illustrating the whole "process" may have a great value as a supplement to the work of the classroom. Its use will be preceded by careful preparation and followed by equally careful discussion with the class. The one essential is that the school scheme of work must dictate the nature of the film, not the film the scheme of work. The posibilities of using such films in connection with different subjects of the curriculum have been explored, and the general consensus of opinion is that in practice this will amount to a very limited and occasional sphere for the film, too limited in fact to justify the cost of the necessary equipment.

The film may, however, also play a useful part after the completion of a course of work, as a means of rapidly revising what has been taught in the previous lessons. It can only do this if it stands in a close relationship to the course of work. In the intensive study of this course of work there is a very little use for the film at all.

This limited sphere for the use of the film in the classroom is all that most teachers are disposed to admit, and, if

wants to satisfy, in order to dispose them to be receptive without being credulous, to welcome experience and to make use of it, to recognise and love beauty of all kinds. Unless it has at least done all this, the school has failed in its duty. It equips in order to give its pupils at least the knowledge and skill that it requires as material for training. It trains in order that its pupils may know how to use their abilities as efficiently as possible. Unless in the end the school produces citizens who can reflect, weigh evidence, draw conclusions and form judgments, it has failed on the intellectual side. Unless it gives the power to translate thought into effective and controlled action, it has failed on the practical side.

In the past the use of the cinematograph in schools has been almost exclusively considered in connection with equipment and training, and on the intellectual side. Training in the use of thought is impossible without material for thought—in other words, ideas or knowledge. The pupil will certainly gain a mass of material for thought from his environment, but in an unorganised way. The school wants particular material conditioned by its scheme of study, and it is its business to supplement the pupil's raw material methodically. And it must see that this material—consisting, in the earlier stages, of ideas of things—is clearly and accurately apprehended. For this purpose illustration is essential; the real object whenever possible; if not, a picture of it. In no other way can we be sure that the pupil has, with economy of time, formed a clear and definite mental idea of the thing in question. The necessity for illustration is obviously greater the younger the pupil, since for him mental correlations are few and weak.

It is here that one possibility of making use of the film in the classroom arises. In the earlier stages of schoolwork, however, where the ideas to be clarified are generally simple and definite, it is by no means clear that the film, with its liability to distract by the inevitable inclusion of other features, has any advantage over the ordinary picture or slide. Moreover, as a rule, the difficulties of forming a

To give education is, however, not the only, not necessarily the chief, function of these agencies. The school differs in that it is the one agency whose sole business it is to give education, and indeed it has no other justification for existing. It is highly specialised, it works to definite aims, and because the time at its disposal is limited, it is compelled to be highly selective in its plans and methods. It cannot teach everything; within its general plan it has to choose its material for study in the light of experience to secure its definite aims. It operates through teachers, and because they are human it has to allow them wide liberty in the choice of method; one man's meat is another man's poison. It is not enough to establish the possibility of using a given method (for example, the film); it has first to be shown that it has such an advantage over other possible methods that its adoption justifies the cost, and then to be shown that its use is right for the teachers of a particular school.

There is still another general consideration that is important. The school has been profoundly influenced by the results of recent psychological research which have emphasised the difference between individual pupils. The whole trend of schooling in this country has set strongly in the direction of trying to meet the needs of the individual pupil, and against older methods of mass instruction. The film, like the wireless, is essentially a mass method of instruction, and the possibility of its effective use in schools is limited by the movement in the schools away from mass methods. It is only in those directions in which mass instruction is possible without injustice to the individual that we can hope to find a real case for the use of the film in the school.

Speaking very broadly, we may say that the school carries out its business of educating in three ways. It influences, it equips and it trains. It influences, for example, in order to dispose its pupils favourably towards schooling in general or to instruction in particular by suggesting and awakening interests which schooling can and

bananas to Schubert, but I believe that our errors are due to not discriminating between one kind of tune and another. The majority of people do not realise that there is as much difference between a tune of Mozart and a hackneyed tune of the streets as between a line of Shakespeare and a catch-word. It is not that their judgment has gone wrong, but that they have no judgment at all. What we have got to do in musical education is not so much to train the pianist or the singer, but to bring back the belief that music is as much a part of a literary culture as a literature or a science, and that we cannot leave it on one side. What I really claim at the present moment is equality for music in our ideas of culture. It is our educational loss if we are one-sided in this matter, and allow ourselves to go on shutting our ears and eyes to the educational contribution of the art of Music. In every school there should be a certain period of corporate school singing; a quarter of an hour a day would do; and it should be confined to the very best songs there are in the world, beginning with great national songs and their imperishable tunes. The children will come to understand and love music just as they see and love the beauty of great poetry.

THE USE OF THE CINEMATOGRAPH IN THE SCHOOL

Extracts from a speech made by Mr. H. J. R. Murray, H. M. I.

No one doubts that the cinematograph is an educational agency, just as are the home, the church, the street, the lecture room, the concert room and the theatre. Man learns from his environment, and learns all the time. In this sense, though it be little more than a truism to say so, every film is an educational film. Whether the film be used in the school or not, we cannot get away from the fact that this agency is at work for good or ill, and as citizens and educationalists we are profoundly concerned to see that this agency, and all the others, shall as far as possible function for good.

intellectual appeal that I wish to support its claim to a place in education. Many concert goers leave their intellects in the cloak room with their cloaks and hats; they come into the concert hall "to have their souls shampooed". They have not come into the outer courts of the art, they are still in the open fields outside. To illustrate this, let me take a personal experience I happened to come across a volume of the lyric poems of Frederick Mistral with an English translation along with the Provencal verse. After consulting the translation, and understanding what the poem was about and comparing the rhythm and its delightful lilt, my delight was enhanced a thousand-fold. The poem becomes entirely new when you understand what it really means Now music is just as much a language as Provencal or any other language. Every single great tune has got a meaning; some tunes are poor, just as some verses are poor, but the great tunes are like the great lines of Shakespeare, or of Virgil or of Milton, as full of meaning and as full of delight and as infinite in their range of beauty and significance. When you once realise this, that music has got much to say to you, do you not agree with me that here is a vehicle of education which we cannot afford to disregard? As in the case of a great dramatist with his dialogue etc., you have only to understand the interweaving of the parts to realise and enjoy it all, and the enjoyment opens up to all a new garden of delight.

This then is the ground upon which my contention is based, that music contains all the delights of the study of a language, all the delights of a very great literature, and in addition to that, the same kind of analytic problems which you meet in the study of a science. Do not let us hear anything about the advantages of ignorance in aesthetic matters; nobody has ever admired a flower less for knowing how the flower is constructed; nobody has ever admired music less for knowing what aesthetic principles there were lying at the back of it

I do not really believe that people prefer songs about

Let me try to elaborate that for a moment. Take first of all the physical side of it. Our psychologists have not yet succeeded in developing the actual relations between music and the nervous system of man, but we have a certain amount of empirical testimony which is of first-rate value and which I hope will be developed before very long. Take, for instance, the well-known example of music as a curative agency in cases of shattered and impaired nerves, we have not only historical instances but many definite cases of nerves that have yielded to the persuasive and soothing influence of musical sound. Just after the war I happened to go to the Chelsea, Hospital. The singers were all patients in the hospital, they sang part songs with great delight and vigour, and yet each one of them had been admitted to the hospital so broken with aphasia from shell-shock that he could not say his own name. They were put into the hands of Sir Frederick Mott who could not even get them to speak at first, then he tried humming some tune of soldiers' songs from the trenches. There was a faint response at first, and then gradually he brought them back into speech and sanity. By this means I believe that the health of school and college life might really be enhanced by giving music a larger part in the educational system.

Secondly, let us consider the effect of music on the emotions. This is enormously potent; indeed some have said that music appeals to the emotions and literature appeals to the intellect, which is really nonsense, for both appeal to both. Nobody who can distinguish one tune from another can doubt the emotional effect of music. I do not deny that in some instances the effect of music has been over-strained or over-sentimentalised and this no doubt is unwholesome, but it is quite legitimate that we should be stirred by some music *e. g.* the Marseillaise, etc.

Now I come to a third point upon which I wish to lay my highest emphasis, and that is the intellectual appeal of music. It is because it has this extraordinarily intimate

The Imperial Education Conference, 1927

II

THE PLACE OF MUSIC IN EDUCATION.

Resumé of an address delivered by Sir Henry Hadow.

THE attitude of the "Learned world" of Oxford 50 years ago towards music was that it was an agreeable, pleasant and amiable thing and part of our enjoyment of life, but that there was no sense in it and that to talk about music as an element in education was like giving the same title to confectionery. An Oxford story of my day will illustrate this. I used to take Latin Proses to a grim old tutor who was a main-stay and pillar of classical learning. At the beginning of the term I went to get my times arranged and as my hours happened to clash with an orchestral concert the next week, I asked my tutor to change them. I am bound to admit that he stopped short of personal violence, but the request was definitely refused. A friend asked that his time might be changed to attend a debate at the Union. This proposal was received with entire favour. "I can understand that," said my tutor, "there is some sense in that".

Many parallels could be found to this story to show that the people who emphasised and supported the literary and intellectual side of education regarded music as an outsider, as an interloper who had no right of place. This is the more remarkable if you come to think of it, as our traditions are entirely different. Three hundred years ago music was regarded as an essential part of all literary education by our Elizabethan ancestors and surely we cannot afford to disdain what they regarded as one of the most important resources in culture and education.

If you ask to what side of human nature education is directed, the answer would surely be—to the whole of it, and I venture to say no single topic in our educational scheme appeals so widely as music does to every part of our nature.

Practice Chart for Addition, Subtraction, Multiplication and Division.

	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
1	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
2	2	4	6	8	10	12	14	16	18	20
3	3	6	9	12	15	18	21	24	27	30
4	4	8	12	16	20	24	28	32	36	40
5	5	10	15	20	25	30	35	40	45	50
6	6	12	18	24	30	36	42	48	54	60
7	7	14	21	28	35	42	49	56	63	70
8	8	16	24	32	40	48	56	64	72	80
9	9	18	27	36	45	54	63	72	81	90
10	10	20	30	40	50	60	70	80	90	100

'How to make use of this chart' has been explained by the writer of this essay in the Urdu Magazine *Al-muallim* for Khurdad and Thir 1336 Fasli.

determination to succeed. All these will assuredly be followed by the most valuable results. The children should be taught and shown how they may verify their answers. The importance of verification by the student himself cannot be over-estimated. The consciousness of the ability to verify their own answers imparts to them much self-confidence and self-reliance and checks the tendency to the vicious practice of copying.

The following Ten Commandments are taken from an English magazine *Teachers' Aid*, published in London, with the hope that they may be taken for guidance by every teacher teaching Arithmetic :—

1. Do not come between a child and his problem.
2. Do not work a sum on the Black Board for the children who have already worked it correctly.
3. Do not talk when children are working sums—could you work if some one were continually shouting near you ?
4. Do not mistake laziness and inertia for want of ability. "Cannot" often means "Have not tried."
5. Do not hold back the children of the class. Let them race along on their own.
6. Do not set sums which are too easy. One hard sum honestly attempted is more valuable than dozens of sums which have evoked no special effort.
7. Do not make a fetish of "type." Variety is the spice of arithmetic as well as of life.
8. Do not offer help too readily.
9. Let each example call for a little more effort than the preceding one. Remember "The attempt is the thing."
10. Do not neglect the Tables.

more varying and interesting it is, the better will be the results; *e.g.*, in Junior classes, regular practice in counting backwards and forwards in twos, threes, fours etc. is invaluable. Rows of figures written on a chart as given below are useful for practice in addition and subtraction and also for revising multiplication tables.

In the Middle and Senior classes attention should be paid to the aliquot parts of a rupee; *e. g.* 8 as. = ½ Re., 4 as. = ¼ Re., 5 as. 4 ps. = 1/3 Re., 10 as. 8 ps. = 2/3 of a Re; similarly, ·25 = ¼, ·125 = 1/8, ·625 = 1/16 and so on. The knowledge of such things is very useful for ready reckoning in the speedy solution of problems.

Such drill should be introduced regularly for short periods and the teacher should create a playful spirit among children while giving such drill lessons in mental work. He should be careful that the pupils do not take such drill lessons to be drudgery. When a definite time limit is set for working a number of sums, it would prove a valuable help in increasing the children's power to manipulate figures speedily and accurately.

All teaching of Arithmetic should result in arousing self-effort on the part of the pupils. The study of Arithmetic is of real educational value largely on account of the thinking and reasoning involved, and hence copying must be rendered impossible. In order to ensure good results, the teacher should see that the learner is entirely occupied with his work. A teacher will find that a divided attention, a talkative habit, a slipshod style of work, a state of mind careless as to whether or not success attends the effort, all or any of these conditions will surely make themselves felt in weakening the arithmetical and intellectual results. The teacher, therefore, should be on his guard against such things, and should try to cultivate among his children the habit of a highly concentrated state of mind, a neat and orderly arrangement of work, a desire to be accurate and a

multiply 757×998, he should, instead of multiplying the multiplicand by each digit in the multiplier, multiply 757 by 1000 which is simply done by placing three ciphers to the right of 757, and subtracting from the same (757000) the product of 757×2, he will get the answer required. The pupils should also be trained to state the reason for so doing. Similarly, if a child be asked to find out the cost of 13 yards of cloth at 14 annas 6 pies per yard, he should first know that 14 as. 6 ps. is less than a rupee simply by one anna and a half, and hence he should subtract the product of 13 and $1\frac{1}{2}$ annas from Rs. 13/- and get the answer. If he were to multiply 14 as. 6 ps. by 13 and then turn pies into annas and annas into rupees, he would no doubt get the same answer, but in that case he would be following a lengthier method and much time and energy would thereby be wasted. Very few pupils use such short cuts, the majority follow the stereotyped long and tedious routine.

In the teaching of Arithmetic, attention should also be paid to speed and accuracy. The teacher should see that his class solves the sums set not only with accuracy, but also in as short a time as possible. He should also explain to the children that a hasty wrong answer is of no use at all.

Speed and accuracy can only be acquired by systematic training. A period or two in a week should be necessarily set apart to cultivate the habit of speed and accuracy among children in working arithmetical problems. Sometimes it is seen that many of the children fail to be accurate in the solution of sums of a mechanical nature, though they are intelligent enough to explain a problem clearly. As Arithmetic is a science of exactness, the importance of accuracy should never be overlooked. The teacher should see that his children are 'quick at figures', as such quickness is a decided asset in after-life.

It has just been mentioned that systematic training and constant practice are necessary to secure speed and accuracy. Such practice should take various forms and the

The use of concrete examples should be continued throughout the school course, because the ordinary arithmetical problems of common life deal with such examples, and their use in school tends not only to simplify the school-work but also to give it a practical turn. To give an idea of practical sums on every-day life, three or four sums on the first four rules are given below :—

(i) Rama has got 4 marbles, Govind has 3 marbles, Abdulla has 7 and Lateef 8. How many marbles are there in all among them ?

(ii) A boy got from his father 5 pills of sugar, of which he ate 3. How many has he left in his pocket?

(iii) Mother gets 2 seers of milk everyday from a milkman. How much milk should she buy in 7 days?

(iv) 8 pieces of pencils were equally distributed among 4 children. How many pieces should each receive ?

After sufficient practice, exercises of a mechanical nature may be introduced in order to test the accuracy, power of concentration and patience of children. Sometimes it is found that many children fail to work sums of such a mechanical nature, and this is probably due to the fact that children fail to treat their work seriously, and teachers neglect to show and explain to the children their mistakes.

To remove this defect the teachers should direct the children to work each item clearly and methodically in the margin of their ex- ercise books if they are unable to do it mentally. The teacher should bear in mind that a jumble of badly written figures invites trouble. It is of the utmost importance that the pupils should be methodical in working out the sums.

The teacher should also try to make his pupils familiar with shorter and more intelligent methods to save time and lengthy working ; *e. g.*, if a child of Standard IV be asked to

The Teaching of Arithmetic In Primary Schools

BY

D. C. BHOGLE, B. A., B. T.,

Assistant, Mahratti Normal School, Aurangabad.

THE object of teaching Arithmetic in Primary Schools is to develop the powers of reasoning and concentration and to provide useful knowledge for every day life. Under proper guidance, the children in the Primary schools should be able to perform their calculations with rapidity and ease. For this reason alone, the teacher should strive to make his pupils quick at figures.

It is generally found that many of the children considering this subject difficult are afraid of it. Really speaking, it is not the difficulty of the subject, but the wrong method of teaching it, that creates a distaste for the subject in their minds. Teachers teach it as an abstract subject, and consequently the children take no interest in it. Though it is an abstract science, the teacher should try to make it as attractive as possible through the use of concrete objects in the elementary stages. The idea of abstract numbers should be cultivated among children with the help of objects which they can see and handle. A child knows what is meant by '3 marbles', '3 pencils', or '3 dogs' long before he can reason about the number "Three" and sometimes even before he can understand what the figure "3" stands for. Therefore, it is desirable in arithmetical exercises to associate numbers in early years with the names of common things. But it is generally seen that the Primary school teachers merely write figures 1, 2, 3, etc. on the slates of their pupils and ask them to rewrite them without giving any idea as to what the numbers stand for.

We have to remember that the high school prepares boys for the college, though college professors are apt to put all blame on the high schools for the 'bad stuff' they get. The high school teacher must therefore direct his work to this end. For instance, we need not trouble the high school student with biographical details of the authors they study. All that a high school teacher has to do is to arouse interest in such a study, for only then there will be a human interest in it. For instance, information regarding the boyhood of Pope, his crying in rhymes when his father prevented him from writing poetry :—

> "Papa, Papa, pity take
> Verses will I no more make"

or the personality of Dr. Johnson are things which are bound to rouse great interest in literary biography.

Finally, there is the moral aim in the teaching of literature. The teacher of literature, more than even the teacher of theology, has great opportunities for inculcating lessons of right conduct. He can draw the attention of his pupils to several fine aspects of life, instead of merely teaching dull theories about religion.

Teachers should have before them the ideal of being themselves students. Otherwise, they can never be good teachers. A teacher worth the name spares no efforts in the study of his special subject. A good English teacher must work at literature and study it passionately. Only then, can he do his work efficiently and the object with which the study of English literature is introduced in secondary schools can be fulfilled.

study. Sir Walter Raleigh also emphasises the necessity of understanding the art of connection between paragraph and paragraph which, according to him, is the key to success in literature.

Coming to figures of speech, it is admitted that one of our weaknesses is an excessive fondness for figurative language. But times have changed now and with the influence of modern science, the language of reason has come into vogue. Figures of speech are not ornaments primarily, but are so only secondarily; and their primary use is to make our ideas clearer. This should be so even in poetry, as elaborated by Coleridge in his *Biographia Literaria*.

The qualities of style are more difficult to teach. We should not look upon English merely as language but as literature. It is good to teach pupils correct English, but a more important thing is to teach them to love its literature. Whenever there is occasion, a teacher has to point out literary beauties, descriptions of natural scenes, heroic activites and striking aspects of life. Herein lies the aesthetic aim of teaching. Even the critical aim is not outside the scope of secondary teaching. Such questions as why a passage is good or beautiful can and should be put to students at all stages. After all what is criticism? Stated simply, it is only an intelligent appreciation of the high qualities of a passage of literature, and is thus not beyond the scope of even elementary students. In doing this work, we need not trouble boys with others' criticisms. Leaving things to the individual aesthetic judgment of pupils is always good and productive of good results. A simple question like, 'why is this passage beautiful?' put to a boy, will bring out his critical faculty better than giving him the opinions of a number of critics about that passage. Criticism can be taught even in elementary stages and a book like Lamborn's 'Rudiments of Criticism' will give a great deal of help to the teacher in this matter.

are words like 'pleasure', 'joy', 'delight,' 'ecstasy', etc., wrongly used as if they were synonyms. Without introducing such misconceptions, a teacher should make his pupils understand exactly what a word means and not give synonyms, because there were really no synonyms in the English language. It is often found that a word like 'dungeon' is explained by some as a dark room, by some as an ill-ventilated room, by some as a low-roofed room and so on, while in truth, it is something comprehensive, namely an underground room which is dark, ill-ventilated, lowroofed and so on.

Another aspect of the teaching of vocabulary is stimulating interest in the origins and derivations of words. Books such as Trench's "Study of Words" and Weekley's "Romance of Words" which help in this work a great deal should be read by all English teachers. When teaching matriculation classes, I used to refer to picturesque derivations of words and students listened to this with pleasure. Each word is an Iliad without a Homer. When a student is told the historical or other allusions of words, he finds them very interesting and never forgets them: for instance, the word 'idiot' of Greek origin, meaning 'one who does not take part in politics', words like 'jovial', 'saturnine' 'mercurial' and 'influence' with their astrological significance, and the word 'bias' connected with the game of bowls, when traced to their orgins appeal to the young mind.

With regard to sentence and paragraph-structure, no rhetoric need be taught to secondary school pupils, but they should be made to appreciate some principles of sentence-construction such as clearness and simplicity. The details of these have to be taught in a very simple way. Pupils should also be acquainted with the difference between periodic and loose sentences. Examples of these can be found by a reference to the writings of Macaulay and Carlyle. Unfortunately, Macaulay is not fashionable to-day, yet the perfect construction of his paragraphs is well worth

Teaching of English Literature in Indian Secondary Schools.*

BY

P. SESHADRI, M. A.,

Professor of English, Benares Hindu University.

Prof. Minto talks about 'elements of style' and 'qualities of style'. Under elements of style he includes vocabulary, sentence and paragraph-construction and figures of speech, while under qualities of style, he includes such intellectual qualities as simplicity and clearness and emotional qualities as sublimity, humour, and pathos. Matthew Arnold distinguishes between what he calls 'the communicable elements of style' and 'the incommunicable elements of style.' Under the former, he includes principles which should guide vocabulary and sentence and paragraph construction which can be easily taught, while under the latter he includes some of the emotional qualities which are difficult of teaching and comprehension. Teaching in secondary schools should be directed mainly to these "communicable elements." A teacher cannot make all his students Lambs and Hazlitts, yet he can make them appreciate a Lamb and a Hazlitt.

Ruskin is very particular about the study of vocabulary, the study of every word. But the way to do this is not by dictating synonyms. By dictating synonyms teachers are perpetuating certain misconceptions which are ineradicable by professors at college, who sometimes find it necessary to disillusion students about their high school education before they can proceed with their work. Words like 'annoyance,' 'irritation', 'exasperation', etc., explained by 'excitement' as a synonym mislead students. Similar examples

*A Lecture delivered recently under the auspices of the Hyderabad Teachers' Association.

Regarding the school as a whole, all forms of clubs and societies should be encouraged as bringing into play co-operation and unselfish effort. Where healthy forms are not provided unhealthy ones will flourish in their stead, and a "gang" or secret society can also provide just as much scope for co-operation and service as any other form, but with not such desirable ethical results. The value of games is of course self-evident, they necessarily must inspire loyalty and unselfishness, and beget a recognition of the value of team work. The resulting spirit of fellowship and self-denial is of incalculable value in later life. The same applies to the Scout troop also.

It is helpful also from the point of view of this article if the school can be affiliated with real life in some practical way in order that the service ideal may find expression. Most of the big English schools have their slum missions either worked or supported by past and present members of the school. Something approximating to this could be done in India by enlisting boys' sympathies in any humane work in the school vicinity. A visit to a hospital or even to a sick class mate provides some expression for the service ideal.

In conclusion, there is that indescribable thing the "Ethos" or tone of a school, a very complex and intangible thing, but which has tremendous force in moulding a boy's character, and it is astonishing how soon even wayward boys reflect its influence and give up habits which have not the social sanction of the school. The "noblesse oblige" spirit of the English public schools has been one of the greatest assets of England, and has conduced more than anything else to the constant supply of high minded statesmen and officials being maintained throughout the far flung Empire of Britain.

---

to manage its own affairs the better; it is all training
ıe task of corporate living. Some classes will of course
und more responsive than others, but most will enter
;he spirit of the plan.

Ihe "House" system into which some schools are
ed, especially for games, introduces a vertical cleavage
stinct from the horizontal class division where boys are
ıore or less of the same age. This does not necessarily
ct with the class unit but can be made to supplement
it develops a sense of responsibility in older boys for
small boys of their house There comes to mind the
ent in "Tom Brown's School-days" where Tom was saved
wayward paths by his responsibility for young Arthur
ı the Head with his wise foresight had assigned to
s charge. House loyalty is of course proverbial in
l literature, and serves its own purpose later on in the
loyalties of life.

How far the self-governing principle can be applied to
chool *itself* is of course a moot point. The idea seems
growing in the West, and there are a few classic
iments along this line—*viz:* the Little Commonwealth
ngland and the George Junior Republic in America.
'ollowing extract gives the point of view. "The George
r Republic is a remarkable institution ..... self-govern-
is carried to a point that with mere children would
ır whimsical, were it not a proved success. The place
s the name implies, a miniature republic, with laws,
ature, courts and administrators of its own, all made
carried out by the "little citizens" themselves. The
and the spirit appear to be excellent and there is much
nce that in many cases strong and independent
cter is developed in the children"

Whether anything approximating to this would succeed
dia is open to question—it would be wise, however, to
the class unit the first experimenting ground.

which will bring forth fruit in the matter of social responsiveness later on. The first ten years are all important from this point of view: and yet one finds many parents most anxious to eliminate this kindergarten stage as of no account and desperately keen to have their child admitted to the primary school straight away, thus depriving them of much social gain. The remark of a university professor of education to the effect that he could always tell which of his students had gone through the kindergarten attests the truth of the above statement.

In the later school stages the class unit as being the readiest to hand will provide scope for the expression of social effort. Boys should be made to realise that they are not merely just one of a number of class pupils, but of a corporate body where each member has a responsibility for the whole. The class can take up some project such as a magazine, class library, or an entertainment and carry it through themselves, each member doing his part as far as possible. Dramatisation, by teaching boys to think in terms of other peoples' lives, also begets a sympathetic attitude and outlook. All this makes for co-operation and social effort and strengthens the corporate spirit. Even to fail together in the project is by no means a loss, so long as it is a noble failure, the benefit accruing is the same. The writer has also tried marks awarded on a democratic basis by the class with good results: if a healthy spirit of generosity was at times manifested so much the better from our point of view. The voting was generally very fair and the unhealthy system of individualism incidental to the marking system seemed to disappear in the expressed collective mind of the form. The same can be done as regards discipline and punishment. It begets quite a different attitude in the culprit when the punishment has a social sanction. He accepts it as inevitable and without the resentment sometimes manifested when the punishment is arbitrarily given by a teacher. In fact the more a class can be trained,

It is essential therefore that schools should be organised, not merely on a basis of instruction and examination only. If children are social beings, to be developed under social influences, employing social relationships, and destined for social service, we need a far greater emphasis on the idea of mutual service and co-operation in our school organisation and a more general acceptance of social rather than individualistic motives. However much a man may know, his social sympathies depend on what he is in himself, and still more upon what he in fellowship with others *is becoming*, and it is in school days, where the bias is more or less permanently set, that he must be socialised and humanised.

It may be said that all this is provided for in the syllabus by moral lessons, civics etc. This is good as far as it goes, but is not sufficient as results seem to prove. There is already far too much mere passive appreciation of and talk about these things; they should be applied in the school itself in order to give a touch of active realism to them and this can be done in most schools.

From the very beginning the ideal should be latent and permeate the school organisation. The first step is the Kindergarten—all too few in this country. It is there that the child first learns of the existence of a social group independent of the family group from which he has just come, and whose influence has probably turned him out a master little egoist. Here where the rigid examination system has not penetrated much can be done to correct selfish tendencies. The child learns to share his privileges and becomes sensitive to social approval or disapproval, while the idea of mutual usefulness that underlies the kindergarten activities provides an altruistic outlet for his childish enthusiasms and he learns to think on a wider plane than his own particular interests. It is in these plastic years that a lasting bias is often set, and hence it is in the kindergarten and lower primary school that the children of the race are to be given those aptitudes and sentiments

Man may belong to himself but he does not belong to himself alone. He has always lived in the midst of a community, and education, whatever else it is, must always be a socialising process. It is not only to help the individual but it must be for him an unfolding of the social sympathies. Are we doing this in India? Is the system we see around us calculated to do it?

The very apparent material values of education along with the examination mania tend to so emphasise the individual aspect of education that it has become an extremely selfish business indeed. It is fearfully hard for a headmaster to try and do anything outside the set curriculum,—it is all looked upon as so much waste of time. Under these circumstances, all a child's interests seem to get focussed on himself, to the exclusion of those of everyone else, and there is a corresponding shutting up of his social sympathies. He finishes his education with a leaving certificate or a degree, but with a very imperfect adjustment to the complex social and civic relations of human life, and with very little altruistic bent to help him adapt himself aright to them. This fact is commented on in Mr. Mayhew's recent work on "Education of India." "The majority report of the committee appointed to consider the working of the Reforms Act, and the last annual report of Professor Rushbrook Williams on the condition and progress of India, confirm the feeling common amongst the most devoted supporters of Indian advancement, that among large masses of the population and over large areas of the country there is little sense of civil responsibility, and that even among the better educated it is by no means so strong as it ought to be............... Education has not yet established in India the feeling that the state or the township or the village have their rights and a claim to the loyalty of individuals and that it is disastrous to stop short at, or rest content with, the safeguarding of the rights and privileges of the individual, the family or the caste."

An Essential Factor in Education

BY

The Rev. F. C. PHILIP, M. A.,

Warden, St. George's Grammar School, Hyderabad, Dn.

THE History of Education reveals that a close connection exists between educational theory and the prevailing philosophical theory of the time. Hence it is not surprising that the present day should be a period of transition from an old era dominated largely by the individualistic philosophy of the last century to a new era where the new social psychology with its emphasis on the social and humanist aspect of life is gradually making itself felt. The story of civilisation is mainly the record of the development of man's social consciousness and responsibilities and the expansion of his activities resulting therefrom. From the standpoint of the race, therefore, the most important function of the school is to make the child's social relations and responsibilities real to him.

From this point of view, we may briefly define the function of the school to be that of helping the child to catch up with the race by giving him some epitome of the progressive experience of man along the hard road to knowledge which the race has pursued, and at the same time, to aid the race in its efforts at further progress and well-being by developing right "attitudes" in the pupil and making him "socially serviceable."

The first function no one questions, the body of knowledge to be imparted grows year by year until the curriculum groans under the new subjects to be taught. It is the second, or socialising aspect, that tends to be lost sight of; and yet neglect here touches the whole fabric of society and brings its own nemisis as recent sinister historical developments have shown.

Regd. Asafia No. 47.

Vol. II.] January, 1928 A. D. Isfandar, 1337 Fasli. [No. 3.

Under the Patronage of

Nawab Masood Jung Bahadur, B.A. (Oxon.),
Director of Public Instruction,

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of The Teachers' Association, Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

SECUNDERABAD-DECCAN
PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.
1928.

جلد ۲ — رجسٹر شدہ چٹھی سرکار عالی نمبر ۴ — نمبر ۴

خورداد سنہ ۱۳۳۷ ف

زیر سرپرستی عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

حلقۂ ادارت

سید علی اکبر ایم۔ اے (کنٹب)

جنرل اڈیٹر

سید فخرالحسن ملا۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)
اڈیٹر

عبدالنور صدیقی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)
جائنٹ اڈیٹر

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر دفتر انجمن اساتذہ واقع مدرسہ صدر مہتمی تعلیمات سے شائع ہوا

فہرست مضامین

جلد ۲ بابتہ ماہ خورداد ۱۳۳۷ف م اپریل ۱۹۲۸ء نمبر ۴

ہندوستان کواپریٹیو انشورنس کمپنی لمیٹڈ

(صدر دفتر کلکتہ)

خالص ہندوستان بیمہ کمپنی

سرمایہ زاید از ۸۰۰۰۰۰ روپیہ جائداد کاروبار بابتہ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء

زائد از ۶۰۰۰۰۰ روپیہ۔

آخری منافعہ بخیالہ (بابتہ ۱۹۲۲ء) ۷۵ روپیہ ہزار آیندہ منافعہ (بابتہ ۱۹۲۶ء لغایت ۱۹۲۸ء) اس میں ایک معتدبہ رقم کی توقع کیجاتی ہے

توسیع بالذات بابتہ ادائی قسط بیمہ، قرض قیمت بازگشت اقساط اور تجدید پالیسی منقضی شدہ وغیرہ کے متعلق نیا ضابطہ شرائط شرح قسط بیمہ (یا منافعہ) کافی کم رکھا گیا ہے اور شرح بلامنافعہ سب سے کم ہے۔ لہذا "ہندوستان" میں ہی اپنی زندگی کا بیمہ کرو۔ اگر اپنی ذات اور خاندان کی کفالت سے مطمئن رہیئے۔ سب ایجنسی کے لئے درخواست مطلوب ہیں۔ ماہانہ تنخواہ (۵۰ سے ۱۰۰ تک) بہترین شرائط گارنٹی شدہ کاروبار کے لئے۔

تفصیلی معلومات کیلئے مندرجہ ذیل پتہ پر دریافت فرمائے۔

یس جی نائیڈو۔ نارائن آشرم۔ (ترپ بازار حیدرآباد دکن)

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عسـ	صہ ۸ر	ے
نصف "	صہ	عاں ۱۲ر	عہ ۸ر
ربع "	عاں ۸ر	عہ ۶ر	۱۲ر
فی سطر "	۱۰ر	۸ر	۶ر

افتتاحیہ

معتمد صاحب مجلس انتظامی خیرخواہان مسلم یونیورسٹی گلبرگہ نے اصلاح مسلم یونیورسٹی سے متعلق ایک تفصیلی تحریک بغرض اشاعت بھیجی ہے اور مختلف نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم سے استدعا کی ہے کہ بحالت موجودہ نواب مسعود جنگ بہادر یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری کے لئے ہر طرح موزوں ہیں۔

جن واقعات کا انکشاف کمیشن کی رپورٹ سے ہوا ہے۔ وہ اس واحد اسلامی درس گاہ کے لئے باعث صد افسوس ہیں۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ایثار سے کام لے۔ ہمدرد دل پہلو میں فکر معاش سے مستغنی ہو، سر سید کی جادو بیانی اور کشش ہو اور جسٹس محمود کی طرح صاحب تدبیر ہو یہ سب باتیں بدرجہ اتم نواب مسعود جنگ بہادر میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک نواب صاحب ہر حیثیت سے پرو وائس چانسلری کے لئے موزوں ہیں اور یہ قبائی زرنگار آپ ہی کو زیب دے گی۔

رسالہ کی غایات میں انجمن اساتذہ بلدہ کے مفید مضامین کی اشاعت بھی داخل ہے لیکن اس غایت کے تحت اب تک ایک مضمون بھی شائع نہیں ہوا سابقہ نمبر سے انجمن اساتذہ کے مضامین کے لئے ایک مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے۔ لہذا مقامی معتمدین انجمن سے استدعا ہے کہ ماہانہ جلسوں میں جو تقریر عمدہ اور قابل اشاعت ہو اس کی ایک کاپی ماہ بماہ دفتر رسالہ پر بھیجدیا کریں تاکہ جو مضمون سب سے اچھا ہو وہ شائع کردیا جایا کرے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تعلیمی خصوصیات

از جناب کے ایس وکیل صاحب ایم اے ایڈ صدر مہتمم تعلیمات حلقۂ شمالی صوبہ بمبئی

دور حاضرہ میں اصول و عمل تعلیم کے علمبردار امریکہ والے ہیں۔ جدید طریقہائے تعلیم ڈالٹن پلین۔ گیری اسکیم، پراجکٹ متھڈ، جنہوں نے دنیائے تعلیم میں انقلاب پیدا کردیا ہے، امریکی ماہرین فن تعلیم کی دماغی کاوشوں کے نتیجے ہیں۔ لیکن جو تعلیمی فضا امریکی مدارس میں پھیلی ہوئی ہے اس کا کتابی ذکر ہندوستانیوں کے لئے قصہ الف لیلہ ہے ہمیں امید ہے کہ وکیل صاحب نے امریکہ کی تعلیمی خصوصیات کی جو زندہ تصویر کھینچی ہے وہ ہمارے تعلیمی اداروں کے لئے چراغ ہدایت ہوگی

اڈیٹر

پہلی قابل ذکر چیز جو میں نے امریکہ میں دیکھی وہ یہ ہے کہ ہر جگہ عوام کی تعلیم کا نہایت فراخ دلی سے انتظام کیا گیا ہے۔ مختلف ریاستیں، مرکزی حکومت اور تمام امریکی لوگ تعلیم کو ایک مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں۔ جس کی انجام دہی میں مصارف کا خیال نہیں کرتے لوگ عملاً روز افزوں مطالبوں کو خوشی خوشی منظور کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دینے کی از حد فکر ہے۔ ایسی تعلیم پرستی دنیا کے کسی اور حصہ میں مشکل سے نظر آئے گی۔ مدرسوں اور کالجوں کی عمدہ عمدہ عمارتیں اور ساز و سامان، کتب خانے، معمل، عجائب خانے، دنگل، بازیگاہیں، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچی تنخواہوں والے نظماء، صدر، پروفیسر اور اساتذہ ان کی تعلیمی دلچسپیوں کے زبردست ثبوت ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں ایک آزادانہ لیکن نہایت منضبط فضا پھیلی ہوئی ہے۔ نظماء، پروفیسر، اساتذہ اپنی رائے، خیالات اور تعلیم کا سکہ مددگاروں اور

طلباء پر نہیں بیٹھاتے بلکہ جس وقت اور جس طرح ضرورت ہو ان کی دوستانہ ہدایت و رہبری کرتے ہیں۔ اساتذہ کے طریق عمل کی تبدیلی نے بڑی حد تک طلباء کا زاویہ نگاہ بدل دیا ہے۔ اور وہ تعلیم کو ایسا کام نہیں سمجھتے جو اعلیٰ عہدہ داروں نے ان کے سر چپیٹ دیا ہے۔ بلکہ جسے انھوں نے اپنی رضا و رغبت سے اختیار کیا ہے۔ اس لئے اب طلباء آزادی سے بلا تامل اظہار خیالات کرتے ہیں۔ اس تبدیلی نے تمام تعلیمی فضا کو بدل دیا ہے اور جو پہلے اساتذہ کے لئے غیر دلچسپ فرض منصبی اور طلباء کے لئے مجہول و بے مزہ تعلیم تھی۔ وہ اب زندگی بخش عمل تدریس یا خود آموزی بن گیا ہے، جس میں کوئی استاد مداخلت بیجا نہیں کرتا۔ استاد موجود رہتا ہے لیکن ہدایت و امداد کے لئے، نہ کہ حکومت و فرمانروائی کے لئے۔ حال ہی میں کتب بینی مدرسہ کے روزمرہ کام کا جزو سمجھی جانے لگی ہے۔ اس سے عمل خود آموزی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ اس کے لڑکوں میں ذاتی سعی، خود اعتمادی اور تحقیقات کا جذبہ اوائل عمر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ جذبہ جو عادت کتب بینی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہے۔ جفاکش مصنفین کی زبردست نسل قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک اور بات جس کا مجھ پر بیحد اثر پڑا وہ یہ ہے کہ اساتذہ اپنے اپنے مضامین میں صحیح اور جدید ترین معلومات رکھتے ہیں۔ اس سے صریحاً وہ طلباء کے کام کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ وہ کتب درسی کی غلامانہ قیود سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اور اپنی تنگ حد بندیوں سے نکل چکے ہیں۔ وہ مقررہ کتب درسی کی پابندی نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا خاکہ خود تیار کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اساتذہ کمرۂ جماعت کے باہر بھی کام کرنے کے آرزومند نظر آئے۔ بلکہ کتب خانوں، معمل خانوں، عجائب خانوں اور باغیچۂ مدرسہ اور دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس سے مدارس خود بخود اپنی پرانی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اور درس و تدریس میں واقعیت پیدا ہو گئی ہے۔

ایک اور خوش گوار منظر یہ تھا کہ اساتذہ اپنے شاگردوں کو انسان سمجھنے لگے ہیں اب وہ بچوں کے سوالات کو غور و تحمل سے سنتے ہیں۔ اور تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ضبط مدرسہ، انتظام بازیگاہ اور دوسری سرگرمیوں میں مدد لیتے ہیں اور ان کی اجتماعی رائے کی وقعت کرتے ہیں۔

طلبا بھی تمام کاموں میں اپنے اساتذہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اور مدرسہ کے ضبط، وقعت، اور عزت برقرار رکھنے اور روایات قائم کرنے میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں اب وہ اپنے معاملات خود طے کر لیتے ہیں اور ان کے اساتذہ کو اس بارگراں سے سبکدوشی حاصل ہو گئی ہے۔ اساتذہ کو اب فرصت مل گئی ہے کہ وہ تمام تعلیمی سرگرمیوں اور دوسرے کاموں میں طلبا کی رہنمائی کا خوش گوار تر فریضہ انجام دیں حقیقت میں بچے آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور سے اپنے حقوق حاصل کر رہے ہیں۔

بایں ہمہ امریکی نظام تعلیم میں روحانی عنصر کی کمی نظر آتی ہے حالانکہ اسی سے وسعت نظر اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور تزکیہ نفس، سکون قلب اور فراغ خاطر ظہور میں آتا ہے۔ امریکی مدارس کالجوں اور جامعات سے تنو مند دل مرد اور عورتیں نکلتے ہیں جو ملک کی مادی دولت بڑھانے کے ہر طرح قابل ہوتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں میں وہ آزاد خیالی ہوتی ہے جو فرقہ واری حد بندیوں کو توڑ دے اور جس کے اثر سے اہل امریکہ کی نظریں اپنے ساحل سے پار دوڑیں اور وہ تمام نسلوں اور قوموں کو ایک ہی آدم کی اولاد سمجھنے لگیں۔

(اقتباس)

۵

مدارس میں اجتماعی زندگی کی تربیت

از

جناب محمد عثمان صاحب بی اے بی ایڈ (لیڈز) وائس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج بلدہ

غالباً اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے کہ تدریس کے کام کی تقسیم مدرسین کی بعض تنخواہ اور ڈگریوں کے لحاظ سے نہیں کی جاتی ہے بلکہ اس کا انحصار زیادہ تر اُن کی طبیعت قابلیت اور تجربہ پر ہوتا ہے۔ جب تدریس جیسے آسان کام کے انتظام میں ایسی احتیاط برتی جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ تعلیم کا زیادہ عظیم الشان اور اہم تر پہلو ہماری توجہ او غور وخوض کا کس قدر محتاج نہ ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ کسی مدرسۂ وسطانیہ میں ایک نوآموز ایف اے یا بی اے۔ اور دو میٹرک کامیاب تجربہ کار اساتذہ متعین ہیں ایسی حالت میں ہر سمجھ دار صدر مدرس مڈل کی جماعت کی تعلیم کے لئے تجربہ کار میٹرک کامیاب مدرس کو نوآموز اور ناتجربہ کار ایف اے یا بی اے پر ترجیح دے گا تقسیم کار کیوقت مدرسین کے طبائع پر بھی غور وخوض کرنا نہایت ہی اہم ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بعض مدرسین بالطبع ہمدرد۔ خوش طبع اور ملنسار ہوتے ہیں اور بعض کو الگ تھلگ اور خاموش رہنے کی عادت ہوتی ہے ایسی حالت میں چھوٹی جماعتوں کا کسی ہمدرد۔ خوش طبع اور ملنسار مدرس کے تفویض کیا جانا خالی از مفاد نہیں۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کی تربیت کا نظام العمل مرتب کرتے وقت صدر مدرس کو چاہئے کہ اپنے مددگاروں کے طبائع پر غور کرے کہ کونسا مدرس کس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتا ہے مثلاً بعض مدرسین بالطبع بحث مباحثہ کی صلاحیت رکھتے ہیں بعض کو کھیلوں کے انتظام اور انصرام کا خاص ملکہ ہوتا ہے اور بعض کو قدرت ادبی ذوق سے متنفر کرتی ہے۔ ان امور پر نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد

صدر مدرس اپنے اسٹاف سے اجتماعی زندگی کی تربیت کے متعلق تبادلہ خیالات کرے اور ہر مدرس کو کسی نہ کسی مجلس یا کلب کا جس کے لئے وہ بالطبع موزوں ہو صدر مقرر کرے اور وقتاً فوقتاً انھیں اپنے تجربہ اور قابلیت سے افادہ کا موقع دیتا رہے۔

ذیل میں ان مجلسوں اور کلبوں کی فہرست دی جاتی ہے جو اجتماعی زندگی کی تربیت میں ممد و معاون ہوتی ہیں اور ان میں سے بعض کے انتظام و انصرام کا طریقہ بھی مثال کے طور پر مختصراً بیان کرنے کی معافی چاہی جاتی ہے (۱) مجلس مباحث (۲) دار المطالعہ (۳) پور فنڈ (۴) اسکول جرنی کلب (۵) ڈرامائک سوسائٹی (۶) اولڈ بائز کلب (۷) مجلس ادبیات (۸) مجلس تاریخ (۹) مجلس جغرافیہ (۱۰) اسکوٹس کلب۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ تبادلہ خیالات سے معلومات میں اضافہ ہوتا اور مختلف مبحثوں کے قوی اور کمزور پہلو سے آگاہی ہوتی ہے۔ گو طلباء آپس میں تبادلہ خیالات اور بحث مباحثے کرتے رہتے ہیں تاہم ایسے مباحث کئی ایک وجوہ سے زیادہ مفید اور بار آور ثابت نہیں ہوتے پہلی وجہ یہ ہے کہ طلبا کے تبادلہ خیالات کا دائرہ اکثر و بیشتر صرف درسی کتب کے مضامین ہی تک محدود رہتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ طلبا کے معلومات میں کافی وسعت نہ ہونے کی وجہ سے کسی مبحث کے اطراف و جوانب پر کافی روشنی ڈالی نہیں جا سکتی۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ ان مبحثوں میں آیندہ زندگی کے اہم مسائل کو کوئی جگہ نہیں دی جاتی اور چوتھی وجہ کسی ہمدرد رہنما کی عدم موجودگی ہے جو طلباء کے غور و تامل کے لئے اُن کے سامنے انوکھے اور اہم مسائل پیش کرے اور جن کتب میں ان مبحثوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اُن کی نشان دہی کرے تاکہ طلبا ان کتابوں کا مطالعہ کرکے اپنے معلومات میں اضافہ کریں اور بحث مباحثہ کے لئے کافی طور پر تیار ہو سکیں۔ متذکرۂ صدر وجوہ کے علاوہ ایسے خانگی مباحث میں طلبا کی تعداد شاذ و نادر ہی چھ سات سے متجاوز ہوتی ہے بلکہ عموماً دو تین ہی تک محدود رہتی ہے ایسی حالت میں طلبا کسی بڑی جماعت سامعین کے روبرو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے

عادی نہیں ہوتے اور بوقت ضرورت رعب مجلس اور فطرتی حجاب کی وجہ سے اپنے
دعویٰ کو دلایل و براہین سے ثابت کرنے میں قاصر ہوتے ہیں۔ انگلستان کے مایہ تخر و ناز
ادیب اڈیسن کے حالات اور اس کی قوت تکلم کی حقیقت سے ناظرین واقف ہوں گے کہ
ایسے زبردست نثار کی قوت گویائی صرف ایک اجنبی کے آمد سے کس طرح سلب ہو جاتی تھی
اس لئے ضرورت اور سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ مدارس میں ایک ایسی مجلس قائم
کی جائے جس میں بشرط امکان ہفتہ واری ورنہ مہینہ میں دوبارہ یا کم از کم ایک دفعہ کسی
موضوع کے متعلق اساتذہ اور طلباء اظہار خیالات کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی کے
قیام اور ایسے جلسوں کے انعقاد سے طلبا کی طبیعت سے حجاب اور جھجک دفع اور
ان کی طلاقت لسانی میں ترقی ہوتی ہے اور ان میں اپنے خیالات کو ایک موزوں
اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں پیش کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کے علاوہ ہر بحث کے
قوی اور کمزور پہلوؤں سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کرنے کا شوق اور مادّہ پیدا ہوتا ہے۔
اس مقصد کے حصول کے لئے ابتدائی جماعتوں ہی سے کوشش کی جاتی ہے۔ اور اسی لئے
چھوٹی جماعتوں میں ریڈنگ پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے اور طلباء کو جماعت کے روبرو
کسی کہانی کے دہرانے یا کسی دلچسپ مضمون پر اظہار خیالات کی ترغیب دی جاتی ہے
جس سے طلباء کے خیالات میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی اور ان کی طلاقت لسانی میں اضافہ
ہو جاتا ہے اور فطرتی حجاب و رعب مجلس دفع ہو کر حاضر دماغی و حاضر جوابی کی سی نعمت
حاصل ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے صدر مدرس کو اس مجلس کے قیام سے پہلے کسی لایق دیرینہ کار
ہمدرد اور ہر دلعزیز مدرس کا انتخاب کرنا چاہئے جو مجلس مباحثہ کی اہمیت اور اس کے
چلانے کے طریقہ سے بخوبی واقف ہو اور جو طلباء کو اس مجلس میں شرکت کی ترغیب و تحریص
دلا سکتا ہو۔ اگر ابتدائی جماعتوں سے بچوں میں تقریر کرنے کا مادہ بڑھایا جائے تو شرکت مجلس کے لئے

زیادہ کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود طلبا جماعت واری تقاریر کے مدارج طے کرنے کے بعد مدرسہ کی مجلس مباحث میں حصہ لینے کے فطرتی طور پر خواہاں ہو جاتے ہیں۔ شرکت طلبا کے بعد سوسائٹی کے اغراض و مقاصد اور قواعد وغیرہ مرتب کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے یہ بہت مشکل کام ہے لیکن مدرس کی رہنمائی اور مدد سے بڑی جماعتوں کے طلبا اس زینے کو بھی طے کر سکتے ہیں یعنے مدرس اپنی صدارت میں طلباء کے ذریعہ مجلس کے مقاصد۔ حدود قواعد۔ اخراجات وغیرہ مرتب کرائے مثلاً سوسائٹی کا مقصد معلومات کی وسعت اور قوت گویائی کی تربیت قرار دی جائے۔ اس کے حدود کے تحت یہ طے کر لیا جائے کہ محض اخلاقی تعلیمی اور ایسے اجتماعی مضامین داخل ہوں گے جن میں تلخ اختلافات کا اندیشہ نہ ہو قواعد کے تحت عہدہ داران مجلس کی تعداد۔ عہدوں کے نام۔ مدت عہدہ داری۔ حقوق رائے زنی۔ انتخاب کا طریقہ۔ خلاف ورزی قواعد مجلس کا تدارک وغیرہ کا تصفیہ کیا جائے اخراجات کے تحت صادر کی ضرورت اور اس کی فراہمی۔ تعین صادر۔ فیس وغیرہ کے متعلق چند قواعد مرتب کر لئے جائیں۔

اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ متذکرہ صدر قواعد و ضوابط کو ضبط تحریر میں لایا جائے گا تاکہ بوقت ضرورت اس سے مدد لی جا سکے۔ ان ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد صدر مدرس بشرط امکان مدرسہ کی عمارت کا کوئی ایک کمرہ اس مجلس کے لئے مخصوص کر دے گا ورنہ اس سوسائٹی کے جلسوں کا انعقاد ہفتہ واری یا ماہانہ جیسا کہ قواعد کے تحت تصفیہ پایا ہو مدرسہ کے کسی بڑے کمرے میں ہوا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں طلباء کو انتخاب عہدہ داران کے طریقے معلوم نہ ہوں گے اس لئے مدرس متعلقہ جو مجلس کا صدر ہوگا طلبائے رائے دہندہ کی رہبری کرے گا کہ اس مجلس کے عہدہ داروں میں کون کونسی خصوصیات ہونی چاہئیں۔ مضامین کا انتخاب بھی ایک اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس لئے ابتدا میں مدرس ہی کو مباحث کے لئے موضوع تجویز کرنے پڑیں گے طلباء کو کسی بحث کے

موافق اور مخالف تقریر کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا اور اُن کتابوں کی نشان دہی کرنی ہوگی جن میں بحث مجوزہ کے متعلق کافی مواد مل سکتا ہو۔

اگر صدر مدرس اور اسٹاف مدرسہ بھی اس سوسائٹی کے مشاغل و وظائف میں کافی دلچسپی لیا کرے تو یہ انسٹیٹیوشن زبردست منطقی اور لایق مقرر پیدا کرنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں جو مدرسہ اپنے تعلیمی پروگرام میں اس سوسائٹی کو جگہ نہیں دیتا وہ اپنے ایک اہم ترین فرض کی ادائی سے پہلو تہی کرتا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر عالی قدر جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر نے اپنے خطبہ صدارت میں بالکل صحیح فرمایا کہ تعلیم کا مقصد لایق۔ قابل اور ہونہار شہری بنانا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں مجلس مباحث کا بھی بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ اس کی کارفرمائیاں مدرسہ کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ایک لایق صدر مدرس کی نگرانی اور ایک قابل مدرس کی رہنمائی سے جو مجلس مباحث کا صدر ہو اس سوسائٹی کے اعمال و مشاغل کا دائرہ وسیع ہو کر کسی صوبہ یا ضلع یا تعلقہ یا دیہات کے عہدہ داروں تک پہنچ سکتا ہے بالفاظ دیگر مجلس کا دائرہ عمل عہدہ داران مقامی کی ہمدردی حاصل کرے گا جس کے لئے ان کو بعض اوقات مجلس کے جلسوں میں مدعو کرنے کی ضرورت داعی ہوگی۔ اس دعوت کو شرف قبولیت حاصل ہوتے ہی اسی سے متعلق بیسیوں مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مثلاً تعداد طلبا۔ انتظام نشست۔ مہمانوں کے مراتب اور ان کی نشست کا انتظام۔ استقبال۔ صدارت جلسہ اور اس کی تجویز و تائید عصرانہ اگر مجلس کی مالی حالت اجازت دے۔ رخصت۔ غرض کہ ایسے ہی بہت سے اہم مسائل سے جو طلبا کی قابلیت اور تجربہ کا لحاظ کرتے حقیقتاً بہت ہی اہم ہوتے ہیں طلبا کو دوچار ہونا پڑتا ہے مگر جو لایق صدر مجلس کی رہنمائی۔ ہمدردی اور مدد سے بہت سہولت اور آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ اسی مجلس کو کسی عہدہ دار مقامی کی ترقی پر تہنیت نامہ یا اس کے کسی عزیز کے انتقال پر تعزیت نامہ پیش کرنا ہوگا ہمارے خیال میں کسی سمجھ دار

شخص کو اس امر سے انکار نہ ہوگا کہ مدرسہ کے چار دیواری سے باہر قدم رکھتے ہی طلبا کو شادی بیاہ میں حصہ لینا اور رنج و خوشی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر طلبا کو مدرسہ میں اس اجتماعی زندگی کی تربیت نہ دی جائے تو کیا آیندہ چل کر وہ ایک لایق اور ہونہار شہری بن سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

طلبائے مدارس کا معائنۂ طبی

(از)

جناب ڈاکٹر محمد لطیف سعید ایم بی، سی، ایچ، بی (اڈنبرا)

ذیل میں ہم جناب ڈاکٹر محمد لطیف سعید کی اس تقریر کا جو انہوں نے گزشتہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں کی تھی اقتباس پیش کرتے ہیں۔ کانفرنس مذکور کی سالانہ رپورٹ میں بھی اس تقریر کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی خاص عنایت سے ہمیں بھی اس تقریر کا اقتباس شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں

ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آیندہ اشاعتوں میں بھی بچوں سے متعلق امراض مثلاً نزلہ کے، مینی دوربینی یا زاویۂ نظر کی خرابی وغیرہ پر قلمی امداد سے دریغ نہ فرمائیں گے

(جائینٹ اڈیٹر)

طلبائے مدارس کے معائنۂ طبی کی تحریک ۱۹۲۷ء میں آپ حضرات کے سامنے پیش ہو رہی ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم تہذیب و ترقی کے کس زینہ پر ہیں۔

اب بھی اس اہم ضرورت کی طرف کافی توجہ کی جائے تو غنیمت ہی سمجھنا چاہیئے۔

قبل اس کے کہ معائنہ طبی کی ضرورت ثابت کی جائے اور اس کے فوائد کا اندازہ کیا جا سکے یہ ضروری ہے کہ "صحت" اور "بیماری" کے صحیح مفہوم کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں "صحت" جسم، دماغ، اور جملہ اعضاء کی اس خاص کیفیت کا نام ہے جس کے تحت ہر عضو اپنے اپنے فعل کو سہولت کے ساتھ انجام دیتا ہے۔ اور یہ کیفیت اسی وقت ممکن ہے جبکہ نہ صرف ہر عضو الگ الگ اپنا کام کرے بلکہ بصورت ضرورت ایک دوسرے کی شرکت اور اعانت کرتا ہے قدرت (نیچر یا طبیعت) میں اعضا کی ایسی باہمی امداد لازمی اور خلقی ہے۔ اس لئے صحت کو ایک لازمی اور معمولی کیفیت قرار دیا جاتا ہے۔ جب کسی عضو کے اس انفرادی یا اجتماعی فعل میں کوئی خرابی یا رکاوٹ چاہے وہ کسی وجہ سے کیوں نہ ہو پیدائش کے قبل یا پیدائش کے وقت یا زندگی کے کسی حصہ میں پیدا ہو جاتی ہے تو ہم اس رکاوٹ یا خرابی کے نتیجہ یا اثر کو "بیماری" کہتے ہیں۔ چونکہ یہ رکاوٹیں یا خرابیاں ہماری ہی پیدا کردہ ہوتی ہیں اس لئے ہم بیماری کی اس کیفیت کو غیر لازمی تصور کرتے ہیں۔

سائنس کے بعض شعبوں کے علم اور تجربوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بیماری غیر لازمی اور ہمارے ہی یا ہمارے آبا و اجداد میں سے کسی نہ کسی کی بھول چوک یا غلطی کا نتیجہ ہے اس ثبوت کی مزید تصدیق دنیا کے ان مہذب قوموں کے جدید کارنامے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ انہوں نے متعدد مہلک بیماریوں میں مسلسل اور مستقل کمی کے علاوہ بعض بیماریوں کی قطعی بیخ کنی کر دی ہے۔

جب "صحت" اور "بیماری" کی اس تعریف کو مان لیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیماری کے اسباب کی بیخ کنی ہی "بیماری" کا واحد اور مستقل علاج ہو سکتی ہے "بیماری" کے اسباب دو ہی ہو سکتے ہیں (۲) ذاتی یا شخصی " آبائی اسباب کی تعریف میں وہ تمام بیماریاں شریک ہیں جن کی ذمہ داری صرف کسی کے باپ، دادا، ماں،

نانا یا نانی تک ہی محدود نہیں بلکہ پچھلے تمام نسلوں میں سے کسی نہ کسی ایک نسل میں پیدا ہوئی ہوں۔ اسی طرح "ذاتی یا شخصی اسباب" میں ان تمام بیماریوں کا شمار ہے جو کسی ایک خاص شخص کی غلطی یا لاعلمی سے دوسری معصوم ہستیوں پر عاید ہوتی ہیں۔ ان دونوں وجوہات کا سلسلہ عام طور پر کم و بیش ہر سوسائٹی اور خاص طور پر ایشیائی ممالک میں اب تک جاری ہے جدید علم طب نے اس سلسلے کو توڑنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے یہ طریقے اختیار کئے ہیں۔ دواؤں وغیرہ کے استعمال سے جان بچانے کی کوشش کے ساتھ مریض کو حتی الامکان درد اور تکلیف سے نجات دی جائے (۲) حفظان صحت کے علم کے ذریعہ لوگ ایسی زندگی بسر کریں کہ عام بیماریوں اور خاص وباؤں سے محفوظ رہ سکیں اور رفتہ رفتہ بحد امکان بیماری کے جملہ اسباب ایک ایک کرکے دور کئے جائیں (۳) شادی کرنے والوں کو ان غلطیوں سے آگاہ کر دیا جائے اور ان کے برے اثرات سے محفوظ رکھا جائے جن کا شکار زندگی میں یا خود وہ ہونے والے ہیں یا ان کی معصوم اولاد جنہیں خواہ مخواہ آبائی میراث ملتی ہے۔ بیماری سے لڑائی کا جب یہ پروگرام ٹھیرا تو ایسی صورت میں اس سے بہتر کونسا طریقہ ہو سکتا ہے کہ بچوں ہی سے اس کام کی ابتدا کی جائے جو نہ صرف قوم کی آنے والی نسل ہیں بلکہ اور آیندہ نسلوں کے باپ ہیں۔ طلبائے مدارس کے معائنہ طبی کے انتہائی اور مفید ترین نتائج خصوصاً ان ملکوں میں برآمد ہو سکتے ہیں جہاں جبری تعلیم رائج ہے۔ اور ملک کے ہر بچے کا مدرسہ کے دروازہ سے گزرنا لازمی ہے۔ اگر ممالک محروسہ سرکار عالی میں تعلیم اس درجہ نہیں پہنچی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ موجودہ مدارس ہی سے اس اہم کام کی ابتدا نہ کی جائے

وہ پہلی قوم جس نے طلبائے مدارس کے معائنہ طبی کو رواج دیا جرمن ہے انہوں نے آج سے تقریباً ساٹھ سال قبل اپنے ملک کے ایک حصہ میں اس کی ابتدا کی اور اب یہ حالت ہے کہ معائنہ طبی دنیا کے ہر مہذب ملک کے معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں داخل ہے۔

معائنہ طبی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جب لڑکا ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسہ میں شریک ہوتا ہے

تو ایک سطبوعہ تختہ کی خانہ پری کی جاتی ہے جس میں بچے کا نام عمر ولدیت، سکونت وغیرہ کے علاوہ قد وزن وغیرہ بھی درج کرکے معائنہ طبی میں جن جن نقائص کا پتہ چلے ان کا اندراج کیا جاتا ہے اس کے بعد بچے کے والدین و وصی کو اس کی پرورش نگہداشت اور علاج وغیرہ کے متعلق ہدایات دیے جاتے ہیں اور کسی خاص نقص کے انسداد کی طرف خاص توجہ دلائی جاتی ہے۔ آخر میں چلکر ہر بچہ کی ایک مثل تیار ہو جاتی ہے جو مدرسہ کے "شاخ معائنہ طبی" کے دفتر میں رکھی رہتی ہے اور جب بچہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی پاتا ہے۔ تو اس کی مثل میں گزشتہ اور موجودہ حالت کا مقابلہ کرکے نئے اندراجات کئے جاتے ہیں یہی عمل طالب علم کے ختم تعلیم تک جاری رہے تو ظاہر ہے کہ اس کی صحت پر مسلسل نگرانی رہ سکتی ہے اور متعدد اہم امور کا استنباط کرنا تھوڑے غور و فکر سے بآسانی ممکن ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ڈاکٹر اس کام کے لئے مخصوص کر دیا جائے یا نہیں اور یہ سوال کہ ایسے ڈاکٹر کا تعلق محکمہ طبابت سے رہے یا تعلیمات سے اس کا تصفیہ گورنمنٹ کے ذمہ ہے۔ البتہ گورنمنٹ کا اس امر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ میڈیکل افسر مذکورہ طریقہ کی پیروی میں اسکیم کی اصلی غایت کو کھو نہ بیٹھے ایسی فروگزاشت اکثر مشرقی حکومتوں کی رعایا کی قسمت میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اب ان چند امراض کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا انسداد شروع میں ہو جانا آسان ہے جس میں تاخیر ہونے سے متعدد خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

(۱) پیدائشی خرابیاں۔ جسم کی ساخت مثلاً ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں وغیرہ میں بعض ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ بچپن ہی میں عمل جراحی سے ہاتھ پاؤں جیسے مفید اعضاء کو بیکار ہونے سے بچا لیا جا سکتا ہے۔

(۲) کان کے بعض امراض ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طرف وقت پر توجہ کرنے سے سماعت جیسی نعمت ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جانے سے بچائی جا سکتی ہے۔

(۳) بعض امراض چشم ایسے ہیں جن کے علاج میں معمولی سی غفلت بینائی جیسی نعمت
ہمیشہ کے لئے ناقص کر سکتی ہے۔

(۴) امراض جلد اگرچہ اکثر عارضی ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات جسم پر مختلف قسم کی
بدنمائیاں ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔

(۵) امراض خبیثہ ان میں سے ایک خاص مرض ہے جو مریض کی اولاد میں بھی
بیرونی اور اندرونی خرابیاں پیدا کر سکتا ہے۔ جن کے نتائج سے اولاد عمر بھر مختلف
بیماریوں میں مبتلا رہتی ہے۔ معائنہ طبی کے ذریعہ صرف اس ایک مرض ہی کا وقت پر
ہو جائے تو ہزاروں انسان نہ صرف خود تکلیف سے نجات پا کر اپنی زندگی کو مفید بنا
بلکہ خود اپنی نسلوں کو اس زہر قاتل کے اثر سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

(۶) ملیریا ہلکے ہلکے متعدد ملیریا کے حملے جن کو عام طور پر بخیر سمجھا جاتا ہے ایک
کیفیت پیدا کرتے ہیں جس سے بچے کمزور کاہل اور مردہ دل ہو جاتے ہیں اگر طحال بڑھ جا
چہرہ زرد اور بھوک کا صاف نہ ہونا وغیرہ جیسی علامتیں پائی جاتی ہیں ان علامات اور ان
اسباب کی طرف کافی توجہ نہ کی جائے تو مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ا
تقریباً عمر بھر باقی رہتا ہے۔ معائنہ طبی کے پورے نتائج اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں جب
بچوں کے والدین مدرسہ کے صدر کی مدد کرتے ہیں۔ اس میں نہ صرف خود ان کا فائدہ
بلکہ اس طرح مدد سے دوسری مخلوق کو محفوظ رکھنے کا ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ بعض متعد
امراض مثلاً چیچک خسرہ خارش کالی کھانسی وغیرہ ایسے ہیں کہ ان سے متاثر گھروں
تندرست بچوں کا بھی مدرسہ جانا دوسرے بچوں کے لئے مضر ہیں۔ اس لئے جب تک
والدین اس کا خیال نہ رکھیں تو یہ ظاہر ہے کہ نہ صرف غیر لڑکوں بلکہ جملہ عزیز و اقارب
صحت پر اثر پڑنے کا سخت احتمال ہے۔

ستمبر ۱۹۲۷ء میں بنارس کے ہلت انسر نے مدارس صوبجات متحدہ کے معائنہ طبی

رپورٹ پیش کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ ہر سو مدرسہ جانے والے بچوں میں صرف ۸، ۷ تندرست اور اوسط سے بہتر پائے گئے ۲۰، ۵ اکی صحت صرف اوسط درجہ پر تھی اور باقی اوسط سے گرے ہوئے غیر تندرست اور مختلف چھوٹی یا بڑی ذاتی یا موروثی عارضی یا دوامی مگر قریب قریب سب قابل علاج بیماریوں میں مبتلا پائے گئے۔

حیدرآباد کے بارہ سالہ تجربہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی حالت اس سے ہرگز بہتر نہیں ہے ایسی صورت میں جب یہاں درختوں کی پرداشت اور ان کی پیداوار میں بہتری کی کوشش کی جائے اور نسل چوپایہ کی افزائش اور بہتری کے لئے ایک سرکاری محکمہ تک مخصوص ہے لیکن طلبار کے معائنہ طبی کی طرف قطعاً توجہ نہ کی جائے تو ماسوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

طلبا کی اخلاقی تربیت

اکثر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تعلیم و تربیت دو مختلف الاصول شعبے ہیں بلکہ نصاب کی تعلیم ہی اخلاق کی تربیت ہے۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ ورنہ اولاً ایک محض خواندہ اور ایک کرے تربیت یافتہ کا وجود ہی مفقود ہو جائے اور ثانیاً ان میں کوئی مابہ الامتیاز صورت باقی نہ رہے۔ اس تردید کے قطع نظر علم و اخلاق کی لغوی و اصطلاحی معانی کا مختلف المطلب ہونا خیال مذکور کی تکذیب کے لئے تائید مزید کا محتاج نہیں ہے۔ ایک اور عام غلط خیال یہ ہے کہ اخلاقی تربیت زیادہ تر خوف و سزا کے ذریعہ کی جا سکتی ہے چنانچہ اس کی تائید میں ایک تند خو سزا دہندہ استاد کی ساعت تعلیم میں طلبا کی مہذب نشست و برخاست اور خاموشی

حرکات وسکنات کا بہترین اخلاقی نمونہ مقابلتاً پیش کیا جاتا ہے۔ جو در اصل دھوکے کی ٹٹی ہے
جس کی آڑ میں جبر و تشدد نے اخلاق کے حقیقی خط و خال کو پوشیدہ طور پر مسخ کر دیا ہے۔ چنانچہ
خوف و سزا کے زیر اثر افعال میں استحکام و بے تکلفی کو ہرگز دخل نہیں ہوتا۔ اور یہ دونوں حالتیں
ایسی ناگزیر ہیں کہ ان کے بغیر حسن خلق کا اطلاق سرتا پا غلط ہو جاتا ہے۔ یہ لغو خیال بھی پسند
عام ہے کہ جب طلبا کی عقل پختہ اور تعلیم موثر ہو جائے گی تو اخلاق خود بخود سنور جائیں گے
کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو زمانہ تعلیم و تربیت کے لئے مخصوص و مفید ہے اُسے
ناموزوں اور قبل از وقت قرار دیا جاتا ہے۔ کیا اس بین مشاہدے سے بھی اغماض
کیا جا سکتا ہے۔ کہ بدقسمتی سے جو افراد اس ناعاقبت اندیشانہ خیال کے تحت مطلق العنان
رہے ہیں وہ فارغ التعلیم ہونے کے بعد بھی اخلاقی تربیت کا کوئی عمدہ نمونہ پیش نہیں کر سکتے

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست　　　　نرود جز بہ وقت مرگ از دست

تربیت سے عاری افراد کے لئے تعلیم طغرائے امتیاز ہونے کی بجائے کلنگ کا ٹیکہ ہو جاتی ہے
اور جب ایک تربیت یافتہ شخص کسی ناتربیت یافتہ خواندہ فرد کی غیر مہذب حرکات کا
مشاہدہ کرتا ہے۔ تو اس کے لئے یہ فیصلہ یقیناً دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ بھی ایک انسان ہے
یہ عذر لنگ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ اکثر افسران معائنہ کنندہ بوقت معائنہ اپنی توجہ زیادہ تر
نصاب تعلیم کی طرف منعطف کرتے ہیں۔ اور اخلاقی تربیت پر کما ینبغی زور نہیں دیتے۔
ایسی صورت میں استاد کو تربیت اطفال کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب یا تو ہوتی ہی نہیں
یا اگر ہوتی بھی ہے تو حسب ضرورت نہ ہونے کے سبب نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ اس طرز عمل کی
تمثیل یہ ہے کہ اگر کوئی طبیب کسی تیماردار سے بیمار کو دوا پلانے کی نسبت بوقت معائنہ
استفسار نہ کیا کرے تو تیماردار دوا پلانے کے اٹل فریضے کو غیر ضروری تصور کر کے ٹال سکتا ہے
کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو فرض شناس بھی کہتا ہے۔ اور
فریضہ اہم کو محض کسی کے پرسان و نگران نہ ہونے کے طفلانہ عذر کے سبب فراموش کر جاتا ہے

جس جہاز کا ناخدا ایسا ناخدا ترس ہو وہ یقیناً سلامتی کے کنارے پر پہنچ نہیں سکتا۔ ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا　　　کار طفلاں تمام خواہد شد

تربیت اخلاق کا فریضہ والدین اور سرپرستوں سے متعلق کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی کامل ذمہ داری ان کے سر ہے۔ کیونکہ طلباء کے تقریباً اٹھارہ گھنٹے انہی کی ذمہ داری اور نگرانی میں گذرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک خود والدین بھی اس کے ذمہ دار ہیں اور بہ لحاظ تعلق ان کو ذمہ دار ہونا بھی چاہیئے۔ مگر کامل ذمہ داری کا بار ان پر ڈال کر اساتذہ کا خود کو سبکدوش تصور کرنا کسی طرح قرین انصاف نہیں ہو سکتا اور تو اور صرف ساعات کے تناسب کے لحاظ سے بھی ان کا ذمہ دار ہونا ثابت ہے اگر تعلیم و تربیت کے چولی دامن کے تعلق پر نظر کی جائے تو یہ ذمہ داری نسبتاً اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔ جس سے جائز انکار کرنے کی تھوڑی سی گنجایش بھی کسی پہلو نظر نہیں آتی۔ ایک اور سد سکندری جو تربیت اخلاق میں حائل ہے نصاب تعلیم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نصاب تعلیم کا حجم بہ لحاظ مدت تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ باوجود گھانس کانٹے کے مدت مقررہ میں اختتام کی نوبت نہیں آتی اور تکمیل نصاب کی دھن کچھ ایسی لگی رہتی ہے کہ وہ دوران تفہیم میں تربیت اخلاق کی شدید ترین ضرورت کی طرف بھی متوجہ ہونے کی مہلت نہیں دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ اس اعتراض میں تھوڑی سی معقولیت ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر مغز پر استخواں کو ترجیح دینی کونسی عقلمندی ہے۔ کیا حضرات اساتذہ کی تمام قوتیں اور ساری کوششیں صرف اسی ایک ادنیٰ ترین مقصد کے لئے وقف ہیں کہ ہر سال ان کے مدارس سے چند ایسے حیوان ناطق کامیاب ہو جایا کریں کہ جن کے سرمایۂ زندگی میں چند ادھوری معلومات اور ناپختہ قابلیت کی بے بھروسہ ضمانت یعنے دو چار کاغذی اسناد کے سوا اخلاق و انسانیت کا کوئی قابل قدر و لائق اعتماد جوہر موجود نہ ہو۔ کیا اس حقیقت حال کے اعتراف سے بھی اغماض کیا جا سکتا ہے کہ بعض کیا

بلکہ اکثر مدارس اخلاقی تربیت کے بدرجۂ اتم محتاج ہیں۔ جن کی در و دیوار کے کریہ منظر نقوش اور اخلاق سوز تحریرات زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ ہمارے تقدس کی لاج نہ سہی کم از کم اپنی عزت و آن کا تو ملتفت ہیں کیجئے اور علم و اخلاق کے مخزن اور تہذیب و شائستگی کے مسکن کو انگشت نما ہونے سے خدارا بچائیے۔ مزید برآن اخلاق ذمیمہ کی سمع خراش داستانیں جو آئے دن گوش گزار ہوا کرتی ہیں تا بہ کے جاری رہینگی۔ کیا یہ اخلاقی مرض اب اس نوبت پر پہنچ گیا ہے کہ ازالہ کی کوئی ممکن العمل صورت باقی نہیں رہی ہے۔ جب مرض لا علاج نہیں ہوا ہے اور تداوے کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ تو پھر یہ لیت و لعل کیا ہے۔ اور تجاہل عارفانہ کیوں ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ نے اپنی نمائشی کارگزاری کے سبب اس کو تعلیم کا جزو لاینفک تصور نہیں کیا۔ اور حقیقی فرائض کو فراموش کر دیا مگر کیا آپ اپنے غلط عمل کے نتائج کو بھی ملاحظہ نہیں فرمائیں گے۔ تربیت سے عاری تعلیم جو آپ کے موجودہ طرز عمل کا صحیح نمونہ ہے ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جس کا تیل اور بتی تو نصاب تعلیم ہیں اور اس کا روشن کرنا آپ کی تفہیم کا مرادف ہے، مگر جب تک حباب کثافت اور گرد و غبار سے پاک و صاف نہ ہو۔ تاریکی مبدل بہ روشنی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو چراغ تاریکی کو دور نہ کر سکے اس کا عدم و وجود یکساں ہے۔ اور اس کا وجود اس کے عدم سے بہتر نہیں ہوتا اس کی حقیقی قدر و قیمت بھی کچھ نہیں ہوتی۔ اس اصول کے مدنظر ضرورت اور شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم و تربیت ایک ہی نظر سے دیکھی جائے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہو گا نتائج تعلیم عملاً ناقص رہیں گے جس طرح زندگی کے لئے جسم اور جان کی احتیاج ناگزیر ہے اسی طرح کامل انسانیت کے لئے تعلیم و تربیت لازم و ملزوم ہیں اور ایک کے بغیر دوسرے کا وجود اس قدر موہوم اور بے حس ہوتا ہے۔ کہ اس پر ہستی کا صحیح اطلاق کسی طرح نہیں ہو سکتا باوجود اس لزوم کے تعلیم کو تربیت سے جدا کرنا جسم و جان کے باہمی رشتۂ حیات کو منقطع کرنا ہے۔ جس کا نتیجہ بجز موت کے اور کچھ نہیں گویا تربیت سے عاری تعلیم کی زندگی

فی الحقیقت کامل انسانیت کی حیات نہیں بلکہ موت ہے۔ کیا اس بے شبہ موت کو حیات سمجھنا پرلے درجے کی غلطی نہیں ہے۔ اس تباہ کن غلطی سے محفوظ رہنے کی یہ مرتبہ اول دو صورتیں ہیں۔ ایک اصول تربیت سے کماینبغی واقفیت اور دوسری اس کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ احساس ہے۔ چونکہ احساس کا انحصار واقفیت پر ہے اور واقفیت ہی بجا طور پر احساس کی ضامن ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصول تربیت کے متعلق بھی چند چھوٹی موٹی باتیں بیان کی جائیں۔ اخلاقی تربیت سے یہ مقصود ہے کہ نفس انسان میں ایسی استواری اور بے تکلفی پیدا کی جائے۔ کہ اس کے تمام افعال میں جو حواس ظاہری و باطنی کے زیر اثر صادر ہوا کرتے ہیں حسن و اعتدال موجود ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب کہ اصول تربیت قوانین قدرت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس طریقہ تربیت میں بچے کو اپنے افعال کے نیک و بد نتائج کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے اور وہ اس امر حقیقت کو بالآخر تسلیم کر لیتا ہے۔ کہ قدرتی جزا و سزا مبنی بر انصاف ہوتی ہے جس کے بعد اس کی طبیعت میں مادۂ تاسف و پشیمانی گھٹنے اور جذبۂ انس و محبت بڑھنے لگتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ شاہد حال ہے کہ جن بچوں کی تربیت اصول فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ ان کو اپنے تربیت کنندگاں سے عداوت کی بجائے دلی محبت ہوا کرتی ہے اس بیان کے ثبوت میں تین مثالیں بیاں کی جا سکتی ہیں۔ جو اندرون و بیرون مکان اور مدرسہ سے متعلق ہیں۔ فرض کیجئے کہ اگر کوئی بچہ گھر والوں کے ساتھ گستاخی سے پیش آتا ہے تو بار بار ٹوکنے اور زجر و توبیخ کرنے کے بجائے اس سے اخلاق و مروّت کا برتاؤ کرنا زیادہ مفید ہوگا اور وہ بہت جلد محسوس کرے گا کہ جن کو سخت ترین برتاؤ پر حق و قدرت حاصل ہے وہ اخلاق و مروت کا ایسا دلپسند اور موثر نمونہ محض اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ غلطی کی اصلاح صحیح طریقے پر ہو جائے۔ نیز ایسے مواقع پر جب کہ گھر میں خویش و اقارب اور دوست احباب آیا کرتے ہیں اور عموماً ہر گھر میں ایسا ہوا کرتا ہے بچے کو ان کے سامنے آنے سے

یہ کہہ کر منع کر دینا چاہیئے کہ ہم کو یہ کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا کہ تم سے کچھ بُری حرکت سرزد ہو۔ اور وہ تم کو برا کہیں۔ اس ہمدردانہ و مصلحانہ طرزِ عمل سے نہ صرف جذبۂ محبت کی پرورش ہوگی بلکہ یہ اصلاحِ حال کا ضامن بھی ہوگا۔ کیونکہ بچہ رفتہ رفتہ اس حقیقت کو محسوس کرہی لے گا۔ کہ جن لوگوں کی صحبت میں اسے عمر گزارنی ہے اُنکے اقوال اور افعال میں منافرت زندگی کی خوش گوار حلاوت کو تلخ و ناگوار کر دے گی۔ بیرون مکان کی تمثیل یوں سمجھیئے کہ بچہ جب باہر جاتا ہے کچھ نہ کچھ شکایت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور اس طرح گھر پر شاکیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی اصلاح کے لئے مناسب ہوگا کہ جب گھر والے سیر تماشے وغیرہ کے لئے باہر جایا کریں تو اس بچے کو اپنے ساتھ نہ رکھیں اور صاف طور پر کہہ دیں کہ تم نے گھر پر لائے ہوئے جھگڑوں کے چکانے میں ہمارا عیش و آرام اس قدر تلخ کر دیا ہے کہ اب ہم تمکو باہر لے جاکر سیر و تفریح کا لطف کرکرا نہیں چاہتے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مفید ہوگا کہ کسی موقع مناسب پر گشت و گردش کے دلچسپ حالات و واقعات بلا تخاطب اس طرح بیان کئے جائیں کہ بچے میں حسرت و ندامت کے جذبات برانگیختہ ہو جائیں۔ یہ دونوں کیفیات ایسی پر اثر ہوں گی کہ بچہ بہت جلد شریکِ صحبت ہونے کا اہل ہو جائے گا۔ مدرسہ کے متعلق تمثیلِ ذیل غالباً خلافِ مشاہدہ اور غیر موزوں نہ ہوگی۔ فرض کیجئے کہ ایک بچے نے مدرسہ کے در و دیوار حیا سوز اشکال اور فحش تحریرات سے سیاہ کر دی۔ ایک عرصے کے بعد وہ گرفتار ہوا اور اس کا جرم پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ گیا۔ یوں تو اس اخلاقی مجرم کو ارتکابِ جرم کی پاداش میں مختلف و متعدد مماثلِ فطرت سزائیں دی جا سکتی ہیں مگر یہاں بہ خوفِ طوالت صرف دو ایسی سزائیں اساتذہ و طلباء کی طرف سے تجویز کی جاتی ہیں۔ جن پر نہایت آسانی سے عمل ہو سکتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اساتذہ مختلف طرز و طریقے سے سخت نفرت و حقارت کا برتاؤ کریں مثلاً سلام نہ لیں۔ مخاطب نہ کریں۔ جواب دیں بھی تو بہ تراز خاموشی ہو۔ راستہ کترا جائیں حاضری کے وقت نام نہ پکاریں

گھر پر کیا ہوا کام بہ غرض تصحیح نہ لیں۔ جماعت میں کئے ہوئے کام کی اصلاح نہ کریں سوالات کے وقت سوال نہ کریں۔ جواب لینے کی نوبت آبھی جائے تو ٹال دیں۔ دوران تفہیم میں اس کی طرف روئے سخن ہونے نہ دیں۔ استفسار کے جواب میں پہلے پہل خاموشی اختیار کی جائے۔ اور پھر بے رخی سے یہ کہدیا جائے کہ عیب کرنے کے لئے ہنر نہیں سکھایا جا سکتا وَقِسْ عَلیٰ ھٰذا۔ طلبا بھی اسی قسم کا مناسب حال طرز اختیار کریں بازو بیٹھنے سے اجتناب کریں اگر کوئی چیز لی گئی ہو تو فوراً واپس کردیں۔ کھیل میں انتخاب نہ کریں۔ اگر خود ہی کسی جماعت میں شریک ہو جائے تو اس کو اپنا ساتھی تصور نہ کریں اور فریق مقابل بھی مدافعت سے قطعاً باز رہے اس کے باوجود بھی اگر تکلم و اشتراک عمل کے لئے اصرار و تقاضا ہو تو سب کے سب یک زبان ہو کر کہدیں کہ۔ بدنام کنندہ نکو نامے چند کے ننگ صحبت سے احتراز بہر نوع واجب ہے۔ اس کے بعد آپ خود دیکھ لیں گے کہ سنگین سے سنگین جرم کا مجرم بھی صدق دل سے تائب اور اخلاق حسنہ کا مجسم نمونہ بن جائے گا۔ مکان اور مدرسہ میں عموماً جو سراپا غلط تربیت ہوا کرتی ہے۔ اس کے متعلق فرضی تمثیلات کے بجائے حقیقی واقعات کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک ذی علم باپ جو اپنے بچے کو اس دروغ گوئی پر سخت ترین جسمانی سزا دیتا ہے کہ اس نے مدرسہ جانے کی نسبت سراسر جھوٹ کہا۔ اس واقعہ کے تھوڑی ہی دیر بعد وہی باپ اپنے اسی لڑکے سے یہ کہتا ہے کہ اس وقت مکان پر دستک دینے والے اگر فلاں صاحب ہوں تو کہہ دینا کہ مکان میں موجود نہیں ہیں۔ کہیں باہر گئے ہیں۔ نیز یہ کہ کب آئیں گے ہم کو اس کا علم نہیں ہے ۔ع

مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس ۔۔۔ توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

دو بڑی عمر کے ہم جماعت طلبا ایک مدرس صاحب کے پاس آتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ دوسرے نے اس کو طمانچہ رسید کیا۔ اس پر مدرس صاحب دریافت کرتے ہیں

کہ طمانچہ کیوں مارا تو طمانچہ رسید کرنے والا طالب علم یہ کہتا ہے کہ اس نے مجھ کو گالی دی جس کی وجہ سے مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے ایک طمانچہ رسید کیا۔ اس بیان کے بعد ہی مدرس صاحب نے اپنا فیصلہ یوں صادر کر دیا کہ اگر اس نے گالی دی تھی تو تم کو ہم سے شکایت کرنی چاہیے تھی نہ کہ طمانچہ مارنا چاہیئے تھا۔ قصور تمہارا ہے۔ سزا کے لئے ہاتھ بڑھاؤ۔ لڑکے نے ہاتھ بڑھانے کی بجائے یہ کہا کہ آپ نے گالی دینے کی وجہ دریافت ہی نہیں فرمائی۔ انہوں نے بلاوجہ گالی دی اگر میں باوجہ طمانچہ مارنے کا گناہ گار ہوں تو یہ بلاوجہ گالی دینے کے خطاکار ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں قصوروار ہوئے۔ اگر سزا ملتی بھی ہو تو دونوں کو ملنی چاہیئے مگر انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ صرف بانی فساد کو سزا ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اگر گالی نہ دی جاتی تو طمانچہ بھی رسید نہ ہوتا اگر آپ مجھ اکیلے ہی کو سزا دینی چاہتے ہیں تو میں آپ کے فیصلے سے ناراض ہوں۔ براہ کرم اس قضیے کو جناب صدر صاحب کے پاس پیش کر دیجئے۔ اس تقریر سے مدرس صاحب اس قدر مشتعل ہو گئے کہ رہا سہا انصاف بھی باقی نہ رہا۔ چنانچہ فرمانے لگے کہ جب تم جیسے دریدہ دہن نے میرے ساتھ ایسی گستاخی کی ہے تو اپنے ساتھی کے ساتھ کیا کچھ کیا ہوگا۔ پہلے میں تم کو اس گستاخی کی سزا دوں گا اور پھر تمہارے حسب خواہش مزید سزا کے لئے صدر صاحب کے پاس بھیجوں گا۔ غیظ و غضب اس قدر بڑھ گیا تھا کہ سزا دہی کی ممانعت کے باوجود سزا دی اور پھر صدر صاحب کے پاس بھجوا دیا۔ مدرس صاحب کے اس طریقۂ تربیت کی اور غلطیوں سے قطع نظر اس خاص غلطی کو ملاحظہ فرمائیے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ گالی بلاوجہ نہیں دی گئی تھی تو بھی یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ گالی دینے سے غصے کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ طمانچہ رسید کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ گویا مدرس صاحب نے طمانچہ رسید کرنے والے طالب علم کو غصہ ضبط نہ کرنے کا قصوروار ٹھہرایا مگر جب اثنائے دریافت میں اس طالب علم نے اظہار حقیقت کے بعد داد خواہی کی تو خود خواہ مخواہ اس قدر مشتعل ہوئے کہ اس امتیاز تک کی سدھ نہ رہی کہ جسے ناجائز غیظ و غضب کی حالت میں سزا دی جا رہی ہے وہ فطرتی غصے کو ضبط نہ کرنے کا

محروم ہے۔ اسی طرح اخلاقی تربیت میں خود تربیت کنندہ سے مختلف و متعدد غلطیاں سرزد ہوا کرتی ہیں۔ جو اصول تربیت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور جن کا خمیازہ صرف معصوم طلبا کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک طرف والدین اور دوسری طرف اساتذہ اصول تربیت سے نابلد ہوا کرتے ہیں۔ گویا ایک معصوم زندگی دو نادان دوستوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور نادان دوست دشمن کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی تمثیل یوں سمجھیئے کہ ایک شخص نہایت ہی گراں قدر و کثیر سرمایے سے تجارت تو کرنی چاہتا ہے مگر اصول تجارت سے بالکل بے بہرہ ہے۔ ایسی تجارت میں فائدے کی توقع کرنی کا غذا بر سے بارش کی امید رکھنی ہے۔ جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی یا یہ کہ اگر کوئی شخص تشریح الابدان کے علم کا مبتدی بھی نہ ہوا اور وہ نازک ترین عمل جراحی کے لئے آمادہ ہو جائے تو اس کی یہ طفلانہ جسارت بجز نقصان عظیم کے قلیل ترین منفعت کی بھی ضامن ہرگز نہ ہوگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دوست نما دشمنوں سے اس خصوص میں عموماً جو غلطیاں ظاہر ہوا کرتی ہیں اور ان سے جو نقصان دہ نتائج مترتب ہوتے ہیں ہر دو اختصار کے ساتھ بیان کیے جائیں مثلاً ایک بچہ خود بخود جوتا پہن تو سکتا ہے۔ مگر دائیں اور بائیں میں تمیز نہیں کرتا تو اس کے قبل کہ وہ چلنے میں تکلف محسوس کرے یا زائد از زائد گر گر رفتہ رفتہ اپنی غلطی معلوم کرے اس کی غلطی درست کر دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ فی الحال خفیف نقصان سے تو محفوظ رہتا ہے مگر ذاتی تجربہ نہ ہونے کے سبب بار بار یہی غلطی کرتا ہے اور آخر کار وہی اصلاح کنندہ جو بچے کو قدرتی طریقہ تربیت کے خفیف تکلف و ضرر سے بچانے کی کورانہ تدبیر کیا کرتا تھا۔ ہر وقت کی اصلاح سے تنگ آکر کئی گونہ سخت سزا دیتا ہے۔ باوجود اس کے اصلاح حال کی کوئی مستحکم صورت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اس کے بعد جب بچہ جوتا پہننے لگتا ہے تو غیر موزوں سزا کی یاد تازہ ہو کر کمزور قوت امتیاز کو جو تکلیف و راحت کے ذاتی تجربے سے محروم ہوتی ہے۔ خوف و دہشت سے تقریباً مغلوب کر دیتی ہے۔ بعض وقت بلا لحاظ سن

بچوں سے اخلاقی طرز عمل کی بہت زیادہ توقع کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے صغیر سن بچوں کی جماعت میں جن کو تعظیم کا کافی احساس نہیں ہوتا جب کوئی استاد داخل ہوتا ہے اور بعض بچوں کو کسی مشغلہ میں باہم منہمک اور تعظیم کے لئے استادہ نہیں پاتا ہے تو چشم پوشی کے بجائے چشم نمائی کرتا ہے۔ جو بالکل غیر ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف طفلانہ انہماک جو بجائے خود مفید ہے۔ خلل پذیر ہو جاتا ہے۔ بلکہ جذبہ خودداری قبل از وقت ابھارنا آیندہ کی کمزوری کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بچے طفولیت میں زیادہ خلیق و مہذب نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے ہو کر بد خلق و غیر مہذب ہو جاتے ہیں اس سے یہ نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ متوسط درجوں کی تجاویز و نتائج نسبتاً زیادہ سود مند ہوتے ہیں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تربیت میں تعجیل کرنی بھی متعدد نقصانات کا موجب ہوا کرتی ہے ظاہر ہے کہ جو قوتیں آہستہ آہستہ نشو و نما پاتی ہیں وہ مستحکم اور دیرپا ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے قبل از وقت اور جلد بڑھنے والی قوتیں کمزور اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔ جب بچے ضد اور خود رائی کرتے ہیں تو اکثر اس پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایک حد تک بچوں کا یہ فطرتی طرز عمل برا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس سے آزادی کے شریفانہ جذبات کی پرورش ہوتی ہے اور اسی سے ضبط نفس پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی ہر ایک انسان کو بڑی ضرورت ہے احکام کی تعداد میں زیادتی بھی ہمیشہ مضر ہوتی ہے۔ حکم کی ضرورت صرف اسی صورت میں ہوتی ہے جب کہ طریقۂ عمل کی تدابیر بچے کی عقل سے پوشیدہ ہوتی ہیں اور ناکامی ہوا کرتی ہے اس کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ حکم بہت غور و خوض کے بعد دیا جائے اور اس کی تعمیل بہر نوع کرائی جائے۔ بعض وقت جائز حکم بھی خفیف نقصان کا موجب ہوتا ہے ایسی صورتوں میں نقصان کی پروا نہ کرنی چاہئے۔ ورنہ حکم کی بے وقعتی بہت سے بڑے نقصانات کا سبب ہوگی۔ نیز لالچ اور خوف سے حکم کی تعمیل کرانی نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور یہ عموماً اس وقت نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ جب کہ تعمیل کے یہ دونوں محرکات نہیں ہوتے ہیں

بچے کو ایک بے حس آلہ تصور کرنا بھی پہلے درجے کی غلطی ہے۔ کیونکہ اس طرز عمل سے اس کی تقریباً تمام قوتیں کم از کم پژمردہ ضرور ہو جاتی ہیں۔ جس کے بعد بچہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی ناجائز تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ یہ آزادی ناجائز وسائل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اس لئے فائدے کی بجائے نقصان ہو جاتا ہے اخلاقی تربیت میں اخلاقی سزا کے ساتھ جسمانی سزا کی ضرورت بھی ہوا کرتی ہے۔ سزا کسی قسم کی بھی ہو اس کا منشاء صرف یہ ہونا چاہئے کہ ارتکاب جرم کے ساتھ سزا کی تکلیف کا خیال پیوست ہو جائے۔ جس سے خطا کار کی اصلاح ہو نیز دوسرے عبرت حاصل کریں۔ سزا چونکہ غذا نہیں بلکہ دوا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے استعمال میں نہایت درجے احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ دوا کا استعمال صرف بیماری کی حالت میں ہوا کرتا ہے جس کی تعداد بھی حسب ضرورت ہوتی ہے۔ سزا دینے کے قبل قصور کی مکمل تحقیقات اور سزا کی ضرورت و نوعیت پر کافی غور و خوص لازمی ہے۔ سزا قصور کے مطابق ہونی چاہئے۔ اگر مختلف قصوروں کے لئے ایک ہی قسم کی سزا دی جائے گی تو وہ مفید و موثر نہیں ہوگی۔ مگر عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جو مدرسین تندخو ہوا کرتے ہیں وہ ہمیشہ بید کی سزا دیتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے غلطی کی اصلاح کر دی حالانکہ یہ خیال حقیقت حال کے سراسر خلاف ہوتا ہے جس طرح دوا مریض کے مناسب حال ہوتی ہے اسی طرح سزا بھی خطا کار کے لئے ہر لحاظ سے موزوں ہونی چاہئے۔ ورنہ سزا کے اثرات یقیناً کم ہو جائیں گے۔ اگر اس موقع پر سزا دہندہ آپے سے باہر ہو جائے گا تو اس کی سزا حد انصاف سے متجاوز ہو جائے گی اور اس میں اصلاح حال کے خیالات کی بجائے انتقام کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ خاطی کو سزا دینے کے قبل اس کی خطا نہ صرف ظاہر بلکہ ثابت بھی کر دی جائے تاکہ سزا کے اثرات زیادہ موثر و مفید ہو جائیں۔ نیز خاطی اور سزا دہندہ کے باہمی تعلقات میں منافرت پیدا نہ ہو۔ بعض وقت دو طلباء سے ایک ہی قسم کا قصور سرزد ہوتا ہے۔ مگر ایک اتفاقاً اور

دوسرا عادتاً قصور کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اتفاقیہ قصور کی سزا نسبتاً نرم اور کم ہونی چاہیے
نیز بدنی سزا میں طلبا کی صحت اور جسمانی بناوٹ کا لحاظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ بلا سوچے
سمجھے طمانچے رسید کرنا یا جو چیز ہاتھ میں ہو اسی سے خبر لینی بالکل وحشیانہ پن ہے جو اکثر اوقات
نہایت مضر نتائج پیدا کرتا ہے۔ استاد یا سرپرست کی حقارت اور نفرت بھی سزا میں داخل ہیں
جن سے عموماً خفیف خطاؤں کے موقع پر کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا خیال بھی رہے کہ
اعتدال سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ ورنہ خاطی لاپروا اور بے باک ہو جائے گا۔ جس کے بعد
اس کے لئے یہ طریقہ موثر اور مفید نہ ہوگا۔ جرمانہ بھی ایک قسم کی سزا ہے جو بجائے خود مفید ہے
بشرطیکہ اس کا استعمال درست ہو۔ جرمانہ صرف انہی طلبا پر ہونا چاہیے۔ جن کو اس کا پورا
احساس ہو۔ ورنہ کچھ مفید نہ ہوگا۔ اگر جرمانہ کرنے کے بعد اس کے معاف کر دینے کی ضرورت
ہوتی ہو تو مناسب یہی ہے کہ جرمانہ ہی نہ کیا جائے۔ لیکن جو جرمانہ غلطی سے ہوا ہو اس کو
ضرور معاف کر دینا چاہیئے مدرسہ جماعت اور کھیل سے عارضی طور پر باہر کر دینا بھی مفید ہوا کرتا ہے
لیکن یہ سزا صرف ان طلبا کو وہی مناسب ہے جن کو اس کا احساس ہو۔ ورنہ جماعت
اور مدرسہ سے باہر کر دینا طلبا کے لئے تعطیل کا مرادف ہو جائے گا۔ برخواست مدرسہ کے بعد
دیر تک طلبا کو روک رکھنا مناسب حال سزا ہے۔ کیونکہ خطا اور سزا کی نوعیت یکساں ہے
اس موقع پر اکثر مدارس میں تعلیمی کام لیا جاتا ہے۔ جو زیادہ تر تحریری ہوا کرتا ہے اور جس کی
نسبت عام خیال یہ ہے کہ یہ سزا کی سزا اور تعلیم کی تعلیم ہے۔ مگر اس میں بہت بڑی خرابی
یہ ہے کہ طلبا تعلیمی مشغلہ کو سزا تصور کر کے اس سے لازماً متنفر ہو جائیں گے۔ جس کا پہلا
ثبوت اور محدود اثر یہ ہوگا کہ اس عرصے میں جو کچھ بھی تعلیمی کام کیا جائے گا اس میں بجز
ظاہری نمائش اور اندرونی نقصان کے کوئی حقیقی فائدہ مطلقاً نہ ہوگا۔ بعض مدارس میں
یہ عمل ہوا کرتا ہے کہ "میں آیندہ دیر نہیں کروں گا" بار بار لکھواتے ہیں۔ جو تحریری اقرار کا
طومار ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی دو خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاں وعدے کی

تکرار ہوئی اس کا وثوق کم ہوگیا۔ اور دوسری یہ کہ اگر یہ اصولی باریکی نظر انداز بھی کردی جائے تو اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ کسی ایسے فعل کے نہ کرنے کا اقرار تکرار کے ساتھ کرانا جس کے وقوع پذیر ہونے کا امکان ہر وقت ہو صریح غلطی ہے۔ جو دیدہ و دانستہ وعدہ خلافی کی تعلیم دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ علانیہ غلطی اس غلط خیال کی آڑ میں اوجھل ہو جائے کہ تکرار کا سنگین وعدہ پہلے تو ٹوٹے گا ہی نہیں اور اگر بصد مجبوری ٹوٹا بھی تو اس کا انفعال اس قدر قوی اور دیرپا ہوگا کہ آیندہ ارتکاب کی نوبت ہی نہیں آئے گی مگر روزمرّہ کا تجربہ شاہد و ناطق ہے کہ تکرار کے سنگین وعدے ہی بار بار ٹوٹتے رہتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں بھی مناسب ہے کہ اس موجبِ نقصان طریقۂ عمل سے احتراز کیا جائے۔ بالآخر یہ کہنا غالباً خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ تربیت کی کٹھن منزل کا راستہ ایسا دشوار گزار اور پیچیدار واقع ہوا ہے کہ علم النفس کی رہبری میں باوجود پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے کج روی سے بچنا محال ہے۔

سیّد غلام محمود

تکان اور اُس کا علاج

ایک ماہرِ فن تعلیم کا قول ہے کہ کامیاب مدرس کے لئے ضروری ہے کہ سبق معمولی سے معمولی کیوں نہ ہو۔ خود خاص دلچسپی لے "سبق کو دلچسپ بنائے اور بچوں میں بھی دلچسپی پیدا کرے" آخر یہ کیوں اور کس لئے؟ بات یہ ہے کہ چھوٹے لڑکے دیر تک توجہ قائم نہیں رکھ سکتے۔ ان میں توجہ ایک سیال مادّے کی طرح ہے جو جدھر نشیب ہو بہ نکلے گا۔ مثلاً ایک ضدی لڑکا جو دیر سے کسی چیز کے لئے رو رہا ہے ڈھولکی یا سیٹی کی آواز پر ہشاش بشاش ہو جاتا ہے تھوڑی ہی دیر میں اس سے اکتا کر کسی دوسری چیز کی خواہش کرنے لگتا ہے ہمارا روز کا تجربہ شاہد ہے

دلچسپ سے دلچسپ سبق جونہی چھٹی کی گھنٹی بجتی ہے پھیکا پڑ جاتا ہے کیونکہ گھنٹی کی آواز
نیا پیام شوق لاتی ہے۔ کھیل کود کا شوق اور اس کی دلچسپیاں سب پر غلبہ پالیتی ہیں
بلحاظ عمر مختلف چیزیں مختلف نوعیت کی دلفریبیاں رکھتی ہیں لڑکے کھیل کی گھنٹی کے بعد
سبق میں جی نہ لگائیں تو یہ کوئی بڑی علامت نہیں ہے وہ یقیناً قانون قدرت کے مطابق
عمل کر رہے ہیں۔ مدرس کا غصہ میں آنا اور چیں بہ جبیں ہونا بے معنی اور بے موقع ہے
یہ بھی اکثر تجربہ کیا گیا ہے کہ مدرسین ایسی صورتوں میں بلا دلچسپی پیدا کئے پڑھا کر چلے آتے ہیں
اور سمجھتے ہیں کہ ہم اپنا کام پورا کر آئے۔ مگر جب جانچ کی جائے تو نتیجہ صفر ہی ملتا ہے جس سے
ظاہر ہے کہ مدرس نے بچوں کی حالت کا اندازہ نہیں کیا اور ایسے وقت میں تعلیم دی جب کہ
متوجہ نہ تھے ہمیں ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ محض دلچسپی ہی ایک ایسی چیز ہے جو دیر تک
بچوں کو متوجہ رکھ سکتی ہے۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ بغیر اس کے جماعت میں
تنکا بھی نہیں ہل سکتا ہے۔ بالفرض کسی کامیاب مدرس نے جملہ اصول حفظان صحت و تدریس
لب و لہجہ حرکات و سکنات اور فراہمی نمونہ جات و آلات تعلیمی سے بدرجہ اتم دلچسپی پیدا
کر بھی لی تو یہ یاد رہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب کہ ساری دلچسپی مفقود ہو جائے گی
اور لڑکے اکتا کر بے چین ہو جائیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ خواہش ہوگی کہ یہ بلا کسی طرح ٹلے۔
اور انہیں خوش گپوں چیخ پکار اور کھیل کود کا موقع ملے۔ ہمیں یہاں غور کرنا چاہئے کہ آخر کیوں
بچوں میں جا بجا جلد حیرت انگیز تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں انسانی
مشین بہترین صناعی اور دستکاری کا ایک اہم اور پیچیدہ نمونہ ہے۔ مدتوں اس کے کل
پرزوں کی جانچ پڑتال اور تحقیقات میں ماہرین فن لگے رہے۔ اور اب بھی ہیں۔ آئے دن
کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی رہتی ہے اس مشین میں بے شمار رگ و پٹھے نسیں اور
باریک ریشے ہر حصہ میں موجود ہیں۔ جن کی پرورش ایک سیال مادے کے ذریعہ ہوتی رہتی ہے
جسے خون کہتے ہیں۔ جیسے انجن کے لئے کوئلے کی ضرورت ہے ویسے انسانی مشین کو بھی

ایندھن درکار ہے کوئلے سے بھاپ تیار ہوکر انجن چلتا ہے تو خون سے آکسیجن کا جسز
جل کر انسانی مشین کو مختلف سرگرمیوں میں مصروف رکھتا ہے اگر آکسیجن خون میں نہ ہو تو
یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے بالفاظ دیگر آکسیجن ممد حیات ہے اور اسی پر تمام عضو
اور اعصاب وغیرہ کا دارومدار ہے جب بدن کا کوئی حصہ مصروف رہے تو آکسیجن (جو
خون میں شریک ہے) رفتہ رفتہ جل کر فنا ہو جاتی ہے اور ایک قسم کا ردی مادہ جسے
ٹاکسن کہتے ہیں چھوڑ جاتی ہے جس کا زہریلا اثر رگ وپے میں دوڑ جاتا ہے بس اسی
کیفیت کا نام تکان ہے یعنی جسمانی نسوں اور باریک ریشوں کی قوت کا
(خواہ ان کا تعلق اعصاب سے ہو یا پٹھوں سے) سرگرم عمل رہ کر خون کی آکسیجن کو تحلیل
یا فنا کرنا تکان پیدا کرتا ہے۔ پس ٹاکسن کا اجتماع اور رگوں کا جواب دینا تھکنے کے اسباب ہیں
اور لطف یہ کہ خون ہی ٹاکسن کو صاف کر کے دوبارہ تازگی بھی پیدا کرتا ہے۔ خون اگر صالح ہو تو
تھکن جلد دور ہوگی۔ ورنہ یہی فاسد خون تازگی پیدا کرنے میں مانع ہوگا۔ اچھا خون پیدا کرنے
کے لئے پاک وصاف ہوا کی ضرورت ہے جس میں آکسیجن کی مقدار کافی ہو اسی وجہ سے جماعت کے
پاک وصاف رکھنے اور ہوادار ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ غرض کہ اعصاب کے جھتے جو
بدن بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور دماغی اعصاب جو ہر قسم کے شعور کے مرکز ہیں ٹاکسن کے
زہریلے اثر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیونکہ دوران خون کے ذریعہ ہر حصے میں سمیت
دوڑ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسمانی اور دماغی افعال ناقص طور پر ہونے لگتے ہیں
قوت ارادہ اور سمجھ میں فتور آجاتا ہے۔ تکان جسمانی اور دماغی دو قسم کی ہوتی ہے جس سے کوئی
ذی روح بچ نہیں سکتا ہے۔ ہر شخص پر قانون قدرت یکساں منطبق ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ
قوی اور سن کے اعتبار سے کوئی جلد تھکتا ہے تو کوئی بدیر مگر لازمی طور پر تھکن کا اثر ہوتا ہے
اس کا یہ مطلب نہیں کہ تکان کا خیر مقدم کیا جائے گو یہ ناگزیر صورت ہے مگر کوئی اچھی چیز
بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ کام کم ہوتا ہے۔ ایک تندرست شخص جو شوق سے اپنا کام

کرتا ہے جب تک پوری طرح تھک نہ جائے اس کام کو نہیں چھوڑتا ساتھ ہی وہ جلد تازہ دم بھی ہو جاتا ہے ایسے شخص کے لئے تھوڑا آرام کافی ہے بخلاف اس کے کام کی نوعیتیں اکثر ایسی ہوتی ہیں کہ جلد انسان خراب و خستہ ہو جاتا ہے اور طویل وقفے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ رگیں اصلی حالت پر آجائیں ورنہ بسا اوقات یہی تکان ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ کام کی شدت سے خون میں زہریلے اثر پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ ہلاکت محض خون کی سمیت سے ہوتی ہے۔ بڑوں کا جب یہ حال ہے تو چھوٹے لڑکوں پر تعلیمی بار ڈالنا اور صبح سے لے کر شام تک مصروف رکھنا ان کے جسمانی اور دماغی نشو و نما کے لئے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے۔ لڑکے جتنے ہی چھوٹے ہوں گے اسی قدر جلد تھک جائیں گے۔ جن لڑکوں کی عمر چھ سال یا اس کے اندر ہو آدھے یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں کافی طور پر تھک جاتے ہیں مگر تیرہ یا چودہ سال کے لڑکے تیسرے گھنٹے سے تکان محسوس کرنے لگتے ہیں مدرس کا اہم فریضہ ہے کہ پوری جماعت پر نظر رکھے اور اس کا اندازہ کرے کہ تکان کا کس قدر اثر لڑکوں پر ہے۔ پیمایش کے مختلف طریقے ہیں مگر اس قدر جان لینا کافی ہے کہ تکان کا اثر نمایاں طور پر کلاس میں معلوم ہو جاتا ہے پہلے بے توجہی ظاہر ہوتی ہے پھر کام میں جی نہیں لگتا اور کسی قسم کی تبدیلی کی خواہش ہوتی ہے اس کے بعد سستی معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ تکان محسوس ہونے لگتی ہے اور آخر میں انتہا درجہ کی خستگی پیدا ہو جاتی ہے اور سوائے نیند اور آرام کے کسی چیز کو جی نہیں چاہتا ان آثار اور علامتوں سے مدرس کو پتہ چلا لینا چاہیئے گو یہ صحیح پیمایش نہیں ہو سکتی تب بھی ایک حد تک قابل اعتماد ضرور ہے۔ تکان کا نمایاں اثر کام پر پڑتا ہے غلطیاں زیادہ ہونے لگتی ہیں اور کام بھی مقابلتاً کم ہوتا ہے۔ زیادہ عمر والے اشخاص خیالات کا تسلسل قائم نہیں رکھ سکتے ہیں اور بچے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ غیر ارادی طور پر وہ تکان سے محفوظ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں ہوشیار مدرس کو اس سے متنبہ ہو کر آنے والے

تکان کا انسداد کرنا چاہئے جس کی علامتیں یہ ہیں۔

(۱) عام حرکات میں اضمحلال کا ہونا۔

(۲) سر بمعہ پیٹھ اور ہاتھوں میں توازن کا نہ ہونا۔

(۳) بے ساختہ یا اضطراری حرکات کا سرزد ہونا اور بات بات پر برہم ہونا۔

(۴) آنکھ کے دیدوں کا گھومنا اور کسی چیز پر متوجہ نہ رہنا۔

(۵) چہرے پر زردی کا ہونا یا مردنی چھا جانا۔

(۶) آنکھ کے پپوٹوں کا پھول جانا۔

(۷) انگلیوں کو چٹخانا۔

(۸) سر کا ایک طرف جھکا ہونا۔

(۹) شانوں کا نیچے ڈال دینا۔

(۱۰) پیٹھ کا خمیدہ ہونا۔

(۱۱) انگوٹھے کا ہتیلی کی طرف جھک جانا وغیرہ۔

ان کے علاوہ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ دیگر جسمانی اور دماغی حالتوں کے باعث تکان کا اثر جلد شروع ہو جاتا ہے اگر سبق دلچسپ نہ ہو یا بچے کی صحت خراب ہو یا بھوک پیاس نیز کہ لباس موسم کے لحاظ سے نہ ہو یا یہ کہ کمرے کی ہوا صاف اور اس میں کافی روشنی نہ ہو تو تکان کا اثر بہت جلد ہو گا۔ ان تمام امور کو ملحوظ رکھنے پر بھی اس سے ہم بالکل بچ نہیں سکتے البتہ اس کے اثر کو کم کیا جا سکتا ہے۔ جس کی دو تدبیریں ہیں اول بدل کر کام لینا اور آرام کا انتظام کرنا

کام میں تبدیلی سے یکسانیت باقی نہیں رہتی اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے تکان کا اثر کم ہوتا ہے۔ نئی چیز یا نیا مشغلہ چھوٹے بچوں کو جلد متوجہ کر لیتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ کام کی تبدیلی سے جسم کے دوسرے حصے مصروف ہو جاتے ہیں۔ تھکے ہوئے حصوں میں تازگی آجاتی ہے اور ان کے ٹاکسن دوران خون سے دور ہو جاتے ہیں تبدیلی کو

خاص طور پر موثر اور مفید بنانے کے لئے کام کی نوعیت کا خیال بھی رہے مثلاً سخت کام کے بعد ہلکا کام حساب کے بعد خطاطی یا لکھنے پڑھنے کے بعد کمپوزیشن یا قصہ گوئی غور و خوض والے کام کے بعد تفریحی مشاغل گانا باغبانی وغیرہ

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قوی کی سرگرمی کا دار و مدار خون پر ہے اور تکان سے ٹاکسن پیدا ہوتے ہیں جنہیں خون ہی صاف کرتا ہے تو جب خون کی سربراہی سے زیادہ ٹاکسن پیدا ہونے لگیں تو کسی قسم کی تبدیلی کام نہیں دیتی اور پورا جسم خراب اور خستہ ہو جاتا اس کو عام تکان کہیں گے بخلاف مختص المقام تکان کے جس کا اب تک ذکر رہا ہے دن میں مصروف رہنے کے بعد عام تکان کا غلبہ شب میں ہوتا ہے جسے نیند و آرام ہی دور کر سکتے ہیں اور کسی قسم کی تبدیلی مفید نہیں ہو سکتی۔ تکان کا غلبہ دن بھر میں کئی مرتبہ ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے وقفوں سے انسان تازہ دم بھی ہوتا رہتا ہے مثلاً کھانے کے بعد عام طور پر تکان محسوس کی جاتی ہے ماہرین فن نے اس کی پیمائش یوں کی ہے صبح میں اس کا اثر نہیں ہوتا ہے مگر جوں جوں دن بڑھتا جاتا ہے تکان میں اضافہ ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ دوپہر تک خاصا غلبہ ہوتا ہے مگر سہ پہر سے گھٹاؤ شروع ہو جاتا ہے پھر رات میں اور وقتوں سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے یہاں تک کہ نیند کی حالت طاری ہو جاتی ہے یہ پیمائش ہر شخص کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا انحصار عادت پر بھی ہے بعض حضرات شب میں کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کا دماغ اسی وقت کام بھی کرتا ہے۔ بعض صبح کے عادی ہوتے ہیں۔

مدارس میں عموماً دوپہر کا وقفہ رکھا جاتا ہے لڑکے کھیلتے کودتے ہیں اور اس دوڑ دھوپ میں تازہ ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو کر خون کو پاک صاف کر ڈالتی ہے۔ چونکہ لڑکے از خود عین قانون قدرت کے مطابق کھیل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں اس لئے مدرسین کو دخیل نہ ہونا چاہئے اور نہ ان کے شور شغب کو روکنے کی ضرورت ہے

بعض ماہرین تعلیم تو یہاں تک زور دیتے ہیں کہ ہر سبق کے بعد ۵ منٹ کا وقفہ دیا جائے تاکہ لڑکے دوسرے سبق کے لئے تیار ہو جائیں۔

مضامین کی ترتیب بلحاظ نوعیت و اہمیت، تکان کے چڑھاؤ اور اتار کا لحاظ کرتے ہوئے ہونا چاہئے۔ پہلا گھنٹہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ اس میں لڑکے اپنی سستی وغیرہ کو دور کر لیتے ہیں۔ اردو، تاریخ کے لئے یہ گھنٹہ بہتر ہے۔ دوسرے گھنٹے میں دماغی حالت عام طور پر بہت بہتر پائی جاتی ہے اس لئے یہ بہت ہی اہم ہے اور اس میں مشکل سے مشکل مضمون کو جگہ دی جانی چاہئے۔ یہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ کونسا مضمون سب سے زیادہ مشکل اور تھکا دینے والا ہے۔ ماہرین تعلیم ریاضی کو سب سے مشکل اور ڈرائنگ کو سب سے آسان بتاتے ہیں۔ یہاں اختلاف بھی ہے بعض ڈرل کو تھکا دینے والی چیز کہتے ہیں اور بعض محض تفریحی شغلہ قرار دیتے ہیں اس کا انحصار زیادہ تر مدرسین پر ہے کہ وہ مختلف تدابیر اختیار کر کے اپنے مضمون کو دلچسپ بنائیں، یا ہل انگاری اور مار پیٹ سے لڑکوں میں نفرت پیدا کریں۔ اگر خلاف مرضی بلا شوق دلائے کام لیا گیا تو حقیقت میں ڈرل سے بڑھکر تھکا دینے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مضامین کی تقسیم بلحاظ نوعیت تکان کر دی جائے تاکہ ٹائم ٹیبل کی ترتیب میں جملہ امور ملحوظ رہیں ورنہ بے تکی ترتیب نہ صرف غیر مفید بلکہ شاید مضر اور ضبط مدرسہ کے منافی ثابت ہو۔

(۱) ریاضت جسمانی (سب سے زیادہ تھکا دینے والی چیز ہے)

(۲) ریاضی (یہ نمبر ا سے کم ہے)

(۳) جدید زبانیں (جیسے فرانسیسی وغیرہ۔ ہم یہاں انگریزی اور دیسی زبانیں یا نا ہی رکھ سکتے ہیں بشرطیکہ طالب علم کی مادری زبان نہ ہو)

(۴) مادری زبان (جیسے اردو وغیرہ مگر ہندو طلبا کے لئے ریاضی کے بعد اسی کی اہمیت ہے)

(۵) طبعی جغرافیہ
(۶) تاریخ۔
(۷) اسباق الاشیا یا دینیات، قصہ گوئی۔
(۸) "ایکشن سانگ" ڈرائنگ اور گانا۔

ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ تکان کے پیدا ہونے سے تکان محسوس کی جاتی ہے اس کا اثر جلد یا بدیر لازمی ہے اور بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ دلچسپی مضامین کی تبدیلی ان کی ترتیب اور وقفوں کے ذریعہ تکان کا اثر کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر مدرس ان امور اور ہدایات کی جانب تھوڑی بہت توجہ کرے تو اس کا کام نہ صرف آسان اور دل خوش کن بلکہ مفید اور موثر بھی ہوگا۔

عبدالنور صدیقی

تاریخ اور اس کا طریقہ تعلیم

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ تاریخ کے مطالعہ سے انسان کو تمدنی حالات کا حقیقی علم ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے یہ بات کسی دوسرے مضمون سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ آج ہمیں ہر چیز میں جو ترقی دکھائی دیتی ہے اگرچہ اس میں سائنس کا بھی دخل ہے مگر اس ترقی کی حقیقی روح تاریخ ہے۔ غالباً اس بیان سے بعض حضرات کو تعجب ہوگا کہ تاریخ کس طرح ترقی کی کفیل ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ ہی سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے آبا و اجداد کی تہذیب۔ تمدن اور طرز معاشرت کس قسم کا تھا۔ اسی فن کی مدد سے مصر، یونان، ہندوستان، روما اور قوم عرب کی ترقی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں

اسباب ترقی معلوم ہونے کے بعد ترقی کرنا کوئی مشکل امر نہیں جس طرح مرض کی صحیح تشخیص کے بعد ازالہ مرض آسان ہو جاتا ہے اسی طرح کسی چیز کے حصول کے اسباب کے دریافت کئے بعد اس چیز کا حاصل کرنا دشوار نہیں رہتا۔

یہ بات تشنہ تشریح نہیں کہ جس مضمون سے انسان کے اخلاق درست ہوتے ہیں وہ مضمون اخلاق ہے۔ مگر فن اخلاق صرف غیر مرئی مثالیں پیش کرتا ہے۔ برخلاف اس کے تاریخ مرئی مثالیں پیش کرتی ہے۔ مثلاً فن اخلاق یہ سکھاتا ہے کہ بادشاہ اگر رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو رعایا بادشاہ کی طرف دار ہو جاتی ہے اور اس طرح سلطنت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مرئی مثال ہمیں ایک بادشاہ کی تاریخ میں ملتی ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنی رعایا کے ساتھ بلا لحاظ مذہب و ملت مساویانہ اور اخلاقانہ برتاؤ کیا جس سے اس کی جملہ رعایا نہ صرف اس کی طرف دار ہو گئی تھی بلکہ اس میں کا ایک گروہ اس کو اوتار مانتا تھا۔ رعایا کی اس خوش اعتقادی کا نتیجہ تھا کہ اس بادشاہ کی مرکزی قوت ایسی مضبوط اور مستحکم ہو گئی تھی کہ اس کے فرامین کی دور سے دور مقامات میں بھی بلا چون و چرا تعمیل ہوتی تھی۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ زبان کی اصلاح علم ادب سے ہوتی ہے اور انسان علم ادب ہی کے مطالعہ سے زبان پر قدرت حاصل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ معمولی قابلیت کا انسان علم ادب کو بغیر کسی کی مدد کے حاصل نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس فن سے ہر شخص کو مذاق نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ہر انسان اگر زبان کی اصلاح کرے تو کیونکر اور اپنے مافی الضمیر کو خوش اسلوب پیرائے میں بیان کرے تو کس طرح۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان کو قصوں اور کہانیوں سے طبعاً دلچسپی ہوتی ہے خصوصاً بچے تو ان کے والہ و شیدا ہوتے ہیں۔ بالعموم قصے اور کہانیاں عمدہ اور شیریں زبان میں لکھی جاتی ہیں۔ نوعمر لڑکے تو انہیں صرف دلچسپی کی خاطر پڑھتے ہیں مگر زبان کی

عمدگی اور سلاست بھی ان پر اپنا اثر کرتی رہتی ہے۔ قصے اور کہانیاں گویا ہیں تاریخ کا پیش خیمہ۔ انسان جیسے جیسے بڑھتا ہے ویسے ویسے اس کی طبیعت میں سنجیدگی پیدا ہوتی ہے اور وہ بمقتضائے طبیعت سنجیدہ مضامین کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ قصوں اور کہانیوں کو چھوڑ کر تاریخ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن نو عمروں کو ابتداءً قصے اور کہانیوں سے دلچسپی ہوتی ہے جب وہ سن شعور کو پہنچتے ہیں اور ان کا مذاق سنجیدہ ہوتا ہے تو وہ انہیں کے لگ بھگ کسی دوسرے مضمون کے جویا ہوتے ہیں لامحالہ ان کی جویندہ نگاہیں فن تاریخ پر پڑتی ہیں۔ اگر ابتدا ہی سے اس مضمون کی اصولی تعلیم ہو تو طلباء کی طبیعت میں اس کا صحیح مذاق جاگزین ہونا لازمی ہے۔

غالباً یہ بات سننے میں آئی ہوگی کہ جو شخص تاریخ کا بی۔ اے یا ایم۔ اے ہوتا ہے اس کی زبان اچھی ہوتی ہے۔ اس کو اپنے مافی الضمیر کے ظاہر کرنے پر قدرت ہوتی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مضمون تاریخ اختیار کرنے والے کی زبان اچھی ہوتی ہے اور اسی کی بدولت ایسے اشخاص کو علم ادب کا مذاق پیدا ہوتا ہے۔

فن تاریخ کو انسان کے چال چلن کے درست کرنے میں بھی بہت بڑا دخل ہے چھوٹے چھوٹے بچے تاریخ کی کتابوں میں جب یہ پڑھتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں وجوہ سے بدنامی حاصل ہوئی اور زوال آیا تو وہ ان سے متاثر ہوتے اور اپنے دلوں میں تہیہ کر لیتے ہیں ہم ان سے حتی الوسع باز رہیں گے۔ اور جب مشہور و معروف اشخاص کی شہرت و نیک نامی کے اسباب سے واقف ہوتے ہیں تو ان پر کاربند ہو کر خود بھی شہرت دوام حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ میں مذکور ہے کہ جب بابر۔ سیواجی اور بہرام جی ملیباری قومی سورماؤں کے قصے سنتے یا پڑھتے تو خود بھی ان جیسے ہونے کی آرزو کرتے ظاہر ہے کہ ان کی اسی آرزو نے ان کو معراج ترقی پر پہنچایا۔ المختصر اس مضمون کی تعلیم سے انسان کا دامن مراد گوناگوں فوائد سے پر ہوتا ہے۔

تاریخ کی تعلیم کو ماہران فن تعلیم نے تین مدارج پر تقسیم کیا ہے پہلے زینہ کی تعلیم میں اتفاق رائے ہے کہ طلباء کو صرف سیدھے سادھے مگر دلچسپ قصے پڑھائے جائیں اور مشہور اشخاص کے سوانح سے انہیں واقف کیا جائے۔ علم النفس سے یہ ثابت ہے کہ طلباء کو قدیم ترین سورماؤں کے حالات زندگی سننے اور پڑھنے سے بیحد دلچسپی ہوتی ہے اس لئے پہلے زینہ اس اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ دوسرے زینہ میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ اصلی تاریخ پڑھائی جائے اور یہ کہ ہر واقعہ کے اسباب اور نتیجہ پر زور دیا جائے! اخیر درجہ کی تعلیم کے لئے یہ قرار دیا ہے کہ اس زینہ پر پہنچ کر طالب علم بطور خود اس مضمون کا مطالعہ کرے اور یہ کہ اس زینہ کی تعلیم تقاریر اور حوالہ جات پر مشتمل ہونی چاہئے۔ اس زینہ میں طبقہ فوقانیہ کی اخیر اور کلیہ کی جملہ جماعتیں داخل ہیں چونکہ اس وقت صرف اول الذکر دو زینوں کی تعلیم کے متعلق عرض کرنا مقصود ہے اس لئے انہیں کے طریقہ تعلیم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ابتدائی زینہ کا طریق تعلیم | سب سے اہم بات یہ ہے کہ تاریخ پڑھانے والا مدرس اپنے پر یہ بات فرض کرلے کہ تاریخ کے ہر سبق کی تیاری کی جائے۔ بہت ممکن ہے کہ دیگر مضامین بغیر تیاری کے تجربہ کی بنا پر پڑھائے جاسکیں مگر بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ مضمون تاریخ بلا تیاری کے کامیاب طریقہ پر پڑھانا محالات سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مضمون کی تعلیم اصولاً زبانی ہوا کرتی ہے۔ مدرس کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو اور اس کا حافظہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو مگر وہ تسلسل کے ساتھ ایک سال تک اسباق یاد نہیں رکھ سکتا۔ اس طویل عرصہ میں بہت سے امور کا ذہن سے اتر جانا بہت ممکن ہے۔ علاوہ ازیں جدید تحقیقات کی وجہ سے ہر مضمون میں نت نئی باتوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ان سے ہر مدرس کو کم از کم اپنے مضمون کی حد تک واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ طلباء جدید تحقیقات سے محروم رہیں گے اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ

مدرس بغیر تیاری کے تاریخ کا کوئی سبق نہ پڑھائے۔

طلباء میں دلچسپی پیدا کرنے اور ان کی قوت تخیلہ کو بیدار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سبق شروع کرنے سے پہلے نئے سبق پر دو تین ایسے سوالات کئے جائیں جن سے سابقہ اور نئے معلومات میں تعلق پیدا ہو۔ تاکہ نئے سبق کی عمارت معلومات سابقہ کی بنیاد پر اٹھائی جا سکے۔ اگر سبق بالکل انوکھی باتوں سے شروع ہو اور ان ابتدائی امور اور نئے سبق میں کوئی تعلق نہ ہو تو طلباء پر یہ سبق بار ہو گا۔ ظاہر ہے کہ طلباء ایسے سبق سے کماحقہ مستفیض نہیں ہو سکتے۔

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ تاریخ کا سبق شروع سے اخیر تک وقت واحد میں مدرس بصورت تقریر بیان کر دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ ایک سبق اس کی نوعیت کے لحاظ سے دو یا تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ مدرس کو چاہئے کہ ایک حصہ کو لے۔ اس کے ان واقعات کو جو طلباء کے علم سے باہر ہوں خود بتائے اور ایسے واقعات جو طلباء کے علم میں ہوں انہیں سے نکلوائے۔ اس عمل سے معلم اور متعلم ہر دو کا دماغ بروئے عمل رہے گا۔ جس سے نہ صرف دونوں کو لطف حاصل ہو گا۔ بلکہ دونوں کا واحد مقصد بھی پورا ہو گا۔ اگر صرف مدرس ہی کا دماغ بروئے کار رہا اور طلباء کا مجہول تو سبق ہر دو کے لئے بار گراں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ مدرسہ کے اکثر طلباء حقیقی تاریخ و جغرافیہ سے کورے ہوتے ہیں۔

جو سبق پیش کیا جائے وہ نہ بہت کم ہو اور نہ بہت زیادہ ہے۔ سبق کے افراط و تفریط سے طلباء کے دماغ پر برا اثر پڑتا ہے۔ زیادتی کی وجہ سے دماغ پر بار پڑتا ہے اور وہ اچھی طرح سے دوسرے دن تیار نہیں ہو سکتا۔ کمی کی وجہ سے طلباء کا دماغ اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کام ہی نہ کریں۔

مضمون زیر بحث کے واقعات اس پیرائے میں بیان کئے جائیں کہ حقیقی امور کی

تصویر سامنے کھنیچ جائے۔ یعنے مدرس جو کیفیت طلبار میں پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پہلے خود میں پیدا کرلے اور بعدازاں طلبار پر اس کا اثر ڈالے۔ مثلاً طلبا میں اگر یہ کیفیت پیدا کرنا مقصود ہو کہ رام جی کے بن باس اختیار کرنے سے انہیں رنج و ملال ہوا تو مدرس کو چاہیئے کہ پہلے خود اس کیفیت سے متاثر ہو۔ اس کی یہ کیفیت ضرور طلبا پر اثرانداز ہوگی۔ حقیقی امور کی تصویر کھنیچ جانے سے یہ مراد ہے کہ طلبا یہ سمجھنے لگیں کہ ان کے سامنے جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ محض بیان نہیں ہے بلکہ اصلی اور حقیقی واقعات ہیں۔ معتبر ذریعے سے سننے میں آیا ہے کہ ایک مجلس میں فخر شعرا انیس نے یہ مصرع۔

"کاٹا افعی ترا بھلا ہو"

پڑھ کے ہاتھ کو اس طرح پکڑ لیا کہ تمام حاضرین مجلس کو یہ شبہ ہو گیا کہ حقیقت میں انیس کے سانپ ڈس گیا اور وہ سانپ کو اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

دوران سبق میں کتاب کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس زینہ میں تو تعلیم صرف زبانی ہونی چاہیئے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس زینہ کے طلبا، کم سن اور کسی قدر بے شعور ہوتے ہیں۔ انہیں تو صرف کھیل کھود اور مزے مزے کی باتوں میں لطف آتا ہے اس عمر کے بچے کتابی تعلیم سے گھبراتے اور کتراتے ہیں۔ چونکہ ان کا علم ادب بہت کم ور اور ان کے معلومات عامہ بہت ہی محدود ہوتے ہیں اور چونکہ درسی کتاب کی عبارت مختصر اور ان کی سمجھ سے قدرے بالا ہوتی ہے اس لئے اگر کتاب کھول کر ان کے سامنے پڑھی جائے یا انہیں پڑھنے کے لئے کہا جائے تو یہ طریقہ انہیں گراں معلوم ہوتا ہے جو چیز گراں ہو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی اور جس مضمون سے دلچسپی نہ ہو اس کا کم عمر طلبا کے ذہن نشین ہونا مشکل ترین امر ہے۔ اس حقیقت حال کو اس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ اس عمر کے طلبار جب اپنے گھر کی بوڑھی عورتوں سے قصے کہانیاں سنتے ہیں تو نہایت دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ دوران قصہ گوئی میں بچوں کو متوجہ کرنے کے لئے اس ضعیفہ کو نہ بھی

ڈانٹ بتانی پڑتی ہے اور نہ کبھی مارنا پڑتا ہے۔ باوجود اس کے ختم قصہ پر ا
یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے قصہ کی فرمایش کرتے ہیں۔ دوسرے دن گ
یہ سنے ہوئے قصے پوچھے جائیں تو من وعن سناتے ہیں یہ اظہار دلچسپی اور یہ
انہماک اور پھر یہ کہ پورے کا پورا قصہ یا کہانی یاد رکھنا۔ یہ تمام امور اس بات
ثبوت ہیں کہ یہ محض زبانی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ چونکہ ہمارے مدارس میں اس زینہ کی
کتاب مقرر ہے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ ہم میں سے بعض کو اس امر کا احتم
اگر اس زینہ کی تعلیم زبانی ہوتی تو کتاب رکھنے کی کیا ضرورت تھی واقعہ یہ ہے کہ ک
رکھنے سے اس امر کا لزوم ظاہر نہیں ہوتا کہ تعلیم کتابی ہو۔ کتاب مدرس کی رہنما
اور اس لئے رکھی گئی ہے کہ طلباء پڑھے ہوئے سبق کو بشرطیکہ مدرس نے اس ک
توضیح وتشریح کی ہو اگر ایک وقت کتاب کھول کر دیکھ لیں تو اس سے مفہوم ا
سمجھ سکیں۔ کتاب کھول کر مشکل الفاظ کے معنی اور ادق جملوں کے مطالب کو سمجھ
نہیں۔ اگر یہ مضمون زبان انگریزی میں پڑھایا جاتا تو غالباً اس کی ضرورت داعی
اس وجہ سے کہ طلباء پڑھائے ہوئے سبق کو اگر پڑھنا چاہیں تو الفاظ اور جملہ
تشریح کے بغیر وہ مضمون کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔

یہ قصے اور واقعات طلبا ہی کی زبان میں بیان کئے جائیں۔ اگر اس کے خ
طلبا اس مضمون کی تعلیم سے کما حقہ بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔ بوڑھیوں سے سنے ہوئ
بچوں کو جو یاد رہتے ہیں منجملہ بہت سے اسباب کے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ نہا
واضح زبان میں ہوتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر طلباء ہی کی زبان میں ہوتے ہیں۔ اس لئ
طلباء ان کے ایک ایک لفظ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

دوران سبق میں محض درسی کتاب کے امور پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ واقعات
توضیح وتشریح کے لئے ایسی باتوں کا اظہار ہو جو طلبا کی معلومات میں اضافہ پیدا کر

باعث ہوں۔ اگر کسی واقعہ کو ان کے ذہن نشین کرنا مقصود ہو تو اس کی توضیح کے لئے ایک دلچسپ قصہ پیش کیا جائے۔

سبق کے وقت تصاویر۔ خاکے اور نقشوں کا استعمال نہایت ضروری ہے ان کے استعمال سے سبق نہ صرف واضح ہوتا ہے بلکہ سبق میں ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے سبق کے سمجھنے اور یاد کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے

ہر حصہ سبق کو اس کی نوعیت کے لحاظ سے وقت دیا جانا چاہیے اور اس کے ختم پر بذریعہ سوالات اس حصہ سبق کو دہرایا جائے۔ اور طلباء کے جوابات بعد اصلاح ضروری انہیں کی زبان میں تختہ سیاہ پر لکھے جائیں۔ اس طرح تمام حصوں کو ختم کیا جائے۔ اس زینہ میں اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ طلباء اس خلاصۂ تختہ سیاہ کو اپنی بیاض میں لکھ لیں۔

جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ بغیر اشارات سبق کے مذکورۂ بالا طریقہ غیر واضح رہے گا۔ اس لئے انشاء اللہ آئندہ کسی دوسری اشاعت میں کسی ایک زینہ کے سبق کے اشارات پیش کئے جائیں گے تاکہ جو اصول بتائے گئے ہیں انہیں عملی صورت میں پیش کیا جا سکے۔ (باقی دارد)

غلام دستگیر فاروقی

انجمن اساتذہ ملبن

سالانہ کانفرنس انجمن ہذا کی دوسری سالانہ کانفرنس بابتہ ۱۳۳۷ف بتواریخ ۶ و ۷ ہ شہریور ۱۳۳۷ف بمقام سٹی کالج منعقد ہوگی۔ نمایش تعلیمی کے لئے اشیاء تیار کردہ مدرسین وطلباء معتمد صاحب نمایش سب کمیٹی کی خدمت میں بن ابتدائے ۲۹ ہ امرداد ۱۳۳۷ف تا ۳ ہ شہریور ۱۳۳۷ف ۹ بجے صبح سے ۲ بجے دن تک بمقام سٹی کالج روانہ کیجائیں۔

سہ ماہی پروگرام خورداد ۱۳۳۷ف میں ایک عام جلسہ ہوگا۔

تیر ۱۳۳۷ف میں بوجہ تعطیلات موسم گرما کوئی جلسہ نہ ہوگا۔

امرداد ۱۳۳۷ف میں سالانہ کانفرنس منعقد ہوگی (چونکہ مدارس ۲۶ ہ امرداد ۱۳۳۷ف تک بند رہیں گے اس لئے حسب صراحت کانفرنس تعلیمی کا انعقاد شہریور میں ہوگا)

قیام کتب خانہ انگلستان کی واپسی پر مولوی سید محمد حسین صاحب نائب ناظم تعلیمات سرکارعالی و مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ کے استقبال کے لئے مدرسین علاقہ ہذا نے جو چندہ جمع کیا تھا اس سے ایک کتاب خانہ قائم کیا جارہا ہے ترتیب فہرست کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کے اراکین حسب ذیل اصحاب ہیں۔

(۱) احمد حسین خاں صاحب بی اے پرنسپل مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم بلدہ

(۲) ہمنت راو صاحب ایم اے۔ پروفیسر تاریخ نظام کالج

(۳) راما نوجا چاری صاحب بی اے۔ بی ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نامپلی (معتمد)

(۴) عبدالنور صدیقی بی اے بی ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل۔

(۵) جی اے چندر دارکر صاحب ایم اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی بازار۔

قیام انجمن اتحادی | مرکزی انتظامی کمیٹی کی خاص کمیٹی نے باتفاق تصفیہ کیا ہے کہ انجمن اساتذۂ بلدہ کے تحت ایک مرکزی انجمن اتحادی قائم کی جائے جس کے ایک ہزار حصے ہوں گے لیکن۔

(۱) جن مدارس میں انجمن قائم ہے ان کو اختیار ہوگا خواہ وہ مقامی انجمن کو توڑ دیں یا بدستور قائم رکھیں۔

(۲) جو مدرسین مقامی انجمنوں کے رکن ہیں وہ مرکزی انجمن کے رکن ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ صرف ایک انجمن سے قرضہ لیں۔

سید محمد شریف مشہدی
معتمد عمومی

بمبئی میں جبری تعلیم | حکومت بمبئی نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک ڈسٹرکٹ بورڈ اور محکمہ صفائی جبری تعلیم کے نفاذ کا بیڑا نہ اٹھائیں اس وقت تک تحتانی تعلیم کی توسیع کے لئے ان کی پیش کردہ تجاویز منظور نہ کی جائیں گی۔

بمبئی میونسپلٹی کارپوریشن کی تعلیمی کمیٹی نے مفت اور جبری تعلیم کی اسکیم پیش کی ہے تجویز ہے کہ بی اور ای حلقوں میں ۶۰ مدارس کھولے جائیں جن میں ۷۵۰۰ لڑکوں کی تعلیم کا انتظام ہوگا ان مدارس کی تعلیم ۱۸۰ مدرسین کے ذمہ ہوگی اور فی مدرس ۴۲ لڑکے ہوں گے۔

ایک دفتر اطفال شماری کا افتتاح بھی عمل میں آئے گا جس میں حسب ذیل عہدہ دار اور عملہ ہوگا۔

(۱) مددگار افسر حاضری مواجبی یاب [illegible]
(۲) افسر اطفال شماری " [illegible]
(۳) ۱۲ صیغہ دار " [illegible]
(۴) ۱۲ چپراسی " [illegible]

مجموعی اخراجات کا تخمینہ (۴۷۸۶۸۴) روپیہ کلدار کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اسکوٹنگ | گزشتہ پانچ سال میں ہندوستانی اسکوٹس کی تعداد ۶۰۰۰ سے ۱۰۴۰۰۰ ہوگئی ہے۔

فرانس میں ثانوی تعلیم مفت | فرانسیسی پارلیمنٹ نے موازنہ ۱۹۳۸ء میں ایک رقم منظور کی ہے جس سے یکم اکتوبر سے بعض ثانوی مدارس میں مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ حالانکہ یہ رقم بہت قلیل ہے اور اس قانون کا نفاذ مدارس کی ایک محدود تعداد میں ہوگا لیکن اس واقعہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ قانون بتدریج دوسرے مدارس میں نافذ ہوگا کیونکہ فی الحال تمام مدارس میں معافی فیس سے حکومت کو بیحد نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ پہلے صرف ۵۶ مدارس کے لئے منظوری دی گئی تھی لیکن بڑھتے بڑھتے تعداد ۷۷ تک پہونچ گئی ہے۔

شوق کتب بینی | فارغ التحصیل ہونے کے بعد کتابوں کو خیرباد کہدینا ایک عام بیماری ہے۔ کچھ تو عدیم الفرصتی اس کا سبب ہے لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالعہ اور امتحان میں ایتلاف ذہنی پیدا ہوگیا ہے اس لئے امتحان میں کامیابی کے ساتھ عموماً مطالعہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اور تو اور خود مدرسین جنہیں روزانہ کتابوں سے سابقہ رہتا ہے وہ بھی اپنے مطالعہ کی دوڑ دھوپ درسی کتب تک محدود رکھتے ہیں۔ ضرورت تعلیمی سے قطع نظر کتب بینی بجائے خود ایک جانفزا مسرت بیز شغلہ ہے۔ گیا پرشاد لبریری کانپور میں تقریر کرتے ہوئے سٹرلے ایچ مکنزی ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ نے کتب بینی کی لطف اندوزیوں کے متعلق فرمایا۔ "جو ماہرین تعلیم یہاں موجود ہیں وہ بخوبی واقف ہیں کہ فن تعلیم کی ہر کتاب میں مقاصد تعلیم پر ایک بسیط باب ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ ہر مصنف مقاصد کے متعلق اپنی علیحدہ رائے رکھتا ہے۔ میری اپنی بھی الگ رائے ہے۔ میرے نزدیک مقاصد تعلیم تین ہیں۔

(۱) لوگوں کو خود سوچنا سکھانا

(۲) لوگوں کو خود کام کرنا سکھانا

(۳) لوگوں کو خود مطالعہ کرنا سکھانا

جب میں کسی گریجویٹ کے مکان پر ملاقات کے لئے جاتا ہوں تو مجھے اس کی الماری میں صرف قانونی کتابیں یا رپورٹیں نظر آتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے طالب علموں کو مطالعہ کرنا نہیں سکھایا۔ ہم نے انہیں صرف پڑھنا سکھایا ہے ہم نے انہیں کتابوں سے علم حاصل کرنا سکھایا ہے لیکن ہم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کتابوں سے عقل و حکمت سیکھیں جو لطف و مسرت کا سرچشمہ ہے یا وہ کتابوں کو اپنی زندگی کی پریشانیوں اور مصائب میں سینہ سپر بنائیں۔ ماہرین تعلیم کے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ وہ کونسی کتابیں ہیں جو لوگوں میں مطالعہ کا شغف پیدا کرتی ہیں۔ اس کا جواب لارڈ آدبیری نے دیا ہے کہ کتاب کتاب میں فرق ہے۔ بعض کتابوں کا سرسری مطالعہ کافی ہے بعض بالکل بیکار اور زہریلی ہوتی ہیں اور دل و دماغ کو فاسد خیالات سے بھر دیتی ہیں بہت کم لوگوں کو احساس ہے کہ کتابوں کے انتخاب پر لطف زندگی اور تعمیر کردار کا کس درجہ انحصار ہے۔ بہت سے لوگ مشکل کتابوں کے مطالعہ سے اس لئے باز رہتے ہیں کہ شاید سمجھ میں نہ آئیں لیکن اگر وہ ان کتابوں پر کچھ بھی وقت صرف کریں تو کسی کو تنگ خیالی کی شکایت نہ رہے گی یہ بیحد ضروری ہے کہ صرف ان کتابوں کو منتخب کیا جائے جن سے دلچسپی ہو۔ جب مطالعہ کی عادت پڑ جائے تو انتخاب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

مطالعہ کی عادت خود بخود نہیں پڑتی۔ لوگ پڑھنے کے عادی اس طرح نہیں ہوتے جس طرح بط تیرنے کی۔ مطالعہ کی عادت کو بتدریج استوار کرنا پڑتا ہے"

جلسہ سالانہ مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نلگنڈہ | بتاریخ ۲۳ خورداد ۱۳۳۰ف روز جمعہ ۴ بجے شام کو احاطہ مدرسہ میں جلسہ کا انعقاد بصدارت جناب قاضی عبید اللہ صاحب اول تعلقدار عمل میں آیا۔ احاطہ مدرسہ نہایت خوبصورتی سے رنگین جھنڈیوں اور شامیانہ سے

آراستہ کیا گیا تھا۔ مہانوں کے لئے کرسیوں وغیرہ کا کافی اہتمام تھا۔ ۴ بجے تک نشست گاہیں علیٰ قدر مراتب مقامی عہدہ دار صاحبان، وکلا، معززین، ساہوکاران وعوام سے معمور ہو چکیں۔ ۴½ بجے اسپورٹس شروع ہوے۔ جو ۶ بجے تک جاری رہے۔ پرنسپل صاحب نے صدر نشین صاحب جلسہ کو پھول کے ہار پہنائے فوٹو لیا گیا، طلبائے مدرسہ نے قرأت، حمد، نعت شریف اور بھجن نہایت سریلی اور دل دوز آوازمیں سنایا۔ نماز مغرب کا وقت قریب تھا، مدرسہ میں نماز کا انتظام نہایت سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ تمام حاضرین نے نماز ادا کی۔ جب بعد ادائی نماز سب اپنی اپنی نشست گاہوں پر آگئے تو پرنسپل صاحب نے حالات ورفتار ترقی مدرسہ سے متعلق ایک مبسوط اور جامع رپورٹ پڑھ کر سنائی رپورٹ ختم ہونے کے بعد صدر نشین صاحب جلسہ نے تقریباً ایک گھنٹہ تک تقریر فرمائی جو نہایت پرمغز اور جوش انگیز تھی۔ اور جس کے ہر لفظ سے ملک کی ترقی تعلیم کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی اور دردمندی ٹپکتی پڑتی تھی۔ اور جس میں صاحب معزنے وعدہ بھی فرمایا کہ نادار طلباء کی ممکنہ امداد اور کامیاب طلباء کی ملازمت غرض ہر اس معاملہ میں جو مدرسہ کی بہبودی کے لئے ہو ہر طرح کی اعانت و دستگیری سے دریغ نہ کیا جائے گا آخر میں مولوی احمد عبد العزیز صاحب صدر مدرسہ کی کارگزاری اور ترقی مدرسہ کا حال بیان کرتے ہوے اسکوٹس مدرسہ کی تعریف پر تقریر ختم فرمائی۔ اس کے بعد اسناد اور انعامات تقسیم کئے گئے۔ مدح خسروی کے قصیدے کے بعد تقریباً ۸½ بجے جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ برخاست ہوا۔

مدرسۂ وسطانیہ نظام آباد | بتاریخ ۱۵ اسفندار ۱۳۴۳ ف ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم بغرض معائنہ تشریف فرما ہوے مدرسے کے دروازہ پر مولوی عبد العزیز خان صاحب...

صدر مدرس مدرسہ و دیگر عہدہ داران تعلیمات نے خیر مقدم کیا۔ بائی اسکاوٹس نے سلامی دی۔ مدرسے کی آرائش میں طلبا اور مدرسین نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی عالی جناب صدر اعظم بہادر آرائش کو ملاحظہ فرماتے ہوئے بڑے ہال میں تشریف فرما ہوئے' جہاں بچوں نے خوش الحانی کے ساتھ اردو' مرہٹی' تلنگی' اور انگریزی نظمیں پڑھیں۔ محمود فاتح صاحب مددگار مدرسہ نے اردو میں اور جمال خانصاحب آزاد نے فارسی میں مدحیہ نظمیں سنائیں۔ اس کے بعد مولوی عبدالعزیز خاں صاحب نے سپاسنامہ پیش کرنے کا شرف حاصل فرمایا۔ جس کے جواب میں مہاراجہ بہادر نے اظہار مسرت فرماتے ہوئے درگاہ رب العزت میں دعا کی کہ یہ ہونہار پودے قابل ہوکر اپنے ملک اور مالک کی خدمت کریں۔ اسی ضمن میں جماعتوں کا بھی معائنہ فرمایا گیا اور پچاس روپیے بغرض تقسیم شیرینی اور ایک سو ساٹھ روپیہ نظم پڑھنے والے لڑکوں کو عطا فرمائے گئے۔

تنقید و تبصرہ
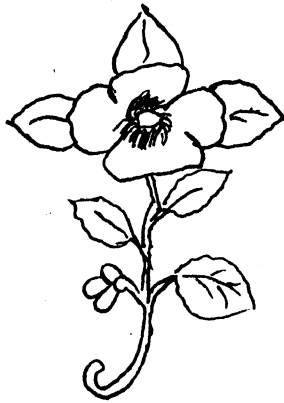
نظام گزٹ | عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے ملک میں ادبی فضا پیدا ہو چلی ہے۔ ہر طرف علم کی گرم بازاری کے آثار نمایاں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تصنیف و تالیف و صحافت کا کام شروع ہو گیا ہے گزشتہ چند سالوں میں مختلف جرائد اور اخبار حیدرآباد سے نکل پڑے۔ نظام گزٹ بھی اپنی زندگی کا پہلا سال کامیابی کے ساتھ ختم کر رہا ہے۔ سالگرہ نمبر جو اعلیحضرت حضور نظام کی سالگرہ کی یاد میں شائع ہوا ہے، ہمارے خیال میں باطنی خوبیوں کے اعتبار سے اپنے معاصرین پر سبقت لے گیا ہے۔ مضامین نہایت ہی بلند پایہ ہیں۔ نئے معلومات اور اچھوتے خیالات اور جذبات کا کافی ذخیرہ ہے ملک کے بہترین نثار، نقاد اور کہنہ مشق اساتذہ نے چار چاند لگا دئے ہیں۔

شذرات کی ناقدانہ طرز تحریر جو ایک ہفتہ وار اخبار کا مسلک ہونا چاہئے اس پر ظرافت کی ہلکی جھلک دل کش اور موثر ہے "چار مینار کی گپ" نے بسوق کلب اور ملا رموزی کی گلابی اردو کی یاد تازہ کر دی۔ جو کام اس کے ذریعہ لیا جا رہا ہے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ سیاسی مسائل بھی اس کے تحت لئے جائیں تو مناسب ہے۔

نظام گزٹ بڑی تقطیع پر شائع ہو رہا ہے۔ رؤسا اور مشاہیر کے بلاکس کے اضافہ سے ایک جدت پیدا کر دی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی اصلاح طلب ہے بعض مقامات پر دیدہ ریزی کی ضرورت پڑتی ہے۔ گو یہ شکایت عام ہے مگر اچھا ہوتا کہ نظام گزٹ میں یہ نقص بھی نہ ہو۔

قابل مدیرین نے اس کی تدوین اور ترتیب میں انتہائی محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ اس کامیابی پر ہم مبارکباد دیتے ہیں۔ سالانہ چندہ (ع) سکۂ ۔

ہنر مند یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو لاہور سے زیرادارت جناب محبوب الٰہی صاحب بی اے ایل ایل بی پلیڈر شائع ہو رہا ہے۔ اقتصادی ضروریات کے مدنظر اس کا مقصد صنعتی، زراعتی اور تجارتی معلومات کی نشر و اشاعت ہے۔ اہل پنجاب نے نہ صرف ادبی خدمات کے لئے کمر ہمت چست باندھی ہے۔ بلکہ ملکی افلاس اور نکبت کے دور کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا ہے مقصد اچھا اور مبارک ہے۔ مضامین مفید ہیں۔

قیمت سالانہ (ے) ہے۔ دفتر رسالہ ہنر مند لاہور سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

"**مجلہ مکتبہ**" مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ نے ملک کی شدید ضرورت کو پورا کرنے کے علاوہ بیڑا اٹھایا ہے کہ علوم جدیدہ کی ترویج اور ادبی کتب کی نشر و اشاعت سے ملک میں علمی فضا پھیلائے۔ مکتبہ کے قیام سے الحمدللہ خاصی کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی اب اسی مقصد کے تحت "مجلہ مکتبہ" کا اجرا عمل میں آیا ہے جس میں دکھنی ادبیات کو مستقل طور سے جگہ دی جائے گی۔ قدیم اردو کتب میں دکھنیات کا عنصر اچھا خاصا ہے۔ بعید کیا کہ بے شمار جواہر ریزے اب بھی محفوظ ہوں۔ مقصد بہت اچھا ہے کہ دکھن کی حقیقی عظمت بے نقاب کی جائے۔

رسالہ زیر تنقید میں چار مضمون قدیم اردو سے متعلق ہیں۔ جن میں سے قابل ذکر "آٹھویں صدی کی نظم و نثر کا ایک نمونہ" ہے اور مضامین بھی اچھے ہیں مگر بحیثیت مجموعی پہلا نمبر جس آب و تاب کا ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہے۔ قابل مدیر کا افتتاحیہ مضمون ان کی دلچسپی اور صحیح مذاق اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ رسالہ ترقی کریگا اور ہندوستان کے بہترین رسائل میں گنا جائے گا۔

گشتی کتب خانہ حیدرآباد میں علمی گرم بازاری نے کتابوں کی مانگ بڑھادی ہے لیکن کتابوں کا خریدنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسری طرف معدودے چند کتاب خانوں میں وقت کی پابندیوں کی وجہ سے فرصت و اطمینان سے مطالعہ کرنا نصیب نہیں ہوتا۔ عرصہ سے ایک عام ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ عمدہ عمدہ کتابیں ہر کس و ناکس کے مطالعہ میں آسکیں اور کسی پر بار نہ ہو۔ یہ ضرورت گشتی کتب خانہ کے قیام سے بڑی حد تک رفع ہو گئی ہے۔ گشتی کتب خانہ کا نصب العین اولین یہ ہے "ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے اردو کتابوں کا مطالعہ آسان کر دیا جائے"۔

چندہ ماہانہ صرف آٹھ آنے یا سالانہ (صہ) ہے اور کتابیں ممبروں کے گھر پر چپراسی پہونچا دیتا ہے سررشتہ تعلیمات کی قدردانی اور مولوی سید محی الدین صاحب بی۔اے مددگار ناظم تعلیمات سرکار عالی و مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کی سرپرستی سے کتب خانہ کو ۱۰ ماہانہ کی امداد ملی ہے جس سے توقع کی جاتی ہے کہ قارئین کے لئے اور زیادہ سہولتیں بہم پہونچائی جائیں گی۔ لیکن ہمارے نزدیک واپسی کتاب کی مدت غیر معین رکھنے سے اراکین کو ایک قسم کی بے اطمینانی رہتی ہے اور کسی کتاب کی دستیابی کا یقین نہیں رہتا۔ اس لئے مناسب ہوگا اگر واپسی کتاب کے لئے ۱۵ دن یا ایک ماہ کی مدت کا تعین کر دیا جائے۔

گشتی کتب خانہ یورپ و امریکہ میں عام چیز ہے لیکن ہندوستان میں نئی تنظیم ہے۔ قوم کو علمی غذا مہیا کرنے کی سعی بلیغ جو فضل اللہ صاحب فرمارہے ہیں قابل تحسین و ہمت افزائی ہے ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ بدیسی پودا ہندوستانی آب و ہوا میں بھی پنپے اور خوب پھلے پھولے۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ حیدرآباد دکن کی
دوسری سالانہ کانفرنس

بصدارت عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (آکسن) معتمد سیاسیات سرکار عالی

بروز پنجشنبہ و جمعہ ۶ و ۷ شہر یور ماہ الٰہی ۱۳۳۷ف م ۱۲ و ۱۳ جولائی ۱۹۲۸ء

بمقام سٹی کالج منعقد ہوگی

اراکین انجمن کے علاوہ جو حضرات شریک کانفرنس ہونا چاہیں براہ کرم بہت جلد مجھے اطلاع دیں اور بلدہ پہنچکر شرکت کانفرنس کا ٹکٹ مجھ سے حاصل فرمالیں۔

کانفرنس میں پیش ہونے والی تجاویز پر صرف اراکین انجمن ہی رائے دے سکتے ہیں مدارس بلدہ کے مدرسین کے علاوہ عہدہ داران و ملازمین سررشتہ تعلیمات و معتمدین مدارس امدادی میں سے جو حضرات بہ حیثیت رکن شریک کانفرنس ہونا چاہیں۔ ان سے استدعا ہے کہ بہت جلد مبلغ (چار روپیہ) سکہ عثمانیہ چندہ کی بابت روانہ فرماکر اپنا نام درج رجسٹر کرالیں۔ اس چندہ میں انجمن کے سہ ماہی رسالہ "حیدرآباد ٹیچر" کا ایک سال کا چندہ شریک ہے۔

نوٹ۔ عالیجناب راجہ راجان مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی سے استدعا کی جانے والی ہے کہ از راہ علم پروری نمائش تعلیمی متعلقہ کانفرنس کا اپنے دست مبارک سے افتتاح فرمائیں۔

توقع ہے کہ ہماری یہ استدعا شرف قبولیت حاصل کرے گی فقط

المعلن

سید خیرات علی مددگار مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ و معتمد استقبالیہ کمیٹی

One packet ... As. 2
Ten packets ... Re. 1
100 packets ... Rs. 8
Hakim Mohammed
MIRZA KHAN SAHIB
Inspector of Druggists' Shops
Hyderabad-Deccan
SAYS
IXIR-I-DANDAN
is
a cheap and reliable
Indian TOOTH POWDER
Prepared by
LATIFIAH Co.,
No. 4228, Naga Bowli,
Yakootpura,
HYDERABAD Dn.
ناظر عطاراں
اکسیر دنداں
تیار کردہ
IXIR-I-DANDAN
TRADE MARK REGTD. No 107 (1336 Fl.
ITS DAILY USE IS A SAFEGUARD AGAINST
ALL TOOTH TROUBLES.
IT CONTAINS NOTHING WHICH MAY BE INJURIOUS
OR OBJECTIONABLE IN ANYWAY.
IT CAN BE USED AT ANYTIME DURING
DAY AND NIGHT WITH EITHER
HOT OR COLD WATER.

wish to point out that until Government creates a greater demand for technically trained men by developing the economic resources of the State, Government service will continue to be the chief attraction. It is gratifying to find that the authorities are now devoting special attention to the growth of agriculture, industry and commerce in the Dominions. When the efforts which they are making in this direction bear fruit, we feel confident that there will be no lack of educated young men willing to take up agriculture, industry or trade as their profession. In the meantime, steps should be taken for providing better facilities for training in these professions. Some time ago a committee was appointed to consider this question, and we think that it is high time that the recommendations of the committee were published for the information of the public and that necessary action was taken thereon.

We heartily congratulate Nawab Haider Nawaz Jung Bahadur, Minister of Finance, Hyderabad Deccan, on the Knighthood which has been conferred on him. He richly deserved this mark of distinction for the services which he has rendered in the cause of education.

EDITORIAL.

Vocational Education in H. E. H. the Nizam's Dominions.

PRESIDING at the annual prize distribution of the Government Chadderghat High School, Nawab Nizamat Jung Bahadur, M. A., L. L. B. (Cantab), Barrister-at-law, O. B. E., Sadrul-Maham of the Political Department drew special attention to the problem of unemployment among young men who have received a purely literary education in our schools and colleges and emphasised the need for vocational education. "We have," he said, "dozens of schools at the head-quarters and perhaps hundreds of schools in the Dominions, and there is the Osmania University turning out its B. A's and M. A's with the rapidity of Ford cars! What are we going to do for all these men and what are they going to do with themselves?"

The comparison which Nawab Nizamat Jung Bahadur has drawn between the annual out-turn of graduates and the production of Ford cars has naturally given rise to a heated controversy in the local press. The ideas associated with Ford cars led some people to imagine that he was referring to the quality of the graduates of the Osmania University, but a careful perusal of his address shows that he was only thinking of numbers when he drew the above comparison. It is no fault of the University if it produces more graduates than can earn a livelihood worthy of the education which they have received. The fault, in our opinion, lies with our social and economic system, which makes it difficult for them to secure other employment than Government service. We thoroughly endorse Nawab Nizamat Jung Bahadur's appeal to young men that they should learn handicrafts and useful arts, and we agree with him that literary education should not make them superior to such vocations. But we

the 5th April, 1928. The exhibits included posters of English Railway Companies, pictures illustrating English rural and sea-side life and oil paintings and water colours prepared by local amateur artists. But the most interesting feature of the exhibition was the art and craft work of the pupils of the school. The arrangement and classification of the exhibits left nothing to be desired. A large number of teachers and students belonging to other schools availed themselves of the opportunity given them for visiting the exhibition. We congratulate Miss Kelley, Headmistress of the Primary Department, Madrase-Aliya, on the success of the exhibition and trust that other schools will follow the excellent example set by her.

A party of four cyclist scouts under the leadership of Mr. T. N. Sivan of the Government City College left Hyderabad Deccan on push bikes for Mysore, a distance of about 500 miles, on the 16th May, 1928. On arriving at Mysore, they will convey a message of congratulation from H. E. the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, President of the Executive Council, Hyderabad Deccan, to His Highness the Maharaja of Mysore on the occasion of the latter's birthday. We have no doubt that this enterprise will, besides promoting co-operation between the Hyderabad and Mysore Scouts, give an impetus to adventure-seeking young men in India. We wish the party every success.

Notes and News.

Nawab Masood Jung Bahadur, B. A. (Oxon), Barrister-at-Law, will retire in the middle of July next after having served as Director of Public Instruction, H. E. H. the Nizam's Dominions, for a period of 12 years. His impending departure from our midst is deeply regretted by all, and by none more than the members of the Hyderabad Teachers' Association, in which he has always taken a keen interest as its patron. During his tenure of office Nawab Masood Jung Bahadur has, by his sterling qualities of head and heart, won the love and esteem of all those who have come into contact with him either officially or otherwise. In order to give expression to their appreciation of the valuable and eminent services rendered by Nawab Masood Jung Bahadur and to their feelings of regard and affection towards him, the members of the Education Department will give a farewell entertainment to him on the eve of his departure. In our next issue we shall publish a review of the remarkable progress in education which has been achieved in these Dominions during his directorship.

The Second Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association will be held at the City College on the 12th and 13th July 1928 under the presidency of Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur B. A., (Oxon), Political Secretary to H. E. H. the Nizam's Government. It is expected that the Conference, as well as the educational exhibition which will be held along with it, will be opened by H. E. the Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, President of the Executive Council.

The Primary Department of the Madrase-Aliya, Hyderabad Deccan, held an Art Exhibition from the 28th March till

school and the Public Examination. Mr. Mayhew came to Hyderabad as an expert adviser and the Hyderabad School Leaving Certificate Examination was modelled on the Madras one.

The School Final system has been working since 1909. And it has been felt by several educationists that, in actual practice, the B group subjects *viz.* Indian History and Elementary Science, have been neglected in schools. For several obvious reasons, the managers of schools are only guided by the examination results and the B group subjects were not included among the subjects for examination. The result of this state of affairs is that a student who joins the Intermediate class in History does not possess sufficient knowledge of Indian History to enable him to follow lectures on that subject. Apart from its utilitarian value, a training in Indian History is of immense value in developing a sense of respect for the past traditions and culture of one's own country. Of course, the history of India, as presented in some of the text-books is not satisfactory. Many portions of it have to be re-written.[a] But it is very necessary that it should be removed from the insignificant place it now occupies and included in the compulsory groups.

S. HANUMANTHA RAO,
Professor of History, Nizam College.

(a) See my paper on The Teaching of History in the Educational Review, Aug. 1925.

elementary grade to attend it. This arrangement would benefit the teaching profession by helping to keep alive in the minds of its votaries the principles of teaching once learnt. The suggested course would cause no inconvenience to teachers or training schools, provided it is arranged in the off-seasons.

In Madras the intermediates are trained along with the matriculates for one year, whereas in Hyderabad the intermediates are trained separately. Our arrangement is decidedly better than that of Madras, because the intermediates have undergone a distinctly higher academic course and may be credited with a larger and wider outlook. Their usefulness as teachers is higher, and they can turn out better work as trained teachers of a superior grade. Thus Madras may very well copy Hyderabad in respect of certain educational reforms.

A. VENKATRAMIAH,
Principal, Government Normal School, Warangal.

III.

Reform of the H. S. L. C. Course.

AT the last meeting of the Academic Council of the Madras University, held on 13th March 1928, it was resolved that the existing syllabuses of the School Leaving Certificate Examination should be modified. The important change contemplated is the abolition of the B group and the inclusion of the subjects of the B group in the other two groups.

The old Matriculation Examination was abolished on the ground that it laid too much emphasis on examinations and too little on school work. It was replaced by the School Final Course, with its division into three groups and an elaborate scheme of moderation of marks obtained at the

addition to giving them professional training. By not discounting the general course the purpose of reduction of the period is defeated. It is neither possible to give satisfactory professional training nor to effect any real improvement in general education. The best place for general education is the high school; and the authorities of the training schools, instead of taking in different men and trying to make efficient teachers of them by including general education in the course, may well select men of good educational attainments from among the passed men and give them a year's sound professional training, instructing them in the right method of teaching the common school subjects. This training should include the study of discipline, psychology, principles of teaching, methods of teaching common school subjects and the actual handling of classes subject to observation and criticism. Experience leads me to make this suggestion.

For any profession to maintain its prestige and efficiency, its votaries should be keenly alive to their responsibilities and strain every nerve to discharge them in full by being up-to-date in their knowledge and enlightened in their methods of procedure. Of all professions, teaching is in danger of most readily deteriorating unless special efforts are made constantly to maintain its ideals. It is, therefore the duty of the educational authorities to provide facilities for teachers, particularly for those in the lower grades, to come into frequent contact with experienced educationists of recognised merit. According to the existing arrangement, teachers under training are discharged after a year and left, therefore, to themselves more or less for life. This arrangement does not help the teachers to be up-to-date. The danger of vegetation is greater. This must be remedied by the institution of what may be called a "Refresher course" extending over from four to six weeks at the end of every five years after training. The department must make it obligatory on all trained teachers of the secondary and

elementary teachers whose general educational qualifications were too low. Consequently orders were issued restricting admission to the three normal schools in the State to "Middle-passed" men. Quite recently additional classes were opened for matriculates and intermediates in the Hyderabad Normal School, which was thus transformed into the Osmania Training College. This was a step in the right direction. Ere long the existing College may undertake to train graduates who may thus be saved the trouble of going elsewhere for completing the B. T. Course.

The name of Nawab Masood Jung Bahadur, our able and popular Director of Public Instruction, is associated with many useful reforms in the Department of Education. The Nawab was not slow to perceive that it was not profitable to keep a teacher in a training school for two long tedious years and that the arrangement was doubly cursed, as it benefited neither the student nor the Educational Department. He found that the expenditure incurred by Government was doubled, while the return was certainly not adequate. He concluded that the interests of education would not materially suffer by having the period of training halved. Accordingly, teachers of all grades—Higher Elementary, Matriculates and Intermediates—have now to spend only one year in the training institutions. This reform should prove satisfactory and convenient to all concerned. History reminds us that it is by no means novel. A system akin to it was once in vogue in Madras and produced good enough results. The disadvantages of the two years' course are now arresting the attention of the Madras educational authorities and it is not unlikely that, in the near future, the period of training will be reduced to one year even in Madras.

True, the course is reduced to one year in Hyderabad; but that is not enough. In this *nominally* one year, but *virtually* nine months, the training schools are saddled with the work of improving the general education of teachers in

II.

Teachers' Training in H. E. H. the Nizam's Dominions.

EXPERIENCE has shown that the general education of every teacher of the young, worthy of the name, whatever the standard of instruction expected of him, whether in rural or urban areas, should be at least of the H. S. L. C. or the matriculation standard. Of course, the higher his qualifications the better must be his teaching. Mr. Thickett in his proposals for the re-organising of Training Schools very rightly points out that, in view of local conditions, the ideal to be gradually worked up to is that no one who has not successfully completed the secondary school course should be permitted to enter the teaching line.

Every teacher must take his profession seriously by making himself technically efficient. Several years ago H. E. H. the Nizam's Government recognised the imperative need for professional training by opening a normal school at Hyderabad for the special purpose of training lower and higher elementary teachers in the State. "Special passed" men and "middle-passed" men were respectively eligible for the two grades of training. The arrangement was to keep the teachers in the training school for two years—one year to add to the students' general knowledge and the other year to be devoted to their professional training.

Subsequently, two new schools arose as a consequence of the valuable recommendations of Mr. Mayhew that Telingana and Marathwadi divisions should have their own training schools on the basis of the vernacular medium of instruction. The Telugu Normal School at Warangal was opened in 1328 Fasli, and the Marathi normal school at Aurangabad in 1329 Fasli.

The proposals of Mr. Thickett made pointed reference to the utter futility of giving professional training to lower

tions by heart; what is required of them is the power to recognize the different parts of speech. The teacher must be able to discriminate language necessities from grammatical luxuries. The classification of adjectives, adverbs, prepositions and conjunctions into classes and sub-classes and of verbs into regular and irregular or into weak and strong is simply superfluous and may be safely passed over to the great relief of the children.

To come to the legitimate scope of grammar. Grammar is synonymous with the laws or principles of language. The truths that grammar teaches are to be found in the language itself. So then, the principles of language as taught theoretically are of no practical value to the child. The teacher has to guide the children to discover the truth for themselves or to draw their attention to the principles involved in the course of the lesson. They need not get the rules by heart. What children require is a working-knowledge of the principles of language which is gained not from grammar but from the language itself by means of *observation*, *inference* and *application*.

To sum up: seeing that the transformation of words has nothing to do with grammar and that the principles of language may be learnt from the language itself, we conclude that the much-dreaded grammar may be eliminated from language-study so far as English is concerned in favour of a natural and effective means of teaching the principles of language.

NARAYANA RAO,
Assistant, Government High School, Medak.

CORRESPONDENCE.

I

The Teaching of English Grammar.

I wish to draw attention to the time-honoured misconceptions regarding the nature and scope of grammar and its place in the teaching of English. English grammar is defined in books on grammar as teaching us how to speak and write English correctly. This definition limits the scope of grammar to the rules of syntax, but in practice the different forms which nouns, pronouns, verbs and adjectives assume for number, gender, case, tenses and for degrees of comparison have been brought under the rules of grammar. Besides the forms above mentioned, there are other forms, namely, noun, verbal, adjectival and adverbial, and these forms are also treated as grammatical forms. If these forms are looked upon as belonging to grammar, then a dictionary in which, besides the meaning of words, details bearing on number, gender and tense, noun, verbal and adjectival forms, and antonyms and roots are also to be found, should be treated as grammar. There is no attempt to see how grammar can create or influence forms. There is no clear notion as to what is language and what is grammar. Grammar has made unwarranted encroachments on language. In spite of the much-talked of modern improvements, there is no attempt to move out of the old groove. The truth that correlated words can be learnt and retained in memory easily as occasions arise has not been recognised as one of the vital principles of language-study. This feature which is a natural and effective means of enlarging the child's vocabulary is neglected. Similarly, the transformation of sentences including direct and indirect is also looked upon as belonging to grammar and forms a special branch of study. Again, a knowledge of the different parts of speech may be gained practically from the language itself without the aid of a grammar-book. The children need not learn the defini-

especially the mothers. A courageous mother equipped with knowledge is a national asset. A wise teacher free from irrational fears—a rare person—can however make up for the harm already done. I do not mean to suggest that teachers should be tested for fearlessness, for besides the difficulty of devising tests, it would mean the closing down of almost all schools. With higher salaries, it ought to be possible to secure teachers—at least head-masters—with a sound knowledge of child psychology. A school teacher who understands the psychology of his own mind and that of his pupils is a more important and a more useful person than a university professor. He can clear away the weeds and give greater chances for growth. Further, knowledge is an enemy of fear. A fair attitude towards knowledge, therefore, allied with the principle of activity (to live one's knowledge) will do a great deal and go a good way. In school education it is the child's attitude towards knowledge and not the amount of learning acquired by him which is important. By explaining simply and honestly some of his doubts and fears, by respecting his intelligence, and by not piling enigmas and mysterious slogans on his head, it is possible to make a child realize that his other doubts and fears can be postponed to later life when they could be explained. For once this attitude is cultivated, the accumulation of knowledge is not a difficult task. The child's dynamic desire to know and learn is strong enough, but our present methods are inclined to kill it.

on a sharp curve and one who drives his racer on an empty Brookland at 10 miles an hour and gets a palpitation at the touch of the accelerator. The former is healthy in combining safety with venture and the latter weak in carrying safety to the extent of timidity. Fears when irrational are harmful and difficult to eradicate and are found to be the causes of many pathological cases. A child who is terror-stricken by darkness may, if his fear gets fixed in the realm of his 'unconscious', have his healthy curiosity dulled, his spirit of adventure killed and may feel an abnormal fear at the very thought of death and develop insomnia. Such cases are actually on record.

If we understand the origin of our fear, we have very good chances of conquering them. Most of our fears originate in the nursery. Parents and teachers find in the instrument of fear an easy way of making children behave. There is not much difference in the child's mind between the dream-life and reality. Fanciful and disciplinary fears mean to a child a grim reality, just as among primitive minds and primitive people ghosts have a reality. The child's imagination plays havoc with him, which we grown-ups do not sufficiently realize. Fear is very contagious besides. Parents' actions based on fear, of which they themselves may not be conscious, do not pass without producing some impression on the child's mind, which is so susceptible to emotional impressions. How many of our actions in adult life are guided by imaginary fears an honest mind will soon detect. But fear is so uncomplimentary a quality that few see it face to face. He who would the least detect fear in himself is the defiant gentleman who is always telling the world that he is not afraid.

'It is all very well to diagnose fear', some might say, "but what is the remedy?" In the diagnosis lies the cure. As the teacher can not probe into the haunt of family nursery, his task becomes difficult. The measure against the primary infection is the education of the parents,

Whether a dogma is right or wrong is out of consideration here. It is the attitude towards dogma, especially the militant and the aggressive one, that is important and also a symptom of its weakness. The defenders of the Edifice of Dogma are so absorbed in their attacks that they do not seem to observe the decaying masonry on their head and the amount of abnormal fear they are spreading in their own camps as well as in those of their adversary. A change in attitude would be welcome, but then the word 'dogma' will not have the sense in which I am using it.

An educator who in his pupils respects individuality and wishes to give facilities for its growth and honours the spirit of enquiry, and wants to avoid that mental apathy and that attitude of mind which accepts without understanding—the outcome when questioning is tabood—and desires to develop that freedom of the mind which makes a philosopher say 'a thought is friendly to another thought, even to a contrary thought,' will find it necessary to eliminate the spirit of dogma from his scheme of education. The atmosphere is charged with dogmas; schools at least should have a freer atmosphere.

The opinion of psychologists is divided on the question of fear as an inherited instinct. They agree, however, that most of our fears are acquired, and chiefly, in childhood. Acquired fears can be avoided. Educators who lay such stress on 'character' should not grudge fearlessness in their pupils.

Some fears may be rational and even useful, yet should not be encouraged beyond very narrow limits, for there is a danger of these fears developing into irrational ones. It is useful for a child to be afraid of a precipice lest he fall and break his neck, but the same fear deeply ingrained in childhood may develop in later life into fear of scenic railways and parachutes. Knowledge of danger and consequent caution are different from the feeling of fear. The difference is like that between the motorist who slows down

Force, intolerance and infallibility are some of the characteristics of dogmas. 'Believe or be damned' has been the dogmatists' favourite slogan. Believing in the infallibility of their dogmas, they have violently opposed every related innovation. Bruno was burnt and Galileo and Darwin were condemned. Persecution breeds fear and defiance. All fear—whether outside or inside school—is bad; and defiance on an extensive scale speaks in terms of a French Revolution—a poisonous antidote to another poison. Besides producing these emotioned reactions and mental conflicts, dogmas cripple the mind. Imagine the effect on the mind of a child, who, on opening his eyes on the world and getting over his first stage of bewilderment, finds his earnest enquiry and the burning desire to know and to understand all that he sees on this ball of mud met with the thundering and threatening voice of a dogmatist saying 'I am the oracle, obey me, I need not explain.' The result would be crippling indeed. Three cases are likely to arise. Firstly, the child may suppress his ego, and accept the superego and develop into 'a good man' of the dogmatists. Secondly, he may become the victim of the conflict between his own self and that of the Parent Imago and the conflict, if intense, will make him the patient of a nerve specialist. Thirdly, his ego struggling for self-expression may drive out a good deal of that which is superimposed and make him a 'rebel' and get him labelled as an 'undesirable'. Voltaire was the product of a catholic school. The majority of people fall in the first category. Since suppressed desires can not be annihilated, they will find an outlet in unhealthy and crude ways. Devils hide even in the hearts of saints. Thus dogmatists themselves may be found doing things contrary to the very spirit of their dogmas, without being aware of it. The 'rebel', on the other hand, becomes a co-ordinating centre for all those whose inner voice was not heard and whose greivances of the mind were not allowed utterance. He would go further than is perhaps advisable, but that is inevitable under the circumstances.

movements. The reformer that does not tolerate it carries in him the germs of a petty dictator. These remarks seem necessary when a layman wields his pen before professionals; and it is good that *The Hyderabad Teacher* provides scope for such an activity.

I will not attempt here to define 'Education'. Enough ink has flowed to drown that subject. I am tempted, however, to observe the difference between school and university education. The main purpose of the former is to 'educate' by providing facilities for the growth of the qualities of the mind; while the primary concern of the latter is to 'instruct' by offering to its pupils a volume of knowledge hanging on the pegs of theories, capable of being dragged down and replaced by new and useful ones, whenever found necessary. It would not be a waste of space, I hope, if I elucidate what I mean by the development of the qualities of the mind. A few illustrations would help to make my meaning clear. There are men who have a very good knowledge of science without possessing a scientific temper. There are people who know all that has been said from Confucius to Bergson, and yet are capable of twisting their philosophical knowledge to fit in with their nursery conceptions. These are cases of minds that are not fully developed and that are not free from emotional tangles. By this, I do not intend to convey that intellectual matters should have no emotional significance, for that can not be. What I do mean is that an educated person should be able to understand the emotions involved and not be a slave to them. This freedom of the mind, and its growth, an educator may achieve by giving individual attention to his pupils, but in dealing with education on a mass scale, it should be possible to go a long way by eliminating factors that do not produce the desired result. I will deal now with two factors only—those of dogma and fear—that seem to me worth eliminating from the scheme of education.

the children is also done by them under the guidance and supervision of the members of the permanent teaching staff.

The Experimental Schools. Reference has already been made to the Experimental schools which have been started in Germany in recent years. The most famous of these schools are those in Hamburg. The special features of these schools are democratic staff organisation, self-government of the scholars, living co-operation of the teachers and the pupils on the basis of equality and the establishment of intimate relations between the parents and the school. The aim is development of the personality of the child through self-education. I had no opportunity of visiting any Experimental school, but my impression is that some of the principles followed by them have already penetrated into other schools. For example, the director of a public elementary school enjoys no higher status than the other members of the staff. Nor is the close co-operation of parents and teachers peculiar to the Experimental schools, as Parents' Councils have become common all over Germany.

In my next article I shall deal with secondary education and the training of teachers in Germany.

Some Emotional Factors in Education: DOGMA & FEAR.

BY

BAKAR ALI MIRZA, B. A. (OXON.)

THE task of reformers is difficult. Some good natured-souls unable to battle with the forces of reaction take refuge in resignation, and others, the more active type, struggle through, limping, and feel wronged and bitter on finding themselves under the bombardment of criticism of their friends. Criticism, live and energetic, though sometimes unjust, is significant of the health of Reform

schools. Here I saw two interesting sights—a class doing nature drawing in the school garden and a group of children swimming in the large and beautiful swimming pool of the school. The mid-day meal and milk are served to the pupils at cost price, which works out at about Re. 1 per day. Special care is taken to reduce the strain caused by the school work; each period consists of only 35 minutes and no home work is set. The pupils are so fond of their school that many of them visit it during the holidays in order to play and look after the animals and plants.

Pre-School or Kindergarten Education.

As is well-known, Germany is the home of the Kindergarten. The kindergartens are generally attached to training institutions and are attended by children from 3 to 6 years of age. They serve both as centres for child-welfare work and for preparation for the elementary school. They are therefore a great boon to mothers who, being obliged to go out for work, can not look after their children during the day. I visited two kindergartens in Berlin. One of them was the famous Pestalozzi Froebel House, which was founded by a relative of Froebel in 1873. An attempt is made in this institution to create the family atmosphere by grouping together children of different ages. There are plants, domestic animals and birds in the school for the children to look after. The class-rooms are tastefully decorated with suitable pictures and little things made by the children. There is no lack of apparatus for developing and training the senses of the pupils. Great stress is laid on teaching the pupils self-help and co-operation. It is delightful to watch them serving at dinner. They are frequently bathed, and examined medically once a week.

The Pestalozzi-Froebel House is also an important centre for training kindergarten mistresses. The apparatus used in the kindergarten is made chiefly by the students under training. The main work of teaching and looking after

once a fortnight. The school doctor is also a psychological expert, and he performs his duties in close co-operation with both the teachers and parents. A record of each child is maintained in the school, giving his family history and showing what his condition was when he entered the school and what progress he has made since then. In the form prescribed by the education authorities there are columns for the remarks of the doctor, the class teacher and the headmaster respectively.

Another very interesting elementary school which I saw in Berlin was the Waldschule (Forest School), Charlottenburg. This is intended for children who have weak nerves or are otherwise sickly. Such children are selected by the headmasters of elementary schools in consultation with the medical officer and sent to the Waldschule for the summer term to enable them to recoup their health without any interruption in their studies. The principles on which the school is conducted are co-education, open-air instruction and play. There is also a boarding house attached with accommodation for 50 boarders. The surroundings of the school are indeed very pretty. It has a large compound full of shady trees, beneath which the teaching work is generally done. The school building consists of bright and airy sheds, which are resorted to when the weather does not permit of open-air instruction. Every effort is made to improve the physique and health of the children while they are at the Waldschule, the means employed to attain this end being swimming, air-baths, sun-baths, special exercises for lungs and frequent medical inspections. After going round the school with the Director, I was not surprised when he informed me that there was nothing which the children detested more than the idea of having to leave the school at the end of the term.

Adjoining this school is another Waldschule which is attended by neurotic boys and girls drawn from secondary

product of each plot is shared by the boys and the teacher concerned. There is also a common plot for which all the pupils work and the product of which is sold to them. Besides gardening, the subjects of instruction are natural history, elementary science, arithmetic, mensuration and geography. The lessons in each subject are given in as practical a manner as possible, with due regard to the bearing of each on gardening. Arrangements have also been made in the school for teaching boys gymnastics and manual training and girls house-hold work. I have seldom seen a more cheerful set of pupils than the boys and girls whom I watched working on their respective plots in this school. The Gartenarbeitsschule keeps them physically fit, gives them intimate knowledge of nature, develops their creative powers and organising capacity and promotes among them the scientific spirit and the spirit of co-operation.

Education of Defective Children. There are few countries in the world where greater attention is paid to the education of mentally and physically defective children than in Germany. In many elementary schools special preparatory classes are provided for sub-normal children, for children who are normally gifted but whose progress has been arrested by illness or other temporary causes, and for children suffering from defective speech. There are also special auxiliary schools (Hilfsschulen) for feeble-minded children. In a Hilfsschule which I visited in Berlin I noticed that it was better equipped with teaching apparatus than the elementary schools for normal children. The children of the Infant Class, some of whom were over 7 years old, were being taught arithmetic with the aid of games. Much emphasis is laid on manual activities. In the upper classes the boys are taught carpentry, gardening and the use of the telephone, while the girls receive training in cooking and house-keeping, the aim being to prepare the pupils for admission into a vocational school after the completion of the Primary course. The children are examined medically

excursions have also proved a powerful aid in Germany in instruction in German History and Geography.

An interesting experience which I had during my visit to an elementary school in Berlin shows how the German teacher endeavours to seize every opportunity for putting into practice the principle of activity and bringing the school work into as close a relation with actual life as possible. The pupils of the 3rd school year class in this school were engaged in drawing a plan of the class-room. When I entered the room, the teacher desired them to mark in their respective plans the exact spot where I stood, which they did with remarkable accuracy.

From the point of view of the principle of activity, the best school which I saw in Germany was the Gartenarbeitsschule (Garden Activity School) at Wilmersdorf, Berlin. This school was founded in 1920 with the object of bringing the children of the upper classes in elementary schools into intimate contact with Nature through active occupation with land and animals. Within the school compound, which covers an area of 28,800 square metres, are provided fields for growing vegetables and fruits, a play-ground, a science laboratory, sheds for cattle, a poultry yard, an aquarium, a terrarium, a kitchen for teaching the girls cooking and a workshop where a good deal of the apparatus used in the school is made by the boys. The school work is done chiefly in the open air. All the elementary schools situated within a radius of 5 miles are required to send to the Wilmersdorf Gartenarbeitsschule boys and girls studying in the 6th, 7th and 8th classes. These schools are divided into groups, and the pupils in each group attend in company with the science teachers of their respective schools two or three times a week on the days fixed for them by the Director of the Gartenarbeitsschule. The average daily attendance is 250, while over 1000 pupils belonging to 11 different Volksschulen are on the rolls. Each class consists of 30 pupils and is allotted 300 square metres of land. The

tinct for play and movement is always kept in view. I am reminded, in this connection, of quite an amusing scene which I saw enacted in the first school year class of an elementary school in Berlin. Before teaching the pupils to read and write *schule* (school), the teacher tried to impress on the class the sound of this word by asking two of the children to pretend to be a railway engine, which they did by uttering "shu", "shu" as they ran along the open space in the room moving a stick rythmically up and down.

The Principle of Activity. Another important principle which teachers in the German elementary schools have to observe is the Principle of Activity. According to this principle, whatever children are taught must be experienced by them personally and acquired by them through personal activity. Hence the importance that is attached in the elementary schools to drawing, manual instruction, gardening, excursions, and in the case of girls, to needlework and domestic arts. There are workshops in many elementary schools for boys who continue there after the 4th school year. In the workshop of a Volksschule which I saw in Charlottenburg, Berlin, I was much struck by the skill which the boys had acquired in carpentry, smithy, book-binding and other forms of manual work. The teacher was the author of a book on manual training, a copy of which I bought at his request.

Educational excursions play a very important part in the German schools. The hours of instruction are 8 a. m. to 1 p. m., so that the afternoons remain free and are devoted either to out-door games or excursions. These excursions give the children new experiences, add to their knowledge of the environment, develop their power of observation and, above all, help to harmonise school instruction with real life. The essays set in German in the upper classes of the elementary schools are often based on the excursions in which the pupils have taken part. School

for 4 years, a child has to decide whether he will continue there or go to a middle or high school. But the matter is not left entirely to his choice. The case of each boy desiring to join a secondary school is considered by a committee composed of two teachers from the Volksschule (elementary school) where he has studied and two from the secondary school to which he seeks admission. Promising students who cannot afford to receive secondary education are awarded scholarships to enable them to do so.

Curriculum. The subjects of instruction in the elementary schools are German, Arithmetic and the Elements of Geometry, Elementary Science, German History, Geography, Civics, Drawing, Singing, Gymnastics and Mannual Training. Instead of the last two-named subjects, girls are taught needlework, and where arrangements can be made, cooking and housekeeping. Provision is made in all schools for religious instruction, but a teacher is not compelled to give such instruction, and the parents decide whether the child is to receive it.

The aim of elementary education in Germany is to promote the gradual development of the powers of the child and to give him systematic physical and mental training, leading to moral activity and due recognition of duty in the interests of society. The efforts of the elementary school during the first four school years are directed towards giving the child information about the environment, with practice in reading, writing, arithmetic, singing, drawing and manual work. These subjects are not treated separately, but are closely co-ordinated. For example, drawing and modelling are taught not only with a view to affording the child an opportunity of expression and to training his eye and hand, but also to giving him a concrete idea of spatial relations. The lessons on German are likewise taken advantage of for giving the pupils knowledge of the things around them and for developing their power of observation. The child's ins-

and private schools which formerly used to prepare the children of the upper and middle classes for admission into high and middle schools have ceased to exist. The Common School Law has therefore not only given greater uniformity to elementary education in Germany but has also democratised it. Another important effect which it has produced is that the total length of schooling has been increased from 12 to 13 years. The course in a Gymnasium or High School extends over 9 years, and, whereas formerly a pupil could obtain admission into a Gymnasium after 3 years of preliminary preparation, now he can not join such an institution unless he has spent 4 years in the *Grundschule* or common elementary school. An exception is, however, made in favour of specially gifted children who, on the recommendation of their teachers and with the approval of the Inspector, may be admitted to a middle or high school after three years of attendance in the *Grundschule*.[1]

The vast majority of the schools in Germany are state schools. The salaries of teachers are paid by the state, while school equipment and buildings are provided by the municipalities and local boards. Private schools are rare. Such private schools as exist are, as a rule, either Kindergartens or Experimental schools. In order to facilitate new experiments in the field of education, the latter type of schools have been given full freedom to follow their own curricula and time schedules.

No fees are charged in the German elementary schools. Children of poor parents also get school materials free. Fresh milk is always available in the German schools, and during the intervals, which are more frequent than in India, it is supplied free to poor students and at less than the market price to others.

Education is compulsory for both boys and girls from 6 to 14 years of age. After attending the Common School

1. The *Grundschule* is not a special type of school; it is a part of the *Volksschule* or elementary school and includes the first four years of the course which are common to all children.

system. The whole aim of education underwent a fundamental change. The Weimar Constitution (1919) laid down that "in every school the educational aims must be moral training, public spirit, personal and vocational fitness and, above all, the cultivation of German national character and of the spirit of international reconciliation." This law has had important results. In the first place, it has given the schools a much larger measure of freedom as regards internal organisation and disciplinary rules than they ever enjoyed before. Each State, no doubt, still prescribes the courses of study, but they are much more elastic than before, and in framing them the authorities concerned pay due regard to the personality of the teacher. Secondly, education is no longer conducted solely, or even mainly, for the ends of the State; the development of the personality of the child and of his individual capacities is considered to be equally important. Thirdly, while German culture is still emphasised in all the schools, the spirit of exclusive nationalism, which was their outstanding characteristic before the War, is no longer encouraged. How far in practice "the spirit of international reconciliation" has been actually introduced into the German schools is a different question. There is, however, no doubt that the attention which is now paid to the study of foreign languages in the German secondary schools coupled with the efforts which are being made to teach the pupils to understand and appreciate foreign culture will go a long way to help in the promotion of this spirit.

Primary Education.

The changes brought about in the realm of education by the Revolution are more marked in the primary than in the secondary stage. The most important of these changes is the Common School Law of 1920, which provides that throughout Germany all children during their first four school years, *i. e.* from 6 to 10 years of age, shall attend the same class of public elementary schools. As a result of this regulation, preparatory classes

The German School System

I.

BY

S. ALI AKBAR, M. A. (CANTAB)

Divisional Inspector of Schools, Hyderabad Deccan.

CONSIDERING that I went to Germany without knowing any German and spent hardly three weeks there, it would seem presumptuous on my part to attempt to describe the system of education in that country. Nevertheless, thanks to the assistance which I received from the Prussian Ministry of Education and the information which was generously given me by the heads of the various institutions which I visited in Berlin and Weimar, I was able within my short stay in Germany in August 1927 to obtain a rough idea of the main features of the German school system. I venture to hope that these impressions may not be found to be without some interest to teachers in India. I saw more than a dozen schools, in nearly all of which English was understood. The directors of these schools received me with the utmost courtesy and showed great patience and kindness in answering my enquiries. Some of them presented me with picture post-cards illustrating the buildings and activities of their schools, souvenirs to which I attach great value.

Prior to the Great European War, one always heard of the rigidity of the German system of education. The aim of education in those days was to train loyal subjects, and consequently the greatest stress was laid on uniformity, discipline, obedience and submission to authority. The Revolution of 1918, which swept away the monarchical system, was bound to affect an institution which had been used for ages as a convenient and an effective tool of that

3. The head-master could by giving the same paper to a succession of classes determine:
   (*a*) Whether each student is in the class that he is fitted for.
   (*b*) Whether a student is fit for promotion.
   (*c*) The ability of various teachers, by examining the progress made by their classes during the year.
   (*d*) The standing of his school in each class and subject, as compared to the Government standard or, to other schools that have used the same test.

It is not possible in this paper to go into details. Those who wish further detail can consult "How to Measure in Education" by W. A. McCall, Houghton Mifflin Co. or any of a number of books on the subject, or may obtain from the publishing companies in America samples of the many tests that are published on all subjects. It is only proposed to show here that if accurate scales for the measurement of the educational product are placed in the hands of the teacher, it would be possible for him, by comparing the results of his own class with the government standards, to be his own inspector to a great extent, and take pride, not merely in the showing his class makes before the Inspector, or in the public examination, but in the daily development which both he and his class can see and measure, and in the graphs and charts which show unmistakably that the progress of his class has been above the standard. For, teaching is, after all, not a trade but a profession, dependent in its effectiveness, not upon organization or supervision, but upon the professional zeal of its individual members. The aim of the teacher will always be the limit of education, and only as that aim becomes more distinct and more worthy can it be said that any real progress has been made in that greatest of all professions, the making of the world of tomorrow.

A knowledge of five words is necessary for each question, for which one mark may be given. Since there are 85 questions it will be seen that 425 words are involved in the measure. It will be seen that a composite score made from these three tests will give a very reliable measure of the reading comprehension of one person as compared to another.

Such objectively accurate measures of the products of teaching, if utilized by the Government in public examinations, would eliminate entirely the possibility of irregular marking by examiners, and would provide a more thorough measure of the ability of the candidate. But, as has been pointed out, the public examination is only indirectly a factor in education. The true place of the educational measure is in the hands of the teacher and the head-master, to be used in the class-room. If such tests are prepared by the Government, with standards of achievement indicated for each class, and are made available to the schools, each teacher would be able to determine privately the status of his own class, and each head-master the status of his own school. For example:

1. A teacher could learn accurately at the beginning of the year:

   (*a*) The individual ability of each student in each subject.

   (*b*) The average ability of the class as compared to the Government standard.

   This would enable him to lay plans for bringing his class up to the standard by making special effort where necessary.

2. The teacher by giving equivalent but different tests at the end of the year could determine:

   (*a*) The exact progress made by each student and the class as a whole.

   (*b*) The fitness of each student for promotion.

   (*c*) The efficiency of himself as a teacher, and of various specific methods of teaching.

there are only two possible answers to each question, one mark is deducted for each wrong answer in order to nullify the effect of guessing.

Table 4 gives a few of the 29 paragraphs in a test of paragraph comprehension whose total possible score is 58. Only one word is possible in each space, so there can be no question as to whether an answer is right or wrong.

Table 4.

Write only one word in each space.

1. Lily has a little red hen. Every day the hen goes to her nest and lays an egg for Lily to eat. Then she makes a funny noise to tell Lily to come and get the ______

2. A cat can climb a tree, but a dog cannot. This is very lucky for Marie's cat. Every time John's big dog comes along the cat climbs a tree and the ______ cannot follow.

5. One day when Sarah was sweeping she found a pice on the floor under the bed. They could not find out whose pice it was, so Sarah's mother gave it to her. Now, every time Sarah ______ the floor she looks carefully under the bed for another ______

28. Fundamentally, education depends upon the capacity of a person to profit by past experiences. Past situations modify present and future adjustments. Education in its broadest sense means acquiring experiences that serve to ______ existing inherited or acquired tendencies of behaviour.

29. "Naive" and "unsophisticated" are frequently confused. The former suggests a type of behavior which is artless, spontaneous, and free from the restraints of custom. The latter implies fully as great lack of knowledge of social usage, and, in addition, conduct which is primitive and perchance inelegant. Thus, the ______ youth was the first to enter the car, and his ______ little sister warmly kissed him in the presence of the king. We may also say that a country boy is ______ with respect to city life and customs

Table 5 illustrates a method of measuring vocabulary.

Table 5.

In each sentence draw a line under the word that makes the sentence true.

1. March is the name of a day food month week year.
2. A fat person is always bad blue cold heavy little.
5. Cotton is cool dark heavy soft sweet.
11. The ocean is fire land paper water wood.
15. Olives are to burn drink eat ride wear.
64. A bulwark is a hospital hotel protection punishment purchase.
85. A reprobate is one who is very cowardly ugly wealthy wicked youthful.

will add to, rather than detract from, the effectiveness of education as a whole.

Although the method will vary with different subjects, it should be the purpose of the teacher to measure as far as possible every product of teaching. Reading, whether in English or the vernacular, underlying, as it does, every other subject in the curriculum, is one of the very corner stones of education, but it is seldom examined and never accurately. The measurement of reading, like that of arithmetic, is based on the measurement of its component factors. The first of these is the mere recognition of words. This can be gauged by timing the speed of silent reading in words per minute. The second is oral reading without regard to comprehension of meaning. This can also be measured by timing oral reading as words per minute with deductions for errors in pronunciation. Each of these gives a numerical index of ability. It is not necessary to remark that the paragraph should be new to the student, and, that the same paragraph should be given to all pupils to be compared. In addition to reading speed, it is necessary to measure reading comprehension, whether for oral or silent reading. In examining this the literature and grammar of the selection are ignored and only the meaning of the selection is considered. Table 3. gives examples from a test in sentence comprehension.

Table 3.

Read each question and draw a line under the right answer.

1.	Is milk white?	Yes No
2.	Do we sleep in beds?	Yes No
3.	Is the day as dark as night?	Yes No
4.	Is green a colour?	Yes No
29.	Might a person suffer from confusion during an examination?	Yes No
77.	Is one necessarily inhospitable who dislikes an obnoxious guest?	Yes No
80.	Might a hysterical person given to rashness be intolerable?	Yes No

There are 80 such sentences in the complete test and they are arranged in order of increasing difficulty. Since

23. If the merchant's scales read one ounce too much on each weighing, how much is a customer overcharged on a pound of sweets at Rs. 2/- a pound? ... ... Answer ________

24. At Rs. 2/- a maund for potatoes and Rs. 30/- a waggon for goods, how much will a 400 maund waggon load of potatoes cost? ... Answer ________

25. Tom has just 4 weeks' vacation and wishes to spend it in a city which it takes two days to reach by train. How many days can he spend in the city? ... Answer ________

39. It costs Rs. 2-11-0 to send a 10-pound parcel post package from Hyderabad to Bombay. What will it cost to send an 8-pound package if the cost is 3 annas more on the first pound than on additional pounds? ... Answer ________

40. If the hour hand of a clock is 3 inches long and the minute hand is 4 inches long, how far apart are the tips of the two hands at 9 a.m.? ... ... Answer ________

Only 20 minutes is allowed for all the problems and each correct answer is given one mark. It will be noted that problems are in order of difficulty, and although mechanically simple, require considerable thinking. If a succession of such tests is given to a large class, the number of marks obtained in each may differ, but the rank of a student will remain virtually the same in all, thus indicating that the marks obtained by the students are reliable measures of their ability.

It will be criticized that such mechanical measures may eventually reduce education to a training in dexterity rather than a development of personality. Every good thing has its misuses, but is not on that account bad. It is not proposed to replace the aims of education developed by philosophy by something simple that can be easily measured, but to develop tests which will, to some extent at least, help us to measure progress towards the determined goal. Certainly greater effectiveness in the measurement, and therefore in the teaching, of the more mechanical elements of education

tute an injustice in marking as they are arranged in such order that the student does the easiest ones first and proceeds until time is called. The number he has done correctly then constitutes an index of his ability. It is not expected that any of the candidates will complete the entire number, but by giving more than can be achieved it is intended to measure the full capacity of the brightest.

As problems requiring reasoning have been eliminated from the above paper in fundamentals, so also in measuring the ability to solve problems it is necessary to eliminate tedious mechanical processes. This is essential in order that the measure may be purely a gauge of ability to reason. A reduction of the time required to do each problem also permits a large number of problems to be done in a short time, thus increasing the reliability of the measure. In Table 2. selections are given from a test comprising 45 problems prepared by the authors of the above examples.

Table 2.

Find all the answers as quickly as you can.
Write the answers on the lines.
Use the blank sheets of paper to figure on.

1. How many are 3 eggs and 2 eggs? Answer________
2. Mary is 7 years old. How old will she be in 3 years? ... ... Answer________
3 A hen had 9 chicks and 3 of them died. How many were left? ... Answer________
4. Milk costs 6 annas a seer and the milkman is going to raise the price 2 annas. What will it then cost? ... .. Answer________
5. If you buy a pencil for 4 annas and pay for it with an 8 anna piece, how much change should you get? ... ... Answer________
6. How many 2 anna bits are there in a rupee? ... Answer________
7 How many eggs are there in 7 nests if each nest has 3 eggs? ... ... Answer________
22. Henry was marked 87 in geography the first month, 91 the second, and 93 the third month. What was his average mark? ... Answer________

Table 1.

Get the answers to these examples as quickly as you can without making mista
Look carefully at each example to see what you are to do.

(1)
$3 + 2 =$

(3)
Add
2
5

(7)
Subtract
4
2

(9)
$2 \times 3 =$

(10)
Add
16
53
32

(12)
Subtract
96
25

(15)
Multiply
26
2

(17)
Divide
2) 6

(19)
Add
684876542
791654220
587339364

(28)
Multiply
4 6 7 9
6 8

(29)
$\frac{1}{7} \times 2 =$

(33)
Multiply
$697\frac{1}{2}$
18

(37)
$\frac{1}{2} + \frac{3}{4} + \frac{1}{8} + \frac{2}{3} + \frac{7}{8} =$

(43)
Subtract
8 yd. 1 ft. 3 i
6 yd. 3 ft. 9 i

(46)
Multiply
4 gals. 3 qts. 1 pt.
4

There are 47 examples in this test, (though twice number would be better) covering all the fundamental p cesses with simple numbers, fractions and decimals, because the examples are short the entire test is giver only 20 minutes. Printing the questions in the form gi eliminates all writing by the student who may give his wh time to obtaining the answers. Each correct answe given one mark. There can be no variation in marking e by the most inexperienced. The fact that some questi are several times more difficult than others does not con

hand-writing, composition or arithmetic. In any case, it is of first importance that the purpose of the examination be simple and specific rather than complex and general; for, even if a general examination is required, the whole is merely the sum of all its parts.

The second requirement for a reliable measure is that it comprise not a random selection from the subject matter, but a thorough and comprehensive section of the educational goal to be accomplished. The third requirement is the elimination of all factors that it is not especially desired to measure in order that they may not influence the result, as, for example, hand-writing and composition influence the marks obtained in a history examination. Fourthly, it is important that the test be made objective and rigid, and not elastic in the hands of the examiner.

Thus it will be noted first that ability in arithmetic is composed of two factors which are in reality two distinct subjects. The first of these, facility in the fundamental processes such as addition, subtraction, multiplication and division, is purely elementary and mechanical but pervades all processes in arithmetic. The second factor, the ability to understand and solve problems, is as different from the first as chemistry from athletics. Examining arithmetical ability, then, requires the measuring of these two factors as distinct dimensions whose sum is the whole.

Having decided the specific object to be measured, it is necessary that the field be thoroughly covered by the test. The law of probability does not hold true except where there are a large number of cases considered; therefore, to take an examination out of the category of a "lucky dip", it is important that it should contain a large number of questions representing the major portion of the information to be measured. Examples are given in Table 1 below of a test in the fundamentals of arithmetic, prepared by Kelley, Ruch, and Terman.

recourse but to be born again. Examination should go hand in hand with the process of learning just as measurement goes with construction in any other process, and, certainly the *measure* should be as scientific as is the *method* of teaching. Much of the pains taken by conscientious teachers on carefully prepared lessons are often wasted by their failure to use accurate means of measuring results.

The unreliable examination itself is one of the commonest causes of failure. A student who ought to fail is promoted because his parents have persuaded the head-master with assurances of "a special tutor", and the unlucky child, thrown bewildered into a class where he can neither learn nor understand, is dubbed stupid, ignored by the teacher, and taught to hate his books, himself, and the hard world in general that denies him the pleasure of success. "I don't like history" or "I can't do mathematics", are symptoms of this condition. On the other hand, the bright but lazy boy, who is being promoted too slowly, notices that he can "get along" without any effort, and, finding no pleasure in competition with dullards, gets into mischief and becomes an incorrigible loafer to the end of his school days. Simply because of faulty examination in earlier classes. How many of these mistakes correct themselves in later years we can only guess, but the chances are against it, for the teacher, who, as Franzen puts it, "Must mystify the lower quarter and bore the upper quarter of his class" can scarcely give his best attention to any section of the heterogeneous group.

In order to produce a reliable measure it is first necessary to decide exactly what it is required to test. If it is proposed to gauge the natural cleverness of a child, without reference to whether or not he has ever received formal instruction in school, this may be done by a type of examination known as the "intelligence test ". With this we are somewhat familiar and it is not proposed to consider it here. On the other hand, it may be the purpose to test definite knowledge or ability acquired in school, whether in reading,

teach us much about our examination methods. A superintendent selected from an examination in arithmetic a typical answer paper of one of the students. He had copies made of this and giving one to each of a hundred experienced teachers asked them to mark it. With the passing marks set at 75%, four teachers gave the paper 100% while one gave it 10%. According to half the teachers the student failed, while the other half passed him. This result seems quite incredible, but the experiment may be easily repeated by anyone wishing to verify it. Twice later, after intervals of weeks, fresh copies of the same paper were given unexpectedly to the same group of teachers, who had by this time forgotten their previous judgment. Out of the one hundred teachers only one was found to have given the same mark all three times. With such results for an arithmetic paper, what might we expect in geography, hand-writing or composition?

Yet such a condition must obtain so long as the examiner's mark is a vague comparison in his own mind between the paper before him and his ideal of perfection. For not only do standards of perfection differ in different persons, but also in the same person at different times. And after all, what mortal, if put to it, could say exactly what in his judgment constitutes perfection in anything. If, however, an absolute mark is impossible, it is not too much to expect that an examination shall give an accurate and reliable comparison between one student and another.

The common function of the examination is the serious one of testing for promotion, but the most careful of such tests we make only at the end of the school course when, if the student is a failure, it is too late to do anything about it educationally. We reward the candidate who is a success, but behead the failure despite the fact that it is probably the fault of the system that he failed. A physician who followed his examination by either a diploma or a decapitation would get scant practice, yet for the failed matric there is no

and capable, he who admittedly knows his subject most thoroughly and his pupil most intimately, must need to be corrected by the public examination in the promotion of his pupils. No one will deny that the necessity remains, but the responsibility for the situation must be laid with the teacher where it belongs. That the public examination need not be a permanent institution is suggested in a paper by Mr. W. W. McKechnie printed in the September number of the *Hyderabad Teacher*, in which he says, "I am optimistic enough to believe that examinations of the school externally and on the present lines will sooner or later prove to be unnecessary."

Public examinations will prove to be unnecessary, however, only when a *better* way is found of measuring the product of education. Measurement in education can no more be discarded than measurement in any other science, if it is to prove worthy of the age in which we live. To quote from W. A. McCall, "Consider where science would be without its metre, gram, ampere, volt, ohm, watt, henry, and the like. More than anything else it has been the absence of exact measurement which has kept education from the rank of a science." When a new student enters the class the teacher soon *estimates* his ability, *guesses* his previous training, *judges* his progress, and finally *determines* his fitness for promotion. All these and many more are in reality measurements roughly made on the basis of past experience, but seldom done with the precision that one would expect one's carpenter to use in the making of a bench. We hesitate to apply the term "measurement" to education, yet it was nearly a century ago that Frances Galton wrote. "That which exists in any quantity exists in a quantity that can be measured."

Educational measurements to-day are crude and unscientific, if in fact they can be called measurements at all. A mode of measurement is reliable only when repeated measures give identical results. A simple illustration will

Mrs. S. R. Das, wife of the Honourable the Law Member, very kindly arranged for an excursion and tea for all the delegates at the Kutub Minar, whence we visited Humayun's tomb. Mrs. S. R. Das was indefatigable in her efforts to please her guests, and much of the success of the arrangements outside the Hostels was due to her exertions.

The final touch of colour was given by a garden party to the delegates at Viceregal Lodge by H. E. Lady Irwin where she graciously mixed with her guests and referred to the resolutions that had specially appealed to her.

The next day saw us leave Delhi, carrying with us the wonderful experiences of those four days into which years seemed to have been crowded. Surely the memory of that time cannot but inspire us to achieve all that is highest and best in the development of India's sons and daughters, and so to usher in the dawn of a newer and a greater India.

The Examination as Measurement.

BY

GEORGE GARDEN, M. A.,

Principal, Methodist Boys' High School, Hyderabad-Deccan.

MARK Twain, the beloved American humorist, once said, "Everyone is always talking about the weather but no one ever does anything about it." Both as a popular topic of conversation, and as a never-failing objective for invective, the public examination, like the weather, will always provide sport so long as the blame can be conveniently placed on the other person. So long as our educational practice remains what it is, it seems necessary that the examination system must remain also.

But public examinations after all are only necessary to correct the faulty judgment of the teacher regarding those who may be eligible for promotion or certificate. It seems strange indeed that, taken for granted the teacher is honest

speech on educational reform to which all listened intently. After her, came that gifted speaker, Mrs. Sarojini Naidu who, in a speech that excelled even herself, carried her audience breathlessly along to the close of the conference, which terminated with votes of thanks to all those who had helped to make it such a brilliant success.

Strenuously though we worked during this period, opportunities were created for lending still brighter colour to this record Conference by visits which were both interesting and instructive.

Pre-eminent among these stands our visit to the Legislative Assembly in which, by the irony of fate, we had to sit powerless while listening to Sir Hari Singh Gour's appeal for the raising of the marriage age. Not one of us but longed to add her voice to his and pray that this curse may be removed from India, but since this was denied us in the Assembly, we resolved to draft our own petition and present it ourselves to H. E. the Viceroy. No sooner resolved than acted upon, and within 24 hours, a memorial signed by all the delegates was taken by the members of the Standing Committee to His Excellency and read in her clear firm voice by the charming Rani of Mandi.

The second dash of additional colour was afforded by Miss Onsholdt, who gave an excellent demonstration one evening after dinner at the Hindu Hostel on breathing exercises and exercises on the relaxation of the muscles. Though Miss Onsholdt carried on these exercises for over an hour, she appeared fitter and fresher after them than when she began her demonstration. We were much interested to know that her oldest pupil is 77 years of age, and when I tried to secure her services for Hyderabad, it was with the keenest disappointment that I learned of her current engagement in Bengal until April 1929, at the expiry of which she intended leaving for her home in Denmark.

the women of India to bestir themselves, and to see that education on correct lines was begun by the mother in the home. On this occasion, special arrangements were made for visitors, including men who were interested in the cause of education, and nearly 1000 availed themselves of the opportunity, among them being Sir John Simon and Lord Burnham. After the ceremony, Lady Irwin and the delegates were entertained by the Municipality in the Municipal Hall, which was gaily decorated for the purpose, and under such happy circumstances was the work of the Conference begun in right earnest the following day.

H. H. the Begum of Bhopal presided and was assisted by Mrs. Sarojini Naidu, and important resolutions bearing on the advancement of education were proposed, discussed and resolved on. Two sessions were held daily, and at each session, the hall was packed with delegates and interested visitors who, for hours together, were spellbound by the subject on hand, as evidenced by the rapt silence of those not taking part in the discussions. Among the resolutions discussed were the raising of the marriage age, compulsory primary education, medical inspection of schools, facilities for the training of teachers and a host of others too numerous to mention.

The 3rd session was informally attended by Lady Irwin at her own request, and this occasion was marked by the opening of the Conference Fund for Women's Education. So great was the enthusiasm for the cause that on the spot nearly Rs. 30,000 was collected, ranging from Rs. 5000 subscribed by H. H. the Begum of Bhopal to Rs. 100. Mrs. Rustomji Faridoonji was appointed Secretary of this Fund, and to those who have had the privilege of working with her and of realising her ability, the wisdom of this appointment is manifest.

The closing session of the Conference was attended by Dr. Annie Besant, who followed the Begum of Bhopal in a

The Second All-India Women's Conference for Educational Reform

BY

MRS. M. ENGLER, M. A., L. T.,

Chief Inspectress of Girls' Schools, H. E. H. the Nizam's Dominions.

THIS Conference was held at Delhi from the 7th to the 10th February inclusive, and was attended by nearly 200 delegates from all parts of India. Picture to yourself crowds of them alighting from different trains at the Old Delhi Station, being welcomed by members of the Reception Committee and driven by them to their various destinations.

There were 3 hostels run for their accommodation and creature comforts on Western, Muhammedan and Hindu lines respectively, all within easy reach of the meeting place, and for a few, arrangements were made with British officials in the Indian Civil Service, residing at Raicina or New Delhi. All Delhi rose nobly to the occasion, and overwhelmed the delegates with kind hospitality, time after time.

Work there was, and very strenuous work that kept us engaged from early morn till dewy eve. We from Raicina had to leave home at 8-40 a. m. and did not get back till 7 p. m. We had about an hour's break for lunch, and this we partook of at the Hindu Hostel, which was the nearest to the meeting hall. It was my good fortune to act twice on the Standing Committee in the place of Mrs. Rustomji Faridoonji, when I did not get home till about 11 p. m., but so glorious was the weather, and so great our zeal that we scarcely felt the long hours at the meeting.

The Conference was opened by H. E. Lady Irwin who gave a most befitting speech for the occasion, calling upon

some special trade or occupation which they could enter by the route of the regular vocational schools.

I shall not refer to the university grade of technical education following on university general courses, as that is outside the scope of the subject entrusted to me.

To sum up, my proposals are

(1) The cultural and vocational aims in education should not be opposed to each other but should be complementary.

(2) The courses in all grades of general schools should not merely be preparatory to higher general courses and to the university, but should be suited also for those who have no aptitude for higher literary courses and who therefore should be diverted to technical and vocational courses.

(3) The courses of study in general schools should therefore be remodelled so as to include vocational subjects preparing for life activities.

(4) The vocational instruction in general schools should be designed to give a vocational bias and not to give definite vocational skill, which should be given in technical and vocational schools.

(5) The system of technical instruction should be closely co-ordinated with the several stages of general education.

---

work, Weaving and Smithy in the case of boys and knitting and embroidery in the case of girls. The time devoted to vocational instruction in these primary schools is from 4 to 6 hours in the week. The secondary grade of technical education will train students for such industries or industrial processes as require in the worker some intelligent appreciation of the scientific forces or agencies that are manipulated therein. This should be preceeded by the secondary grade of general education which on its *real* or applied science side should provide a good grounding in the elements of the basic physical and natural sciences and in elementary mathematics. In the last two years of this course there should again be some optional vocational subjects provided. The vocation at this stage will not be of the mere handicraft grade as would be the case in the highest classes of primary schools. They should imply some elements of liberal education for their intelligent practice, or some elements of scientific knowledge for their skilled exercise. Under this head we have in Mysore introduced in some of our high schools subjects such as Electric Wiring, Joinery or Fitter's work, Printing, Mensuration, Survey and Draughtsmanship and Weaving, besides Shorthand, Typewriting and Commercial Accounts and Correspondence. It is proposed as funds become available to introduce some more subjects of the kind such as Agriculture, Pharmacy, Telegraphy, Motor Mechanics and so on.

The idea is "to give a training in practicality at every turn", as Carlyle put it. In the higher primary and high-school classes the pupils should be enabled to experiment in the various lines of practical activity. There should also be provision for successive selections, each narrowing somewhat the field of choice. First there should be the primary differentiation of those who would pursue the purely general course and those who would follow some technical or manual occupation. The secondary school particularly should lead the pupils to a point at which they could intelligently select

and natural bents, besides providing a general preparation for specialised technical courses the pupils might choose to take up later on, while the latter is narrow and utilitarian preparing for a definite vocation and reproducing the economic conditions of productive work. Further, the vocational training given in general schools should be correlated with elements of general or liberal education and constitute a real and valuable factor in liberal education.

At the same time the courses in technical and vocational schools should be liberalised to some extent by the inclusion of general subjects, assigning to them, however, a minor place in the scheme of studies.

Schools of general education and technical schools should be linked together so as to harmonise cultural and vocational aims. Corresponding to the three grades of general education—primary, secondary and university—there should be three grades of technical and vocational education. The primary grade of technical education should be for the training of the agriculturist, the handicrafts man and the factory operative. This will follow on general education of the primary grade comprising the three R's as well as the training of the hand and the eye, the senses and the observing and active powers. In India with its large rural population the work in these primary schools should from the beginning be closely adapted to the environment so as to make the pupils take an intelligent interest in it. In the rural areas, garden work should be the "core" of the school programme. In the last three years of the primary school (or as it is called in India, the middle school), when the pupils are from about 13 to 15 years old, there should be some form of vocational studies so as to give the pupils a vocational bias. This, I may be permitted to say, is what we are attempting to introduce in Mysore. In a number of schools we have recently introduced vocational subjects such as Agriculture, Sericulture, Carpentry, Lacquer work, Metal work, Leather

The addition of a vocational side to general schools is called for not only to provide equal opportunities for students of various capacities and aptitudes, but it is also necessary as a condition of success in any scheme of vocational and technical education. There is among the middle classes in India a disinclination for manual work. The average middle class boy is wanting in mechanical aptitude and inventiveness. Some sections are also lacking in commercial instinct and business interest. The problem is to create mechanical aptitude, industrial interest and business ability in those classes. This cannot be achieved merely by providing technical and vocational schools, unless we lay, in the earlier general school discipline, a solid foundation of hand and eye training and the cultivation of resourcefulness and individuality. If technical schools are to prove truly useful, the reform of the general school courses is necessary, so as to give a due place to sense training and manual training, to *real* studies side by side with literary studies, and at the terminal stage to some optional vocational courses for imparting a vocational bias and pre-vocational training to the large proportion of students whose means or capacities do not allow them to go up to the University and who are therefore obliged to join technical and vocational schools, or enter on industrial or other callings in life.

The fact should however be emphasised that there is a fundamental difference in aim, purpose, method and spirit between the vocational education to be given in general schools and that in technical and industrial schools. The former is pre-vocational, subordinated to general educational aims, aiming to give a broad appreciative insight and sympathetic contact with human vocations and to develop vocational intelligence; the latter aims to develop genuine vocational skill and capacity. The former gives a vocational bias to general education, affords opportunities to pupils to experiment with and thus to discover their aptitudes

accordingly been started in various parts of the country, and the demand for more schools of the kind is very pressing.

But the problem of education in a democratic society is not satisfactorily solved by the mere provision of a system of vocational schools alongside of general schools (although it would be a solution in a society based on class or caste distinctions). Equality of educational opportunity should be secured. This *equality* of opportunity does not, however, mean an *identity* of opportunity. The purely general or literary courses provided in the general schools do not suit all those who join the Elementary schools, and the Elementary and Secondary schools should not be looked upon, as they now are, merely as preparatory to the university in the case of each and every pupil. The great majority of the pupils in these schools have not the aptitude or interest for purely cultural courses. They get eliminated at various stages as unfit for further studies. It is some of these that join the vocational and technical schools, which they do with a feeling of inferiority and failure. The heavy elimination of pupils who do not possess the aptitude for higher literary courses at various stages involves a great human wastage and is a great social loss. This can only be avoided if the general schools, while providing the fundamentals of general culture for all, also afford equal opportunities to pupils of different capacities and aptitudes to realise the peculiar promise that lies in each of them. The school of general education should lay itself out to discover the pupil's individual bent and assist him in the choice of a career, and prepare him to some extent so as to ensure his subsequent success in it. The recognition of this principle would result in the broadening of the curricula of studies in general schools and the inclusion of some studies which prepare for life activities. From the discussion yesterday it appeared that this principle has been recognised and adopted to a large extent in England, and in some other countries also.

social economy. The cry everywhere is therefore for vocational, technical and industrial education, instead of, or in addition to, education for culture. The relation of cultural and vocational aims in primary and secondary education is therefore a live problem for those responsible for educational administration in Mysore and in most other parts of India.

There is of course a traditional opposition between the cultural and vocational aims in education. Historically the vocational aim, that is, education for practical efficiency, was the earlier and the idea of education for personal culture emerged later in the evolution of educational theory. But the feudal or class organisation of society in the West and the caste organisation in India, with its rigid divisions of inferior and superior classes, produced the opposition between these two aims, the latter class being supposed to have time and opportunity to develop themselves while the former are to produce and provide the necessaries of life. But in a democratic organisation of society, which I think, is the ideal for all parts of the Empire, such opposition does not and should not exist; an opportunity should be given to every one to develop his distinctive capacities and to complete and perfect his individual life, while at the same time a social return in the form of vocational skill and service should be demanded from all. The cultural and vocational aims are, in a true theory of education, not opposed to each other but complementary. In India, as in most countries, the cultural aim was the first to gain the recognition and support of the State and vocational needs were catered for by the home and the system of apprenticeship. But when, with the changed economic conditions the historic agencies proved inadequate to meet the vocational needs, systematic vocational education came to be looked upon as a social necessity and as much entitled to state support and control as the other form of education. A few vocational and technical schools have

The Relation of Cultural and Vocational Aims in Primary and Secondary Education.

BY

K. MATHAN, M. A.,

Director of Public Instruction, Mysore.

BEFORE introducing the subject of my paper, may I be permitted to say, on behalf of the delegates from the Indian States, how greatly we appreciate the courtesy extended to our States in inviting them for the first time to participate in an Imperial Education Conference? In area, population and importance, the Indian States form no negligible part of the Empire, and although their social, economic and educational problems are much the same as those presented in British India, the Indian States have interests and problems of their own and they have perhaps something to contribute from their experiences in educational activities that may be of value to a conference like this.

Coming to the subject entrusted to me, I must say that my remarks have reference mainly to conditions as they exist in the Mysore State which I represent and in those parts of India with which I have some acquaintance. In Mysore, the feeling is now very widespread that the kind of education imparted in the existing primary and secondary schools, which confine themselves almost entirely to purely literary courses has ceased to be useful in the case of the great majority of the children, and that it has resulted in creating a large body of young people who have not only no aptitude but have an actual distaste for agriculture and the various other industrial occupations so essential in the

* A paper read at the Imperial Education Conference, London, in June 1927.

The work marched: step by step,—a workman fit
Took each, not too fit,—to one task, one time,—
No leaping o'er the petty to the prime,
When just the substituting osier lithe
For brittle bulrush, sound wood for soft withe,
To farther loam-and-roughcast work a stage,—
Exacts an architect, exacts an age.

But the classical example of an attempt to heighten consciousness by deliberate word-manipulation and experiments with new phrases is surely Shakespeare's *Troilus and Cressida*, a play little read and of doubtful value as a contribution to the Homeric legend, but a most fascinating study in the development of English. Here are many words like *corresponsive*, *transportance*, *lunes*, *pheeze*, *plantage*, *injurous*, *propension*, *constringed* and *convive*, which have not been able to survive.

But what a wealth of creative power in wielding pure English and the higher language informed by French and Latin thought! And how at times he strikes the one tone that is to ring down the ages:

One touch of nature makes the whole world kin.

O heavens! what some men do,
While some men leave to do.

Speak frankly as the wind.

In the reproof of chance
Lies the true proof of men.

To question the need for new words is to confess blindness to the progress and processes of the age. The multitude of discoveries, made in all branches of knowledge can only partially and deceptively be represented by the words of times that were as dark ages to the present. Our novelists have done wonders by their ingenuity in word-combination and occasionally by the coinage of words. Some give their characters what a recent writer calls "that fascinating command of the wrong words in exactly the right places." It was this felicity of expression which enabled a Japanese student to write to me that his baby was creeping on all floors.

There are whole groups of writers in various countries who are conceiving themselves to be in line with modern research and determined to discover in new arrangements of syllables and new devices a diction expression that will reveal more of the unknown. They call themselves Futurists, but they already belong to the past.

"As for what we call Futurism, that cannot exist, for if it is at all vital it must become part of the tradition of posterity despite its momentary envelope, for tomorrow to-day is yesterday...............What is new to humanity is the belated consciousness of its increasing sensibility."

(John Rodker: Future of Futurism page 91).

And this is not such a new thing as it seems. The writings of Shakespeare, conditioned by a complex of things individual and international, must have seemed as strange and as exhilarating to his contemporaries as Browning and George Meredith to later generations. Hamlet, Sordillo, the poems of Gerald Hopkins and Lewis Carroll, are as truly futurist achievements as anything written during the last ten year, only much more so, and in finer ways. What could be a more fitting indication of increasing sensibility, contrasted say with Wordsworth and Tennyson, than these lines from Sordello?

"That is just what we can do in Finnish", he replied, "We retain the consonants and vary the vowels, and so get a great many shades of meaning".

That is but one way. Another is to do as Burns did and escape from the dreariness of conventionalized speech into natural talk, or as the government of Norway did a few years ago when they turned to the richness of expression preserved in the old dialects and brought old words and phrases forcibly back to invigorate the flabby form of Danish spoken in upper circles. Another way is that of O. Henry, to play with words till they seem to be playing with you:

"The tables were filled with Bohemia. The room was full of the fragrance of flowers—both mille and cauli. Questions and corks popped; laughter and silver rang; champagne flashed in the pail, wit flashed in the pan."

There is no reason why word-making should not be as absorbing as crossword puzzles. Phrase-making has long been a proclivity of English and French writers, and it has resulted in quite as important things as the novels of George Meredith and Henry James. The world of the unknown can never be more than fragmentarily named, but every successful new name may set us free on a fresh path. Anything may suggest it: the mere reversal of the letters of a familiar word may lead us behind the looking glass. One day Mr. Chesterton saw in a hotel the mysterious inscription MOOR EEFFOC on a door and of course it started him on one of his imaginative extravaganzas.

"That wild word Moor Eeffoc is the motto of all effective realism; it is the masterpiece of the good realistic principle—that the most fantastic thing of all is often the precise fact. And that elfish kind of realism Dickens adopted everywhere..................The date on the door danced over Mr. Grewgious's, the knocker grinned at Mr. Scrooge, the elderly armchair leered at Tom Smart—there were all moor eeffocish things. A man sees them because he does not look at them."

Educated people seem shy of words that have no history, no deep roots. But what a conquest of our imagination Dickens,—if that ever was his name for two days in succession—made with his exhilarating improvizations in personal names!

Winkle, Micawber, Skimpole, Gamp, Susan Nipper, Mr. Toots, Swiveller, Pecksniff, Scrooge and Stiggins,—only their multitude, poured forth without giving the world breathing time, prevailed their entering the English language in the form of nouns and verbs and adjectives, as Mackintosh, Boycott and Milesian have done.

It is simply astounding to reflect on the possibilities of new words in English. Once I wrote down all the monosyllables I know in the language of educated people. The number came to over six thousand. In Dr. Wright's *English Dialect Dictionary* I found another six thousand forms outside the normal speech. But even when these two lists are combined, a very large number of possible monosyllables have never been appropriated, and when we came to the permutations and combinations of words of more than one syllable, their number is legion:

Why do we not use such words as *flirk*, *fon*, *munce*, *threel*, *lale*, *nad*, *lench*, *breen*, *soan*, *quorch*, *gark*, *launt*, *sish* or *ronk!* Why not *bestock*, *mumple*, *winnock*, *pirent*, *yobal*, *darkable*, *trimity*, *manzaneous*, *vilation?*

Probably because man is a gregarious animal, as I was recently told, and resents individual precocity.

It is said that Milton used to spell certain words in different ways to express degrees of emphasis. I remember once telling a friend of mine, Prof. Ramstedt of Helsingfors, who was then Minister for Finland in Tokyo, how a student had written: *He grisped my hand farmly*,—and how that gave me a peculiarly different idea from the usual: *He grasped my hand firmly*, and I suggested the wide range of additions to English words by following up the suggestion.

points out that the main difficulty facing Spinoza—two and a half centuries ago—was this very inadequacy of the old words to suggest the same thing to different minds, we realise that it is the same dilemma by which we are confronted. How can we use such words as *substance, life, eternity, nature, soul*, or *God* so that others may know what we mean? How can we escape the paralysis of definition? Some of my students are suggesting a way out by spelling this last word *defination*, and they are perhaps more right than they think.

Lady Welby, is vigorously verbose on what she calls "an unanimous neglect to understand expression, its nature, conditions, range of form and function, unrealised potencies and full value or worth. She maintains that our usual speech and written words " betray us daily more disastrously, and atrophy both action and thought." It is perhaps not so terrible as all that, but certainly most journalese is an exhibition of how not to write, and the greater is the joy when we come upon a book like Henry Williamson's *The Old Stag*, in which things are seen as clearly and named as startlingly as in the best lines of Chaucer, of Richard Barnefield or the Voyages or Hakluyt.

In India, as all we teachers know, there is an almost mortal dread of leaving the beaten track of recorded expression. How often one is told, in connection with things and events in Hyderabad, what Shakespeare, Milton or Gray thought of quite different events and things in far-off England. There are some men who cannot find a group of Indian and English friends together without tearing a line of Kipling from its context. What a relief it is when a happy blunder of the bottle-scarred veteran type lights up the sombre folly of our seriousness, as when the lecturer realised that he was speaking of Thackens and Dickary, and quickly altered it to Thickens and Dackary, finally settling on Thickary and Dackens.

Not one of these words is to be found in the Concise Oxford Dictionary. And I certainly prefer the human touch in *chortle* and *benefantial*, made by lips the owners of which had their eyes focussed to infinity in other ways than that of science. Naming things is a natural gift which ought to be encouraged whenever found, for it is the main secret and charm of the poet, as is well shown in Max Eastman's stimulating book *The Enjoyment of Poetry*, a book you should encourage every library you frequent to buy.

One day I found a little Indian boy, only five, in such a creative mood. He had spoken English from the beginning, and very good English it had come to be. Rapidly I pointed to things about us, the commonest objects, and as rapidly he fired out the strangest medley of words I had ever heard, sheer invention, and so remarkable that I wrote down as many as I could. They might have been Hungarian or Basque, so far were they from any tongue spoken in South India. The words came out with all the verve of his little soul. But of course the spell of the inspiration came to an end,—as far as I can remember after the naming of a score of things.

In a thoughtful book written two decades ago Lady Violet Welby brought together the opinions of eminent scientists, speakers and writers, both English and French, on the questions of looseness of terminology and extension of vocabulary and phraseology. There Lord Rosebery speaks of our living in old cells, moving in old grooves, and continuing to use old catch words, "apparently unconscious that these are out of date and have lost their savour of meaning."

And Lord Haldane tells us how "language which is quite adequate in everyday life becomes altogether misleading when we get to the problem of what is the true nature of reality." We need not follow him further in that direction, which so often with philosophers ends in the Sahara of Epistemology; but when Sir Frederick Pollock

But unfortunately for his prophecy seven out of the eight he cites have survived: *speculations*, *operations*, *preliminaries*, *ambassadors*, *communications*, *circumvallations*, and *battalions*. Besides, some of these were not so new as Swift thought, being found in Shakespeare in special meanings.

It is characteristic of the better writers of Swift's time, and of his particular associates, that they strove to check exuberance, to clarify the language, to avoid vulgarity and rhodomontade and Rabelaisian unrestraint.

But we must not forget that at that time the speech of the people was struggling for a hearing; contemporary plays were full of it, and furthermore writers like Allan Ramsay were anticipating, in lines such as these, the triumphs of Burns.

> Then fling on coals and ripe the ribs,
> And beek the house baith but and ben;
> That mutchkin stoup it hads but dribs,
> Then lets get in the tappit hen.

When English education in India was directed by Scotchmen a translation of such verse was always extractable; but nowadays they serve to show the need of Dr. Joseph Wright's admirable *English Dialect Dictionary*, without which a great deal of Scott, Dickens, Hardy, and many others, is unintelligible.

Nowadays the more abundant kinds of new words are of quite a different sort. Their roots are in Latin and Greek, and they rarely suggest any meaning to a person of ordinary education. Here are a few of the many I came across last summer, while trying to discover whither our masters of science are leading us.

phloem	villous	indican
vacuole	ptyalin	skatol
thallous	tyrosin	erepsin
syncytial	ptoas	caproic

He left it dead, and with its head
He went galumphing back.

And hast though slain the Jabberwock?
Come to my arms, my beamish boy!
O prabjous day! Callooh! Callay!
He chortled in his joy.

'Twas brillig, and the slithy toves
Did gyre and gimble in the wabe;
All mimsy were the borogoves,
And the mome raths outgrabe.

It was no small achievement to set the heart beating faster by using two dozen selfmade words in sixteen lines.

Many people feel in a vague way that our language has been as it is from the beginning, a definitely ordained medium beyond improvement. As a matter of fact words have to fight for their existence. Newcomers have always been resisted, and many have found their way in by secret doors. A little more than two centuries ago there appeared in the *Tatler* of those days a letter by Jonathan Swift in which he spoke of the barbarity that "delights in monosyllables, the disgrace of our language". He was referring especially to clipped words, such as *phizz*, *hipps*, *moll*, *pzz*, *rep* and such like, of which perhaps two only *phiz*, and *mob*, have survived. And he goes on to say:

"Thus we cram our syllables, and cut off the rest, as the owl fattened her mice after she had bit off their legs, to prevent them from running away; and if ours be the same reason for maiming words, it will certain answer the end, for I am sure no other nation will desire to borrow them."

He reproves the use in sermons of slang terms like *sham*, *banter*, *shuffling*, *palming* and others, and passing to longer words he says.

"The war has introduced abundance of polysyllables, which will never be able to live many more campaigns".

the material is more than enough for me; I will rather accept the limitation than devise new words,—

> My art intends
> New structure from the ancient.

But it is not all who can strike fire out of the old wood: the zest of life flows out into new forms and demands new expression. Some satisfy the demand by resurrecting ancient words, as Shelley, when he said: Their temples were mostly *upaithric.*

Others are vividly realistic, as Cyril Tourneur:

> He that dies drunk falls into hell-fire like a bucket of water *qush qush!*

Others, like James Joyce, pull words and phrases to pieces as if they were toys:

> He left her his
> Secondbest
> Bed.
> Left her his
> Secondbest
> Leftherhis
> Bestabed
> Secabest
> Leftabed—

How the world rejoiced when Lewis Carroll, in the Indian Summer of the Victorian Age, suddenly burst into verses which seemed to reveal a new world all about the old one:

> And as in uffish thought he stood,
> The Jabberwock, with eyes of flame,
> Come whiffling through the tulgey wood,
> And burbled as it came.
>
> One, two! One, two! And through and through
> The vorpál blade went snicker—snack!

The Expansion of English

BY

E. E. SPEIGHT

Professor of English, Osmania University

THE English language is one of the most formidable in the world, for it is the language of a race of individuals, each of whom, besides speaking some communal speech,—North Midland, Devonshire, East Anglian, Lowland Scotch, Donegal, Oxford or Cockney, as the case may be,—exercises his particular genius in adding to or otherwise modifying that speech.

In the days when I was cutting my mental teeth—how odd that *mental* is related to the chin as well as to the mind, and that chattering may be called, with etymological accuracy, a *mental process*—in those adolescent days I served my apprenticeship as a dictionary-maker in Oxford, and there I came to realise the vastness and complexity of my mother-tongue, merely as a static record.

Since then I have often had cause to regret the insufficiency of that language, and I have often been thrilled by books in which English words were used in ways that gave them new life.

The other day a student in Hyderabad delighted me by producing the word *benefantial.* Brain-waves such as these are rarer than they ought to be. We are not reading our Shakespeare aright if we do not venture on some such verbal invention once a week. We have to blame printing, elementary education, and the newspaper habit for the unfortunate check on such creativity, which seems to have become second nature. Of course the artist is wise who says: I will keep within the frontiers of normal speech:

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

REGTD: ASAFIA NO. 47.

Vol. (IX) June 1928 A. D. [No. 4.
Thir 1337 Fasli.

Under the Patronage of

Nawab Masood Jung Bahadur, B. A. (Oxon.),

Director of Public Instruction.

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of the Teachers' Association Hyderabad-Deccan.

Editorial Staff.

S. ALI AKBAR, M. A., (Cantab.)

F. C. PHILIP, M. A.

AHMED HUSSAIN KHAN, B. A.

SECUNDERABAD - DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, BY T. RAMAKRISHNA & SONS.

1928.